اُردو میں لسانیات کے مباحث

مقالہ نگار
عبدالغفور ساہی

نگران
پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید

شعبۂ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

اُردو میں لسانیات کے مباحث

نام: عبدالغفور ساہی

رجسٹریشن نمبر

35		GCU		Ph.D		URDU		06

شعبۂ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

اُردو میں لسانیات کے مباحث

یہ مقالہ پی ایچ۔ڈی کی تکمیل کے سلسلے میں جی سی یونیورسٹی،
لاہور کو سند عطا کیے جانے کے لیے پیش کیا گیا۔

پی ایچ۔ڈی

مضمون

اُردو

نام: عبدالغفور ساہی

رجسٹریشن نمبر

35	[redacted]	GCU	[redacted]	Ph.D	[redacted]	URDU	[redacted]	06

شعبۂ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

تصدیق برائے تکمیل مقالہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زیرنظر مقالہ بعنوان

اردو میں لسانیات کے مباحث

عبدالغفور ساہی رجسٹریشن نمبر 35-GCU-PH.D-URDU-06 نے پی ایچ۔ ڈی کی سند کے حصول لئے میری زیر نگرانی مکمل کیا۔

نگران:

تاریخ: ____________

پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید
شعبہ اُردو
جی سی یونیورسٹی، لاہور

بتوسط:

ڈاکٹر شفیق عجمی
صدر شعبہ اُردو
جی سی یونیورسٹی، لاہور

کنٹرولر امتحانات:
جی سی یونیورسٹی، لاہور

اقرار نامہ

میں عبدالغفور ساہی رجسٹریشن نمبر 35-GCU-PH.D-URDU-06 اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ میں پیش کیا جانے والا مواد بعنوان

اردو میں لسانیات کے مباحث

میری ذاتی کاوش ہے اور یہ کام پاکستان یا پاکستان سے باہر کسی بھی تحقیقی یا تعلیمی ادارے کی طرف سے شائع، طبع یا پیش نہیں کیا گیا۔

دستخط مقالہ نگار:

عبدالغفور ساہی

تاریخ: ____________

فہرست

اردو میں لسانیات کے مباحث

دیباچہ: ص: ا تا ج

باب اوّل:

لسانیات — تفہیم و تعارف ص:۱ تا ۴۶

باب دوم:

اردو زبان کے نظریات ص:۴۷ تا ۷۶

باب سوم:

اُردو میں لسانی مباحث (ابتدا تا قیامِ پاکستان) ص:۷۷ تا ۱۳۸

باب چہارم:

اُردو میں لسانی مباحث (بعد از قیامِ پاکستان تا حال) ص:۱۳۹ تا ۲۶۷

باب پنجم:

لسانی تشکیلات (خصوصی مطالعہ) ص:۲۶۸ تا ۲۹۲

باب ششم:

اُردو لسانیات: ماحصل ص:۲۹۳ تا ۳۱۴

مآخذ و منابع: ص:۳۱۵ تا ۳۲۶

انتساب

والدہ محترمہ کے نام

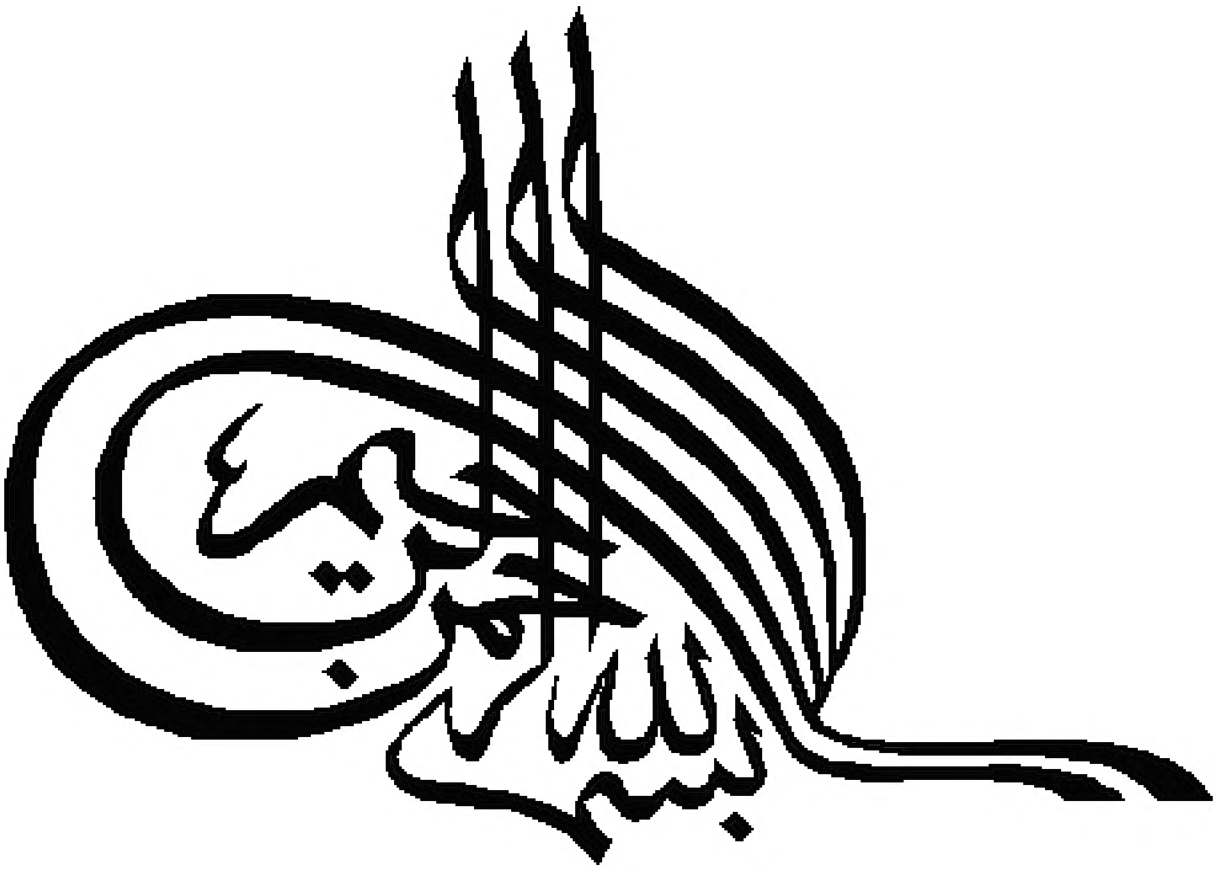
بسم الله الرحمن الرحيم

دیباچہ

لسانیات اب جدید علم نہیں رہا۔ اگر کوئی شخص اس لفظ سے (مثلاً یونیورسٹی کا نصاب دیکھ کر) پہلی بار دو چار ہو اور لسانیات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہے تو کس طرف رجوع کرے؟ وہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی متعلقہ جلد میں اس کا مطلب تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن یہ لغت زیادہ کار آمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس لغت میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ لسانیات (Linguistics) ”زبانوں کی سائنس“ یا ”علم زبان“ ہے۔ ماہر لسانیات (Linguist) وہ شخص ہے جو اس علم پر دسترس رکھتا ہو اور عالم لسان وہ جو زبانوں کو مہارت کے ساتھ استعمال کر سکتا ہو۔ یا جو اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں پر بھی عبور رکھتا ہو۔ جہاں تک لسانیات (عمومی لسانیات یا لسانی علم) کا تعلق ہے۔ یہ تعریفیں بالکل غلط ہیں۔ ماہر لسانیات کے اصل معنی ”زبان کا طالب علم“ ہے یہ مفہوم حقیقت کے قریب ہے۔ گو آکسفورڈ ڈکشنری یا (Third Webester International Dictionary) وغیرہ سے یقیناً زیادہ جامع اور جدید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ تشریحات اس کیلئے زیادہ اصطلاحی ہوں گی اور نفس مضمون تک پہنچنے کیلئے اس کی مزید وضاحت درکار ہوگی۔ لسانیات پر ایسی تعارفی کتابیں تعداد میں بہت کم ہیں، جنھیں نصاب میں شامل کیا جا سکے۔ جو دستیاب ہیں وہ جامع اور اعلیٰ معیار کی ہیں اور مبتدی کیلئے بیکار ہیں۔ جہاں تک جامعیت کا سوال ہے بلاشبہ لسانیات کا مکمل خاکہ اس شخص کیلئے ضرورت سے زیادہ بوجھل اور جرأت آزما ثابت ہوگا جو اس علم کو پہلی بار پڑھ رہا ہے۔ جامع مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے کے اندر اکتسابی دلچسپی اور گہرائی میں جانے کی خواہش موجود ہو جو تحقیق کے طالب علم کا خاصا ہے۔

لسانیات ہم میں وہ اہلیت پیدا کرتی ہے جس کے ذریعے ہم زبان کا مطالعہ زیادہ بھروسے اور باقاعدگی سے کرتے ہیں۔ یہ علم زبانوں میں رونما ہونے والے ہر طرح کے عمل کے بارے میں ہمارے اندر ایک تخلیقی انداز فکر پیدا کرتا ہے۔ لسانیات نئی زبانوں کو سیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے۔ لیکن یہ چیز ہمارے اندر خود بخود پیدا ہوتی ہے جسے لسانیات کی تربیت کا ایک ضمنی اور اتفاقی نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔

ماہرِ لسانیات کا کام نہیں ہے کہ وہ ادبی ناقد بن جائے۔ اگرچہ نقاد بھی زبان کے استعمال سے دلچسپی رکھتا ہے لیکن اس کا انداز فکر مختلف ہوتا ہے۔ ماہر لسانیات کو ادبی کتابوں میں استعمال ہونے والی زبان کا مطالعہ کرنا

پڑتا ہے لیکن اس طرح وہ نقاد نہیں ہو جاتا۔ دونوں میں آسان سا فرق ہے۔ ماہرِ لسانیات استعمال ہونے والی زبان کا جب جائزہ لیتا ہے تو اس کی توجہ صرف ملفوظ نظاموں کے ''حقائق'' کے بیان کی طرف ہوتی ہے۔ وہ جائزہ لیتا ہے کہ آوازوں، قواعد اور فرہنگ کے کون سے نمونے استعمال ہوتے ہیں اور ان کا تناسب کیا ہے۔

''اُردو میں لسانیات کے مباحث: تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ'' مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی۔ اُردو چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اوّل: ''لسانیات: تفہیم و تعارف'' میں لسانیات کیا ہے؟ لسانیات کی شاخیں اور لسانیات کا دوسرے علوم سے ربط، صوتیات کیا ہے؟ صوتیات کی شاخیں، اور لسانیاتی و صوتیاتی اصطلاحوں کی مختصر تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔

باب دوم: ''اُردو زبان کے نظریات'' میں اُردو زبان کی پیدائش، ارتقا، وجہ تسمیہ اور اس کے مختلف ناموں اور نظریات پر تحقیقی بحث کی گئی ہے اور محققین لسانیات کی تحقیقی کاوشوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اُردو زبان کے خاندان، ہند آریائی، غیر ہند آریائی اور ہند یورپی زبانوں پر بھی اس باب میں اجمالی بحث کی گئی ہے۔

باب سوم: ''اُردو میں لسانی مباحث (ابتدا تا قیامِ پاکستان)'' میں برصغیر پاکستان و ہند میں ہونے والے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حوالے سے باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے ایک حصہ مستشرقین کی خدمات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصہ اہلِ زبان اور مقامی ماہرین لسانیات کی خدمات کا احاطہ کرتا ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے کس قدر کام ہوا ہے، اس کی نوعیت اور ضرورت و اہمیت کیا ہے۔

باب چہارم: ''اُردو میں لسانی مباحث (بعد از قیامِ پاکستان تا حال)'' کو بھی دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں پاکستانی زبانوں کا اُردو لسانیات کے ساتھ ربط اور موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ تمام صوبائی و علاقائی زبانوں کا اُردو لسانیات سے تعلق اور لسانی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، ہندکو، کشمیری، براہوی، شینا، بلتی اور بروشسکی وغیرہ کے اردو زبان سے روابط کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ دو ذیلی عنوانات کو سموئے ہوئے ہے جن میں سے ایک پاکستان میں ہونے والے لسانی مباحث کا تذکرہ ہے جبکہ

دوسرا ہندوستان میں لسانی مباحث کو بیان کرتا ہے۔

باب پنجم: ''لسانی تشکیلات (خصوصی مطالعہ)'' مذکورہ مقالے کا مختصر ترین باب ہے جس میں اجمالی طور پر لسانی تشکیلات کا تعارف اور اس ذیل میں ہونے والے تحقیقی و لسانی کام کا تذکرہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابتدا میں اسے باب چہارم کے ساتھ ہی بیان کرنے کا ارادہ تھا مگر لسانی تشکیلات کے مباحث کی اہمیت کے پیش نظر اسے چند صفحات میں الگ باب کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہے۔

باب ششم: ''اردو لسانیات: ماحصل'' میں نہ صرف گزشتہ ابواب میں بیان کیے گئے مباحث کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے بلکہ اس میں لسانیات کے حوالے سے ہونے والے کام کے ساتھ ساتھ مزید کام کی ضرورت و اہمیت بھی بیان کی گئی ہے۔

اب اساتذہ کرام کے بارے میں چند باتیں پیش خدمت ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید صاحب نے ہمیں پی ایچ۔ڈی کورس ورک کے دو سمیسٹر میں تدوین، تحقیق اور عملی تنقید کی جدید تکنیک سے روشناس کرایا ہے۔ اور مقالہ کی تیاری کے مراحل میں مسلسل گائیڈ کرتے رہے ہیں۔ آپ جی سی یونیورسٹی شعبۂ اُردو کے واحد پروفیسر ہیں جو صبح سے شام تک تمام ریسرچ سکالر کی راہنمائی میں لگے رہتے ہیں۔ آپ نے اس موضوع کو مزید آسان بنانے میں میری بھرپور معاونت کی اور آپ کی کوششوں سے میں اس موضوع پر ریسرچ ڈیزائن کو عملی شکل میں پیش کرنے کے قابل ہوا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان (مرحوم) اور ڈاکٹر محمد خان اشرف بھی ریسرچ ورک کے سلسلے میں میری ہمت بندھاتے رہے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی (مرحوم) اپنی ناساز طبیعت کے باوجود آخر دم تک بھرپور رہنمائی فرماتے رہے۔ اب وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ ڈاکٹر انیس ناگی (مرحوم) ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر شفیق عجمی (صدر شعبۂ اُردو)، ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی اور نوجوان پروفیسر محمد احمد خاں (جی۔سی کے ہونہار طالب علم اور ریسرچ سکالر پی ایچ۔ڈی اُردو) بھی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔ ان تمام اساتذہ کا بے حد مشکور ہوں۔

احقر

عبدالغفور ساہی

بابِ اوّل

لسانیات — تفہیم و تعارف

زبان اللہ تعالٰی کی ایسی نعمت ہے جس کی بدولت انسان اپنے خیالات الفاظ کی مدد سے دوسرے تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم جب یہ کہا جائے کہ زبان کی جامع و مانع تعریف کیجیے تو محسوس ہوتا کہ دوسرے علوم کے بنیادی تصورات کی طرح زبان، کلمہ وغیرہ جیسی اصطلاحوں کی تعریف کتنی مشکل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان اصطلاحوں کے مفہوم کو کسی قدر محدود کرنا اور یہ فرض کر لینا بھی ضروری ہے کہ جن معانی و مطالب کے لیے یہ اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں، ان کا وجود بہر حال ہے اور لوگ بھی جانتے ہیں کہ وہ کیا ہیں؟ مولوی عبدالحق کے مطابق:

> ’’زبان بھی ایک انسانی عمل یا سعی ہے۔ اس کے دو رُخ ہیں ایک طرف تو یہ عمل اس شخص کی طرف سے ہے جو اپنے دل کی بات دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف اس شخص کی جانب سے ہے جو دوسرے کے دل کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔‘‘[۱]

زبان (Language) دراصل آوازوں کے اس بامعنی مجموعے کا نام ہے جو انسان اپنے منہ سے نکالتا ہے تاکہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر آرام و سکون سے زندگی بسر کر سکے۔ اس کا آغاز ابھی تک پردۂ تاریکی میں ہے اور محض اس قدر ہی کہا جاتا ہے کہ انسان قوت گویائی اپنے ساتھ ہی اس دنیا میں لایا ہے کیونکہ انسان کی کوئی قدیم سے قدیم برادری، جس کا آج تک علم ہو سکا ہے، ایسی نہیں ہے جسے بے زبان کہا جا سکے۔ ہمارے ذہنوں پر ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی شدید گرفت کے باوجود ہمارے لئے دنیا کے کسی خطے میں کسی ایسے وقت کا تصور فی الحال ممکن نہیں جس میں کوئی نہ کوئی زبان نہ بولی گئی ہو۔

انسان چونکہ ایک سماجی جاندار ہے اور مہد سے لحد تک اپنے ابنائے جنس کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتا ہے، اس لیے اپنی سماجی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وہ مختلف طرح کی آوازوں سے کام لیتا ہے۔

دوسروں سے اپنے دل کی بات کہنے، حکم دینے، سمجھنے سمجھانے، ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے اور ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اسے زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس طرح زبان کی تاریخ انسانی سماج کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس کے نشیب و فراز، معدوم سے موجود اور موجود سے معدوم کا سفر انسان کے سیاسی اور سماجی انقلابات اور روایات سے وابستہ ہیں۔

زبان دراصل ایک تقلیدی عمل کا نام ہے جو اپنے گرد و پیش کے دوسرے انسانوں کو دیکھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔ دنیا میں جس وقت انسان پہلی بار آنکھ کھولتا ہے اس کے صوتی عضلات و مخارج اس قدر مکمل ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کی آوازوں کی بے اختیار نقل کرنا شروع کر دیتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اسی زبان میں سوچنے اور خواب دیکھنے لگتا ہے۔ چنانچہ خلوت و جلوت، خواب و بیداری اور سفر و حضر کے اس ساتھی سے اسے اتنا پیار ہو جاتا ہے کہ ایک لمحے کو بھی اپنے سے الگ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ اسی والہانہ محبت اور بے اندازہ شغف کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا میں لاتعداد زبانیں بولی جاتی ہیں، جو اپنے اپنے بولنے والوں کی خاطر خواہ خدمت کر رہی ہیں۔ پھر بھی ہر خطے کا انسان اپنی زبان کو غیر زبان پر ترجیح دیتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج روئے زمین پر صرف ایک ہی زبان رائج ہوتی۔ اس سے قبل کے زبان اور زبان کے علم سے متعلق بحث کو آگے بڑھائیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختلف زبانوں کی لغات کی مدد سے اس کے معانی متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔

زبان بطور عضوِ انسانی:

مختلف زبانوں میں ''زبان'' کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جبکہ ''زبان'' بذاتِ خود فارسی کا لفظ اور اسم مونث ہے[۲]۔ چرنجی لال منشی ''زبان'' کے متعلق بیان کرتے ہیں:

> ''ایک ٹکڑا گوشت کا ہے جو منہ کے اندر رہتی ہے۔ سب تلفظی مخارج اس بن بیکار ہیں۔ یہ سب مخرجوں کی سردار ہے۔''[۳]

عربی کا لفظ ''لسان''[۴] اس حوالے سے ذو معنی ہے جو زبان کو ہر دو مطالب کے لیے بیان کرتا ہے یعنی زبان بطور عضوِ انسانی اور زبان بطور ذریعہ بیان و اظہارِ مطالب۔ پنجابی میں زبان (عضوِ انسانی) کے لیے جیبھ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو بعض اوقات اردو میں استعمال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انگریزی میں زبان کے لیے Tongue

کا لفظ اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس حوالے سے آکسفورڈ ڈکشنری میں ہے:

> "The soft part in the mouth that moves around, used for tasting, swallowing, speaking etc."[۵]

بولنے چالنے کے عمل میں زبان مرکزی کردار ادا کرتی ہے لیکن یہ تنہا بول چال کے عمل کو انجام نہیں دے سکتی۔ اس کے ساتھ دیگر کئی اعضا ہیں جو زبان کے ساتھ مل کر نہ صرف آوازیں پیدا کرتے ہیں بلکہ حروف کی ادائیگی کو بھی ممکن بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی میں قرآن مجید کی قرأت کے لیے ان تمام اعضائے صوت کا اور ہر عضو کی مدد سے ادا ہونے والے حروف کا علم ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔ زبان کے اس عمل کے حوالے سے آر- ایچ- رابنسن اپنی کتاب "General Linguistics an Introductory Survey" میں لکھتے ہیں:

> ''آوازوں کے سائنٹفک مطالعے کے ضمن میں ایک قابلِ ذکر بات تکلمی صوتیات کی اہمیت ہے کیوں کہ یہی وہ علم ہے جو کسی آلے کی مدد کے بغیر آوازوں کی ادائیگی، ان کی تقسیم اور درجہ بندی اور توضیح و تجزیہ پیش کرتا ہے۔ تکلمی صوتیات میں آوازوں کو تلفظ کرتے وقت اعضائے صوت کے مختلف انداز میں عمل پیرا ہونے سے بحث کی جاتی ہے۔ یوں تو چھینک، ڈکار، ہچکی اور مٹھار بھی آوازیں ہیں جن کی ادائیگی میں اعضائے صوت حرکت کرتے ہیں لیکن زبان کی ساخت میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس لیے انھیں غیر لسانی آوازیں کہتے ہیں۔ زبان کو تشکیل دینے یا اس کی ساخت سے متعلق آوازیں تکلمی اصوات کہلاتی ہیں۔ اعضائے صوت مندرجہ ذیل ہیں:
>
> ۱۔ ہونٹ
> ۲۔ دانت
> ۳۔ مسوڑے
> ۴۔ سخت تالو
> ۵۔ نرم تالو
> ۶۔ نوکِ زباں
> ۷۔ زبان کا پھل
> ۸۔ زبان کا اگلا حصہ
> ۹۔ زبان کا درمیانی حصہ
> ۱۰۔ زبان کا پچھلا حصہ
> ۱۱۔ کوّا
> ۱۲۔ مزمار
> ۱۳۔ غشائی پردے
> ۱۴۔ حنجرہ

۱۵۔ ناک کا راستہ''۶؎

جان پی ہف (John P. Hughes) اپنی کتاب "The Science of Language" میں تکلمی صوتیات (Articulatory Phonetics) کا ڈھانچہ (Structure) بھی پیش کرتے ہیں ے جو ذیل میں دیے گئے نقشے کے مطابق ہے:

A Sketch of Articulatory Phonetics

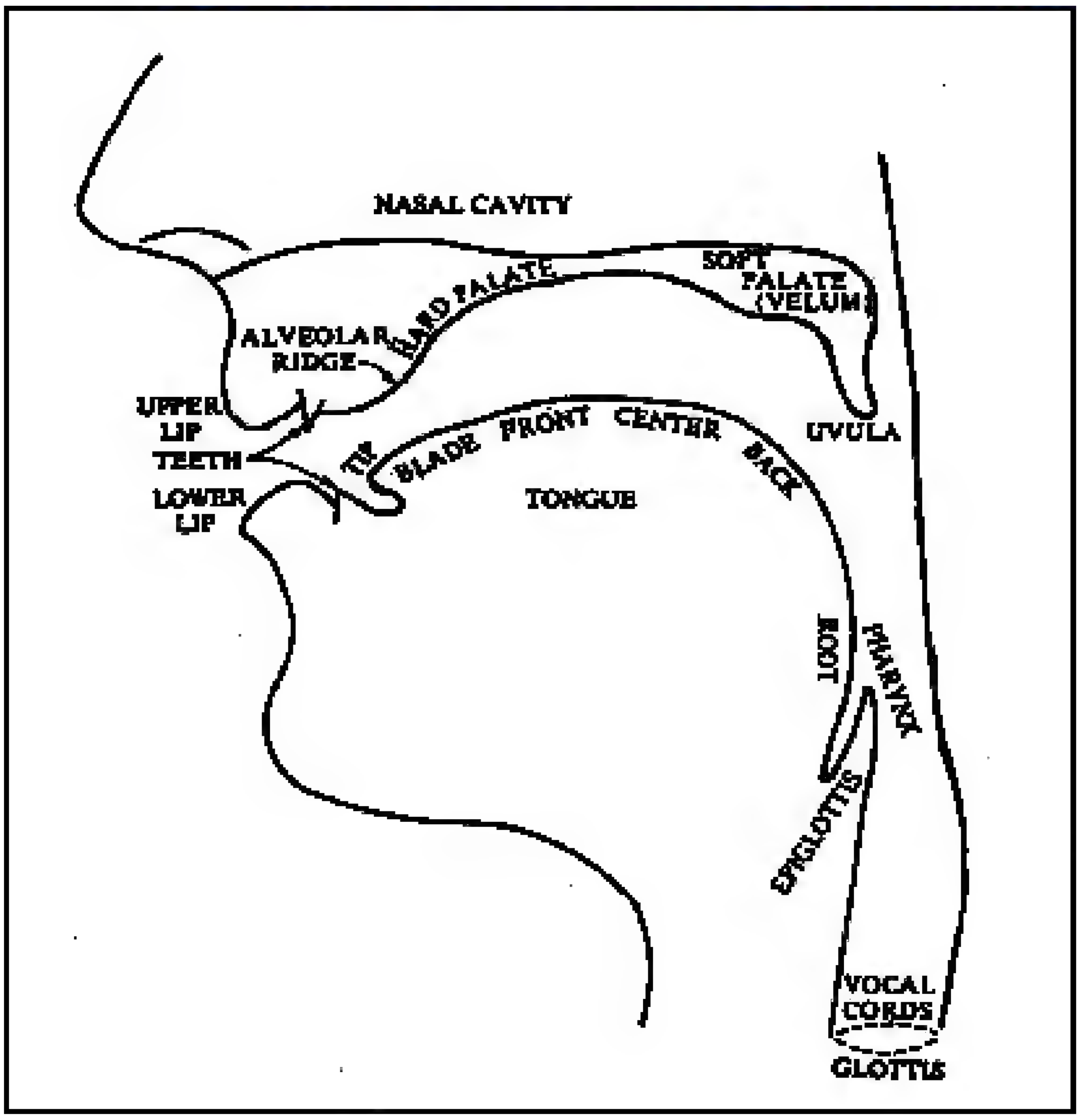
NASAL CAVITY
SOFT PALATE (VELUM)
HARD PALATE
ALVEOLAR RIDGE
UPPER LIP
TEETH
LOWER LIP
TIP
BLADE
FRONT
CENTER
BACK
TONGUE
UVULA
ROOT
PHARYNX
EPIGLOTTIS
VOCAL CORDS
GLOTTIS

زبان بطور ذریعۂ بیان و اظہارِ مطالب:

عربی زبان میں جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ ''لِسان'' دونوں مطالب ادا کرتا ہے، اس کی جمع الکبیۃ، اَلْسِنْ، لُسُن اور لِسانات ہے ے۔ ''فرہنگ آموزگار'' (فارسی) میں زبان کے متعلق یوں درج ہے:

> ''لسان بکسر زبان در دھان، لغاتی کہ با آن سخن گویند۔
>
> لسانی: با زبان، شفاھی۔ لسانا: زبانی، با دھان، شفاھا۔''۸؎

جبکہ جدید اردو لغت میں بیان کیا گیا ہے:

> ”زبان (مونث): جیبھ، بول چال، روزمرہ، بیان کرنے کا انداز، اقرار، وعدہ۔“[۹]

پنجابی میں ”بولی“ سے مراد وہ زبان ہے جو ہم اپنے مطالب کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اردو میں لفظ زبان دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اولاً اس سے مراد جسم کا وہ عضو ہے جس کی مدد سے انسان بولتا چالتا ہے جبکہ ثانیاً اس سے مرادالفاظ وہ ذخیرہ ہے جس کی مدد سے مطالبِ اظہار ادا کیے جاتے ہیں۔ اُردو میں زبان کے سائنسی مطالعہ کا رجحان ذرا کم ہی رہا ہے، اس لیے اس کی تعریف کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے زبان کی یہ تعریف کی ہے:

> ”وہ اظہار کا وسیلہ ہے کہ متواتر آوازوں کے سلسلے میں ظاہر ہوتا ہے۔ جنھیں تقریر یا سلسلۂ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں۔“[۱۰]

برجموہن دتاتریہ کیفی لکھتے ہیں:

> ”زبان“ تخیل اور خیال کے ظاہر کرنے یا مطلب ادا کرنے کا ذریعہ ہے...... ہمارا مقصد ناطقہ کے ذریعہ اظہار خیال سے ہے۔ جس کا تعلق آواز سے ہے۔“[۱۱]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اُردو کے پہلے دانشور ہیں جنھوں نے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء تک پیرس اور لندن کے اس دور کے مشہور ماہرین لسانیات سے براہِ راست استفادہ کرتے ہوئے زبان کی ماہیت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”زبان خیالات کا ذریعہ ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔ اس ترجمانی میں وہ حرکات جسمانی بھی شامل ہیں جو کسی مفہوم کے سمجھانے کے لیے خاص زبان بولنے والوں کے درمیان مشترکہ ہوتی ہیں...... خیالات کی ترجمانی کے لیے نطق یا قوتِ گویائی ہی ایک مکمل ترین اور سب سے زیادہ واضح ذریعہ سمجھی جاتی ہے...... پس زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان

> سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔"[۱۲]

اس تعریف میں زبان کو نظام بھی قرار دیا گیا ہے اور اس کی علامتی اور ابلاغی حیثیت کی طرف بھی اشارہ ہے لیکن نُطقی یا صوتی اور اختیاری خصوصیات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کمی کو پورا کرتے ہوئے عین الحق فرید کوٹی لکھتے ہیں:

> "زبان ایک ایسے صوتی سلسلے کا نام ہے جو کہ انسان کے اعضائے نُطقی کے ذریعے ظہور میں آتا ہے اور اعضائے سماعی کے ذریعے سماعت پذیر ہوتا ہے۔"[۱۳]

انگریزی میں اس کے لیے Language کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں درج کی گئی ہے:

> "human and non-instinctive method of communicating ideas, feelings and desires by means of a system of sounds and sound symbols."[۱۴]

درج بالا تمام زبانوں میں زبان (بطور ذریعہ بیان و اظہارِ مطالب) کے متعلق یہی بات مشترک ہے کہ زبان انسان کا وہ عضو ہے جو انسان کو اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کو ایک فرد سے دوسرے فرد تک منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ انسان کی آواز ابتدائی طور پر نشانوں پر مشتمل تھی اور اس ضمن میں چینی اور اسی قبیل کی دیگر زبانیں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں جو حروف کی بجائے اشکال پر مشتمل دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح بعض زبانوں کے حروف اصوات کا اظہار کرتے ہیں جن میں ہند آریائی زبانیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

علمِ لسانیات — ایک تعارف:

زبان کے مختلف معانوں اور تعریفوں کی مدد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ لِسان عربی زبان کا لفظ اور اسم مفرد مؤنث ہے جس کے لغوی معنی زبان یا بھاشا کے ہیں جبکہ پنجابی میں یہ بولی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ خیالات کے اظہار کا وہ ذریعہ ہے جو ملفوظ آوازوں کی مدد سے انسان کے مطالب و مقاصد کو ایک دوسرے تک منتقل کرتا ہے۔ یونانی زبان میں ’’علمِ لسانیات‘‘ کے لیے لفظ ’’فلولوجی‘‘ استعمال کیا جاتا ہے جو دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ ’فیلو‘ کے معنی ہیں ’محبت‘ اور ’لوجی‘ کے معنی ہیں لفظ، علم وغیرہ یعنی زبان کی محبت۔ تاہم ۱۸۴۱ء میں رچرڈ نے اس کے لیے Glottology کا لفظ استعمال کیا جسے اُردو میں ہم ’’علمِ زبان‘‘ یا ’’لسانیات‘‘ کہتے ہیں۔

اُردو میں ایک منظم اور مربوط انداز میں زبان کے سائنسی مطالعہ کو ’’علم لسانیات‘‘ کا نام دیا گیا ہے جب کہ اس علم پر عبور رکھنے والوں کو ’’ماہرینِ لسانیات‘‘ کہا جاتا ہے۔ لسانیات زبان کی ترویج و فروغ کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ ایک ماہر لسانیات کا کام زبان کا مختلف طریقوں سے مطالعہ کرنا ہے اور اس زبان کے مقامی لوگوں سے گفتگو کر کے اس کی ساخت اور بناوٹ کی تلاش کا کام ہے۔ لسانیات مختلف زبانوں کی تاریخ، ارتقاً، زبانوں کے رشتے، شجرے اور ساخت سے بحث کرتی ہے۔ زبانوں کا عصری مطالعہ اور تجزیہ بھی کرتی ہے۔ ہر زبان حروف کا ایک جامع نظام رکھتی ہے، ان حروف سے الفاظ اور الفاظ سے جملے اور فقرے ترتیب پاتے ہیں اور یہ جملے عبارت اور پیراگراف کو تشکیل دیتے ہیں ہر حرف کسی نہ کسی آواز کے لیے جو علامات اور نقوش اپنائے ان نقوش، علامات اور نشانات کو حروف ابجد کہتے ہیں۔ انہی کو ہم حروف الف با بھی کہتے ہیں۔ یہ حروف الف با تحریر کے لیے ابتدائی اکائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں تحریر کا پورا نظام انہی حروفِ ابجد سے ترتیب پاتا ہے۔

لفظ لسان سے لِسانی اور لسانی سے لسانیات بنا ہے۔ اصل میں عربی اسم جمع مونث سالم ہے جبکہ انگریزی میں یہ لنگوا سٹک (Linguistic) کہلاتا ہے جو زبان ہی کے مطالعہ کا علم ہے۔ اس علم میں ایک زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی بحث کی جاتی ہے اور یہ ایک مستقل علم ہے جس کی موجودہ دور میں اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ زبانوں کی ساخت اور ان کی اصوات میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث سماجی علوم (Social Sciences) یعنی بشریات، نفسیات، عمرانیات، تاریخ اور فلسفہ کے میدانوں میں بے پناہ نتائج حاصل کیے گئے

ہیں جبکہ تحقیق، جستجو، کھوج، تلاش اور سائنسی علوم میں بھی ’’لسانیات‘‘ کا شمار ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسانی زندگی، معاشرہ اور تہذیب سے ہے۔ زبانوں کے آپس میں ربط اور معاشرہ پر اس کے اثرات کے ساتھ ساتھ آئے دن اس میں رونما ہونے والے تغیرات لسانیات کا ہی موضوع ہیں۔ چونکہ کسی بھی زبان کا سائنسی طرز پر مطالعہ ’’لسانیات‘‘ کہلاتا ہے، اس لیے جب ہم کسی بھی زبان کی اصوات، اس کی صرف ونحو، معنیات، اس کے خاندان اور ذیلی خاندان کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو یہ تمام مباحث لسانیات کی ذیل میں ہی آئیں گے۔ انسان حیوان ناطق ہے اور اسی نطق کی بنیاد پر ہی یہ اشرف المخلوقات کہلایا۔ فلسفہ یا منطق کو سائنسوں کی ماں کہا جاتا ہے۔ جس طرح منطق علم بھی ہے اور فن بھی، اسی طرح زبان کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک بولنا اور دوسرا فصاحت و بلاغت سے بولنا اور ہر بولنے والا زبان کے اصول سے واقف نہیں ہوتا۔ جیسے کاریگر اور مزدور دونوں کا عمارت سازی سے واسطہ تو ہے، لیکن دونوں کے کام الگ الگ حیثیت کے حامل ہیں۔

کسی بھی زبان کا سائنٹفک مطالعہ لسانیات کہلاتا ہے۔ لسانیات بھی تنقید ہے۔ ادب کی تنقید کو تنقید کہتے ہیں۔ لسانیات زبان کی تنقید ہے۔ اس میں زبان کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لسانیات کے مسائل و مباحث میں بڑی وسعت ہے۔ وہ زبان کے ہر پہلو کو لے کر اس پر بحث کرتی ہے۔ ادبی تنقید میں اسالیب بیان کو پرکھا جاتا ہے۔ لسانی تنقید میں زبان کے تعمیری عناصر کے اظہار و بیان پر اثرات دکھائے جاتے ہیں۔ اس کو ادب کی تنقید کی طرح عام تنقید میں جگہ ملنی چاہیے۔ تنقید تخلیق ہونے کے باوجود سائنس ہے اور سائنس کی سی باقاعدگی، نظم وضبط، ترتیب و تسلسل اس میں پایا جاتا ہے۔ لسانیات سائنس ہونے کے باوجود تخلیق ہے۔ اس میں تخلیق کی سی جدت، جودت، ندرت اور بداعت کے کرشمے نظر آتے ہیں۔ تنقید تجزیہ ہے جب تک ادب کا تجزیہ نہ کیا جائے تو حسن کاریٔ اور تخلیقی منزلوں کی وضاحت نہیں ہوتی۔ لسانیات کا دارومدار ہی تجزیے پر ہے۔ یہ زبان اسکے اجزا اور ضابطوں کا پوسٹ مارٹم کرتی ہے۔ تجزیے میں دونوں شریک ہیں۔

لسانیات زبان کی تنقید ہے اور اگر تنقید تخلیق ہے تو لسانیات کو بھی تخلیق کی ایک صنف قرار دینا ہوگا۔ مشہور ماہر لسانیات میکس مولر نے گرامر اور لسانیات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں ’کیا‘ اور ’کیوں‘ کا فرق ہے۔ گرامر کیا ہے اور لسانیات کیوں۔ گرامر لفظ اور کلمے کی شناخت کر کے بتاتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ اسم ہے یا فعل۔ اسم ہے تو اسم ذات ہے یا اسم صفت۔ فعل ہے تو ماضی ہے یا مضارع۔ ماضی ہے تو غائب کا صیغہ ہے یا

حاضر کا۔ لسانیات یہ بتاتی ہے کہ اسم کیوں ہے۔ فعل ماضی کس لیے ہے۔ وہ الفاظ و کلمات کی شناخت نہیں کرتی۔ انکی حقیقت اور اصلیت کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف دوروں کی نشاندہی کرتی ہے۔ گرامر کی شناخت ناقص اور نامکمل تھی۔ لسانیات رشتے مکمل بناتی ہے۔ ادبی تنقید کا کام بھی یہی ہے کہ وہ ادب پارے کی نقاب کشائی کرے۔

لسانیات کے مطالعے میں ایک اہم چیز یہ ہے کہ زبان کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں ایک معیاری طریق کار کا انتخاب کرنا چاہیے۔ زبان کے سائنٹفک مطالعے میں دوسری اہم چیز باقاعدگی ہے۔ جسے صراحت سے بالکل الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سائنٹفک باقاعدگی سے زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لسانیات کے مطالعے میں ایک اہم چیز یہ ہے کہ زبان کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں ایک معیاری طریق کار کا انتخاب کرنا چاہیے۔ لسانیات کے شعبہ علم الاصوات (صوتیات) میں بسیط آوازوں سے بڑی جامع اور عمیق اور عام طور سے تین طرف سے بحث ہوتی ہے۔ تشریحی، تاریخی اور تقابلی۔

لسانیات کا سب سے نزدیکی رشتہ مروجہ قواعد سے ہے لیکن دونوں یکساں نہیں۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ لسانیات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ صرف و نحو اس کے محض دو شعبے ہیں۔ ان شعبوں اور مروجہ قواعد میں بھی فرق ہے۔ قواعد کسی ایک زبان سے متعلق ہوتی ہے لیکن صرف و نحو کے اصول عام طور سے کئی زبانوں پر چسپاں کئے جا سکتے ہیں۔ مروجہ قواعد زبان کے فصیح روپ کا مطالعہ کرتی ہے۔ لسانیات میں کوئی روپ فصیح ہے نہ غیر فصیح۔ ادب سے لسانیات کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ شرح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لسانیات سے قدیم ادب کو اور دوسری زبانوں سے مستعار لفظوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لسانیات کے لیے ادب مسالہ فراہم کرتا ہے۔ زبان کا تاریخی مطالعہ عہد بہ عہد کے ادبی نمونوں ہی کے سہارے ہو سکتا ہے۔

جدید لسانیات میں بولا ہوا لفظ لکھے ہوئے لفظ کی نسبت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ زبانوں کے مطالعے کے لیے تاریخی یا دو زمانی منہاج کی جگہ یک زمانی طریق کار کو اختیار کرتی ہے۔ اس لیے رسم الخط یا فن تحریر کی قدامت کی بحث اس کے دائرہ کار سے زیادہ تعلق نہیں رکھتی۔ صوتیات جسے جدید لسانیات نے توضیحی لسانیات/عمومی لسانیات کے نام سے موسوم کیا ہے، لسانیات کی ابتدا ہی سے ایک اہم مبحث کے طور پر معروف ہے۔ سید احمد دہلوی نے ''علم اللسان'' میں صوتیات کے حوالے سے اپنے زمانے کے اُردو لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے

مصنفین سے زیادہ معلومات اور بصیرت کا اظہار کیا ہے۔ لسانیات کی اس اہم شاخ کے حوالے سے انہوں نے اپنے رسالے میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ اُردو صوتیات کا نقطۂ آغاز ہے[۱۵]۔

زبان محض ایک عام نظام نہیں جس کے مطابق جملوں کی تشکیل ہوتی ہے بلکہ وہ تو ایک ایسا نظام ہے جسکے اندر جملوں کی تشکیل کے قواعد کا علم بھی مضمر ہوتا ہے جب زبان کو گفتار سے جدا کیا جاتا ہے۔ پس زبان کا ایک جامع تجریدی نظام ہے اور گفتار اس کی محدود انفرادی شکل ہے۔ جو بولنے والے نطق میں ظاہر ہوتی ہے۔

سوئسیر کے فکری نظام میں زبان کا ایک ایسے نظام کے طور پر مطالعہ کرنا چاہیے کہ کسی خاص لمحے میں اس کی تمام تر کارکردگی کا احاطہ کیا جا سکے نہ کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ زبان میں جو تبدیلیاں آئی ہیں صرف انہیں کو مرکز نگاہ بنایا جائے زبان کے اس کلی تجریدی نظام کی رُو سے انفرادی نطق ممکن ہے یعنی لسانی اہلیت کا پتہ چلتا ہے جو تمام انفرادی کارکردگی کا سرچشمہ ہے۔ انفرادی نطق ممکن ہے یعنی لسانی اہلیت کا پتہ چلتا ہے جو تمام انفرادی کارکردگی کا سرچشمہ ہے۔ انفرادی نطق اُدھورا اور متنوع ہوتا ہے جبکہ جامع تجریدی نظام مکمل اور مربوط ہوتا ہے اور ساخت رکھتا ہے۔ اس لسانی فکر نے لفظوں کے ذریعے سمجھے جانے والے تصورِ زبان کو بدل کر رکھ دیا اور اسکے بجائے نسبتی تصور نے لے لی۔ قاضی جاوید لکھتے ہیں:

> ''کیمبرج سے تعلق رکھنے والے لسانیاتی تحلیلی فلسفی یہ کہتے ہیں کہ فلسفے کو ہماری زبان کی ''بیماریاں'' دور کرنے کا معالجاتی فریضہ سرانجام دینا چاہیے مابعد الطبیعات سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں لسانیاتی فلسفیوں نے نہ صرف روایتی مابعد الطبیعات بلکہ کسی قابل فہم فلسفیانہ تصور تک پہنچنے کے امکان کو رد کرتے ہوئے منطقی اثباتیت کو اسکے اصول تصدیق پذیری سمیت مسترد کر دیا ہے۔ لسانیاتی تحلیل کو فلسفیانہ تحقیق کا واحد آورش قرار دیتے ہوئے لسانیاتی فلسفیوں اور خصوصاً انکے آکسفورڈ گروپ نے منطقی اثباتیوں کے برخلاف کسی مصنوعی مثالی زبان کی تشکیل پر توجہ نہیں دی۔ انکی توجہ کا مرکز روزمرہ زبان ہے۔ لسانیاتی تحلیل کی ابتدائی ترقی میں اہم شخصیت وٹگنسٹائن ہے گذشتہ نصف صدی کے دوران اکیڈیمک فلسفہ دو بڑے مکتبہ ہائے فکر یعنی منطقی اثباتیت اور لسانیاتی تحلیل میں منقسم رہا اور یہ دونوں

وٹگنسٹائن کے مرہون منت ہیں۔''[۱۶]

خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

> ''زبان کے وسیلے سے ہماری جو شناخت ہوتی ہے، اس کی متعدد سطحیں اور کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ہماری تکلمی زبان یا بول چال کی کچھ خصوصیات کم و بیش مستقل ہوتی ہیں اور ان سے عمر، جنس، صحت یا جسمانی نوعیت، جذباتی کیفیت وغیرہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ایبر وکرومبی نے زبان کے شناختی اشاریوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے، پہلے زمرے میں ان اشاریوں کو شامل کیا ہے جو کسی سماجی گروہ کی رکنیت پر دلالت کرتے ہیں، دوسرے میں انھیں شمار کیا ہے جو فرد کی انفرادیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تیسرے زمرے کے اشاریے، متکلم کی بدلتی ہوئی حالتوں کے مظہر ہوتے ہیں۔''[۱۷]

لسانیات نے زبان کے مطالعہ اور اس کی پیچیدگیوں کو جانچنے کے لیے ہمیں مختلف نظریات و تصورات اور تجزیے و تقابل کی نئی تکنیک سے روشناس کرایا ہے اور اسی ردِ عمل کی بنا پر لسانیات معرضِ وجود میں آئی۔ تاریخی لسانیات کے حوالے سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ صرف و نحو یعنی قواعد ہی لسانیات کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ مغربی مفکرین کے خیالات سے ہی قواعد نگاری کا ظہور ہوا حتیٰ کہ جملے کی ساخت کا تصور ارسطو اور افلاطون کے نظریات سے وقوع پذیر ہو گیا تھا۔ پلزبری اینڈ میڈر (Pillsbury & Meader) اپنی کتاب "The Psychology of Language" میں لکھتے ہیں:

> ''لسانیات زبان کی سائنس ہے، جیسا کہ قانون، تاریخ، معاشیات وغیرہ انسانی علوم کے میدان ہیں یا بعض اوقات انھیں سماجی علوم بھی کہا جاتا ہے۔ حس، انسانی ذہن کی تخلیق اور اعصابی حرکات سے زبان وجود میں آتی ہے۔''[۱۸]

''لسانیات'' میں 'زبان' اور 'سائنس' کی دو اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں، ان میں زبان خود اختیاری یعنی انسان کی ہی ایجاد کردہ ہے جو آوازوں کا مجموعہ اور ترتیب ہے اور اسے انسان معاشرے میں بات چیت کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اشاروں کی زبان کا لسانیات سے کوئی تعلق نہیں، ترتیب شدہ آوازیں ہی لسانیات کا

موضوع ہیں۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں اپنی کتاب ''لسانیات کے بنیادی اصول'' میں رقمطراز ہیں:

> ''لسانیات میں انسان کے منہ سے بولے جانے والے سب کلمات وہ ایک لفظ ہو یا جملہ تحریر کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ انسانی تہذیب کے ارتقا میں زبانی زبان پہلے شروع ہوئی اور تحریری زبان بعد میں وجود میں آئی۔ اس کی مثال بچہ بولنا پہلے شروع ہوتا ہے اور لکھنا بعد میں سیکھتا ہے۔ دنیا میں سب انسان ماسوائے (گونگے بہرے) بولنا جانتے ہیں لیکن لکھنا اس کے مقابلے میں کم جانتے ہیں۔''[۱۹]

زبان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اسے انسان خود اختیار کرتا ہے۔ جب کوئی بھی آواز نکلتی ہے تو اس سے بننے والی شکل کا اس کے معنی کے ساتھ فطری یا منطقی طور پر کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی قدیم ترین بولی جانی والی زبانوں عبرانی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت کو آج زبانوں کی مائیں کہا جاتا ہے۔ ان تمام زبانوں کی ہی ترقی یافتہ زبانیں دنیا میں رائج ہیں۔ اگر آواز کے فطری یا منطقی معنی میں کوئی فرق نہ ہوتا تو آج پوری دنیا میں ایک ہی زبان کا سکہ چلتا۔ آج زبانوں کے آپس کے اختلاف کے لحاظ سے تقریباً تین ہزار بڑی زبانیں دنیا میں بولی جاتی ہیں جن کے تقریباً سو خاندان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام زبانوں کی آوازوں یعنی حروف تہجی میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ یہ حروف تہجی اصل میں زبانوں کی علامتیں ہیں۔ یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ بعض زبانوں میں سکرپٹ (بمعنی حروف یا رسم الخط) ایجاد نہیں ہوا جن میں آوازوں کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ اس کی بڑی مثال چینی زبان اور اس کے خاندان کی دیگر زبانیں ہیں جہاں حروفِ تہجی کا کوئی شمار نہیں ہے۔

لسانیات محض انسان کی زبان سے بحث کرتی ہے، جانوروں کی زبان سے لسانیات کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان کی زبان میں دو خصوصیات پائی جاتی ہیں جو جانوروں کی زبان میں نہیں ہوتیں۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خاں ان خصوصیات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> ''(ا) زبان کی ساخت میں دوہرا پن ہے یا جس کو (Double Articulation) بھی کہتے ہیں۔ زبان میں دو سطحیں ہوتی ہیں۔ پہلی بامعنی اکائیوں کی سطح اور ثانوی سطح آوازوں کی ہے۔ انسانی زبان کے علاوہ کسی اور کی زبان میں یہ دونوں سطحیں نہیں ہوتیں۔

> (۲) دوسری خاصیت جو انسانی زبان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے زبان کی پیداوار اس سے مراد ہے کہ انسان کے لیے ہی ممکن ہے کہ وہ لاتعداد جملے بول سکتا ہے جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ سُنے ہوں اور نہ کبھی بولے ہوں۔"۲۰

ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal) اپنی کتاب "What is Linguistics" میں لکھتے ہیں:

> "آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں لفظ لسانیات کی تعریف دیکھ کر لوگ فرض کر لیتے ہیں کہ انہوں نے اس کے معنی جان لیے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں عام طور پر اس کا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ وہ لسانیات کے علم کو علم زبان (Philology) کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں جو صرف زبان کی تاریخ کا علم ہے۔"۲۱

چارلس ایل باربر (Charles L. Barber) اپنی کتاب "The Story of Language" میں زبان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

> "انسانی زبان اشاروں کا ایک نظام ہے۔ اس کا مواد تکلمی اصوات ہیں۔ بنیادی طور پر زبان منہ سے بولی جاتی ہے، تحریری زبان اس کا ثانوی ذریعہ ہے اور وہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ہر فرد کی تخلیق میں زبان پہلے بولی جاتی ہے اور بعد میں لکھی جاتی ہے۔ قدیم معاشروں میں تحریر کے بغیر ہی زبان بولی جاتی تھی۔"۲۲

صوفی گلزار احمد اپنی مرتبہ "کشاف اصطلاحاتِ نفسیات" میں زبان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> "خیالات اور جذبات کے اظہار کو زبان کا نام دیا جاتا ہے۔ جب ہم اپنے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور انہیں دوسرے لوگوں تک پہنچاتے ہیں تو وہ خیالات زبان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں بالفاظ دیگر الفاظ کے مجموعے کو زبان کا نام دیا جاتا ہے۔"۲۳

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں لکھتے ہیں:

> "لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقاء، زندگی اور وفات کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کائنات اور معاشرت انسانی سے متعلقہ علوم میں لسانیات کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا

> احساس ابھی ابھی پیدا ہوا ہے۔ فرانس کا مشہور فاضل ای کوبلو پہلا شخص ہے جس نے کتاب ”تقسیم علوم (مورخہ ۱۸۹۸ء) میں اس علم کی کماحقہ تعریف کی اور اس کی اہمیت پر بحث کی۔ چنانچہ اس وقت سے آج تک اس علم کے مقاصد، فوائد اور اصول وضوابط کی نسبت معتد بہ کتابیں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ مغربی ماہرین لسانیات کے مقاصد کی وسعت و گونا گونی پر بڑے بڑے مقالے لکھے ہیں۔ لیکن یہاں صرف اتنا بیان کرنا کافی ہے کہ زبانوں کا تجزیہ، ان کی تاریخ، ان کے باہمی نقاطِ ارتباط، ان کی معنوی ساخت اور انکی ظاہری تقسیم و گروہ بندی پر غور و خوض کرنا لسانیات کا سب سے بڑا مقصد ہے۔“[۲۴]

ڈاکٹر نصیر احمد خاں اپنی تصنیف ”اُردو لسانیات“ میں فرماتے ہیں:

> ”زبان ہمیشہ سے فلسفہ، منطق، مذہب، علم فصاحت و بلاغت، تدریس زبان اور ادبی تنقید سے وابستہ رہی ہے۔ ان علوم کا شاید ہی کوئی ایسا مفکر ہو جس کے زبان اور اس کی قواعد پر اپنے خیالات وسیع سیاق و سباق میں ملتے ہیں۔ انسان کی تہذیب اور روایات کی تاریخ شاہد ہے کہ انسان نے ہمیشہ زبان کی ابتدا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کلچرل بشریا (Cultural Anthropology) کی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قدیم سے قدیم کلچر میں زبان کا تصور ابتدا سے ملتا ہے۔ جیسے آدم، شیطان اور خدا کی گفتگو جس کا ذکر انجیل مقدس اور قرآنِ پاک دونوں میں آیا ہے۔ قدیم مصر کے عقائد کی رو سے تھوتھ نامی خدا بول چال اور تحریر کا بانی تھا۔ یا جیسے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے مطابق برھما نے آریہ تہذیب کو لکھنے کا علم دیا وغیرہ۔ مذہب سے زبان کے اس گہرے رشتے نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ زبان پر خاص توجہ دے زبان کو محفوظ کرنے کے لیے قواعد یں لکھی گئیں جیسے ویدک سنسکرت کی قواعد جو پانینی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی اور یہ صرف اس لیے ممکن ہو سکا کہ بھگوان کی ”وانٹری“ کا تلفظ اور قواعد نہ بگڑنے پائے۔ چوتھی صدی ق۔م کی اس اشٹا دھیائے نامی قواعد میں سنسکرت زبان کی ساخت سے متعلق چار ہزار مقولے ملتے ہیں۔ اس طرح

> مختلف صوتی اور صرفی و نحوی اصول سامنے آئے اور طریق کار، قواعدی اصول و تصورات سے متعلق رجحانات کا ارتقا ہوا جن میں سے بعض جدید لسانیات میں آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔''۲۵

عربی کے مطالعے کو مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے ترقی ملی، کیونکہ تمام مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن پاک عربی زبان میں ہے۔ علاوہ بریں یہ زبان اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ قرآن پاک کے کئی زبانوں میں تراجم ہوئے ہیں، اس سے ادبی تفسیر اور لغت نویسی کو فروغ ملا، اس طرح تلفظ میں اعراب سامنے آئے جبکہ عربی زبان کے تاریخی جائزے سے تاریخی لسانیات وجود میں آئی۔

لسانیات الفاظ اور معنی میں ہونے والی تبدیلی کو کہتے ہیں تاریخ عالم کے شروع میں انسان کی ایک زبان تھی، پھر بعد میں وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آتی گئی جیسا کہ موجودہ دور میں ہم اپنے ہی ملک میں اس بات کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر پچیس میل کے فاصلے پر زبان میں تھوڑا بہت فرق ضرور دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں اپنی ترجمہ شدہ کتاب ''لسانیات کیا ہے؟'' میں علم لسانیات کی بابت یوں رقمطراز ہیں:

> ''(ا) تقابلی علم زبان یا علم زبان یا زبان کی تاریخ کا مطالعہ یا جس نام سے بھی ہم پکارتے ہوں۔
>
> (ب) کئی زبانوں پر دسترس حاصل کرنے یا کثیر زبانیت۔
>
> (ج) ادبی تنقید یا دوسرے موضوعات جیسے بولنے کی تربیت وغیرہ۔
>
> (د) قواعد کا روایتی مطالعہ جو ہمارے زیادہ تر سکولوں میں پچھلی ایک صدی سے اوپر رائج ہے۔''۲۶

چارلس ایف ہوکٹ (Charles F. Hockett) اپنی کتاب "A Course in Modern Linguistics" میں لکھتے ہیں:

> ''زبان کے بارے میں منظم علوم کو لسانیات کہا جاتا ہے''۔۲۷

لسانیاتی تحقیق کا فہم زبان و ادب سے متعلقہ افراد میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ اکثر زبان و ادب کے لیے ایک ہی اصطلاح 'لسانیات' کے نام سے یاد کرتے ہے۔ تحقیق کے طالب علم کے لیے ان دونوں میں فرق

بیان کرنا ضروری ہے۔ زبان کے ماضی کا علم ''علمِ زبان'' کہلاتا ہے۔ علمِ زبان کی تحقیق کو لسانی تحقیق کا نام دیا جاتا ہے اور اس میں اکثر تاریخی یا دستاویزی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ زبان کے موجودہ علم کو صوتیات یا بول چال کے حوالہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لسانیات کے حوالے سے لسانیاتی تحقیق قرار دیا جاتا ہے۔ فردی نند دی سوسیئر (Ferdinand de Saussure) لینگ اور پیرول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''لسان زبان کا ایک نظام ہے جس میں تمام بولنے والے حصہ لیتے ہیں اور کلام عام گفتگو ہے۔ زبان لسانیات کا صحیح مضمون ہے جس میں بطور سسٹم یا گرامر ہوتی ہے۔ جس کے مطابق ہم گفتگو کرتے ہیں اور دوسرا مضمون صوتیات کا میدان ہے۔ لینگ اور پیرول دونوں میں سوسیئر نے جدلیاتی رشتہ قائم کیا ہے وہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور آگے چل کر وہ جدید لسانیات کی ترقی میں بالعموم اور ساختیات کی ترقی میں بالخصوص مدد و معاون ثابت ہوا۔ بقول سوسیئر، لینگ اور پیرول میں فرق یہ ہے کہ زبان کا جامع نظام (جو زبان کی کسی بھی فی الواقعہ مثال سے پہلے موجود ہے) لینگ ہے اور تکلم یعنی بولے جانے والا کوئی بھی واقعہ پیرول ہے جو زبان کے جامع نظام کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا اور اس کے اندر خلق ہوتا ہے۔ لینگ کا تصور سماج میں رچا بسا ہوا ہے۔ یعنی اس سے کسی بھی سماج میں زبان کے تمام بولنے والے (غیر شعوری طور پر ہی سہی) استفادہ کرتے ہیں اور اس کے بغیر کوئی بھی زبان نہیں بول سکتا۔ پیرول زبان کے جامع نظام کی محض انفرادی مثال ہے جو کسی فردِ واحد کے تکلم یعنی بول چال میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ گویا لینگ زبان کا جامع تجریدی نظام ہے اور پیرول اس کی وہ محدود انفرادی شکل جو زبان بولنے والے کے تکلم میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان دونوں کا فرق سوسیئر کے فلسفۂ لسان کا کلیدی نکتہ ہے اور اس کے نتائج دور رس ہیں۔ گویا لینگ سے کم و بیش وہ تصور مراد ہے جس کو عرفِ عام میں 'لسان' کہتے ہیں۔ یعنی لسانی قواعد و ضوابط و روایات کو وہ جامع ذہنی تصور جس کی رُو سے ہم کسی لسانی سماج میں ترسیل و ابلاغ کا کام لیتے ہیں۔ جبکہ کلام روزمرہ کا 'تکلم' ہے۔ یعنی زبان کا وہ استعمال جو زبان بولنے والا کوئی بھی فرد کرتا ہے۔ گویا ایک جامع تجریدی

> تصور ہے، ایک کلی ذہنی نظام جو کوئی بھی زبان رکھتی ہے۔ یعنی زبان کا جامع تجریدی وجود اور کلام اس کا محض وہ حصہ ہے جو کوئی فرد کسی وقت تکلم کے لیے استعمال کرتا ہے۔''[۲۸]

سیّد حمید الدین قادری شرفی اپنی کتاب ''ہند آریائی اور اُردو'' میں لکھتے ہیں:

> ''انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے اسی لیے اسے سماجی حیوان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اپنی ابتدا کے اولین دور میں بھی وہ خاندانی یا اجتماعی زندگی کا عادی تھا لہٰذا اسے ترسیل وابلاغ کے لیے کسی نہ کسی سہارے کی احتیاج فطری بات تھی کیوں کہ اسی طرح سے معاشرتی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل ممکن ہے اپنے جذبات وخیالات کی ترسیل وابلاغ کے لیے انسان نے جو طریقے ایجاد کیے ان میں تین طریقے بے حد کامیاب، کارآمد اور مقبول ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) اشارہ، (۲) تکلم، (۳) تحریر۔''[۲۹]

''لسانیات'' زبان کے ماخذ کی تلاش کرتی ہے، الفاظ کی تشریحات، تقابلی جائزے تاریخی لسانیات کا موضوع ہیں۔ ''لسانیات'' چونکہ زبان کا سائنسی طریقہ سے مطالعہ کرتی ہے اس لیے اس حوالے سے یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ زبان کے دو تفاعل ہیں، ایک معاشرے میں کام سرانجام دیتی ہے اور دوسرا اس کی ساخت کی بناوٹ ہے۔ انسان کے اظہار وخیالات اور ابلاغ کا سب سے اہم ذریعہ زبان ہی ہے۔ کسی بھی قسم کی معلومات کو دوسروں تک پہنچانے کا اہم وسیلہ ہے ماہر لسانیات کے نزدیک زبان ایک سماجی عمل ہے، اس کے اظہار و خیال کے لیے بصری، صوتی یا سمعی حسیّں استعمال ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالسلام اپنی کتاب ''عمومی لسانیات - ایک تعارف'' میں رقمطراز ہیں:

> ''لسانیات ایک ایسی سائنس ہے جو کہ زبان کو اس کی ساخت کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ زبان دو قسم کے مواد کے ذریعہ اپنا کام انجام دیتی ہے۔ ان میں سے ایک اصوات ہیں اور دوسرا ہے خیالات۔ سماجی صورت احوال اور معنی کے لیے انگریزی میں کوئی ایسا جامع لفظ نہیں جو ان تمام امور کا احاطہ کر سکے۔''[۳۰]

اس حوالے سے عتیق احمد صدیقی (مترجم) ''توضیحی لسانیات - ایک تعارف'' میں ماہرین لسانیات کی بابت لکھتے

ہیں:

> ''ماہر لسانیات آواز کو پیغام کی ترسیل کا ذریعہ سمجھتا ہے، اگر یہ آوازیں کوئی غیر ملکی سنے تو وہ مختلف خیال کرے گا۔ اصل میں آواز ایک مربوط نظام ہے، اس کی اپنی ایک ساخت ہوتی ہے، اس کی الگ ساخت ہی لسانیات کا موضوع ہے۔ ماہر لسانیات عام بول چال کی آوازوں کا تجزیہ ایک خاص قسم کی آوازوں سے کرتا ہے، یہی آوازیں ایک ترتیب سے استعمال ہوں تو بیان کہلاتی ہیں اور یہی بیان ہی آواز کا اہم جزو ہے۔''[۳۱]

مجموعی طور پر تمام تر بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لسانیات نے ہمیں یہ تصور دیا ہے کہ زبان کا مطالعہ کس طرح کرنا چاہیے۔ اس نے زبان کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لیے ہمیں نئے نظریات و تصورات دیئے، نئے طریق کار اور تجزیے کی نئی تکنیک سے بھی متعارف کرایا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زبان کی توضیح اور روایتی نظریات کے متعدد عناصر اب تک ہمیں صرف بھٹکاتے رہے ہیں اور ان کے خلاف ایک ردِ عمل تھا جو لسانیات کے وجود میں آنے کا باعث بنا۔

امریکی ماہر لسانیات سائمیون پاٹر کے قول کے مطابق لسانیات کا طالب علم ایسی تکنیک پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے جو انسان اور انسانی اداروں سے تعلق رکھنے والی کسی دوسری سائنس کی تکنیک سے کم نہیں ہے۔ اصوات، ارکان، الفاظ، محاوروں اور فقروں کا معروضی تجزیہ زیادہ سے زیادہ مرکز توجہ بن رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لسانیات کے فروغ کے اسباب علمی ہی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہیں تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان ایک طرح کی تکثیری سائنس ہے کیونکہ سائنسی دعوؤں کا وسیلہ وہی ہوتی ہے اور زبان کا مطالعہ اپنے دامن میں بہت سے علوم کو سمیٹ لیتا ہے۔ لسانیات کے اخذ کردہ نتائج انسانی نیز انسانی ذہن، مزاج، ثقافت، نسلی رشتوں کی تاریخ، بشریات کے مسائل اور خود حضرت انسان کو سمجھنے کے لیے بڑے کارآمد اور دلچسپ ثابت ہوتے ہیں۔ لسانیاتی تکنیک کی زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ صورت، دوسری زبانوں کے سیکھنے اور ان میں بول چال کی مہارت پیدا کرنے میں مدد و معاون ہو سکتی ہے اور اس طرح بالواسطہ بین الاقوامی رشتوں کو انسانی سطح پر بھی استوار کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر سدھیشور ورما لکھتے ہیں:

> ''عہد حاضر کی لسانیات نے باریک بیں انسان کے آگے ایک بالکل نئی حیرت انگیز دل فریب اور لطیف دنیا کھول دی ہے۔ لسانیات کی تحقیقات سے ظاہر ہو گیا ہے کہ دنیا کی زبانوں اور خاص کر بولیوں کے تلفظ میں وہ دلچسپ پیچیدگیاں ہیں جو موسیقی کے نغموں اور ترانوں سے ہرگز کم نہیں۔ بقول اقبال:
>
> آنکھ سے دیکھو تو ایک قطرہ میں ہے طوفان حُسن
>
> میرے ایک پروفیسر ہندوستان کو ''لسانیاتی بہشت'' کہا کرتے تھے۔''[۳۲]

یہاں یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ ماہر لسانیات کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ بہت سی زبانوں پر قدرت رکھتا ہو، حالانکہ موجودہ زمانے میں اس کا یہی مطلب لیا جاتا ہے۔ لسانیات کے ماہر کا یہی مطلب ہے جو کسی زبان کے بارے میں کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ ان اصولوں سے واقف ہو جن سے زبانیں عبارت ہیں اور اسے تفریق کی ان اقسام کا بھی علم ہو جو ایک زبان کے مقابلے میں دوسری سے ملتی ہوں۔

اُردو لسانیات میں تحقیق کرنے کی بہت حد تک گنجائش موجود ہے۔ اگر صرف اُردو کے توضیحی مطالعے کو بھی لیں تو کئی برسوں بعد ایک آدھ تحقیقی مضمون ہی سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ اور برائے نام کچھ دیگر محققین نے چند تاریخی اور تقابلی مطالعے پیش تو کیے ہیں تاہم اُردو لسانیات میں تحقیق کا ڈسپلن وضع کرنے کے لیے ابھی مزید کام کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے خاص طور پر جامعاتی تحقیق میں لسانی تحقیق کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔

علمِ لسانیات کے اجزا:

صوتیہ:

کسی بھی آواز کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی صوتیہ کہلاتی ہے۔

صوت رکن:

زبان کی ادائیگی کے وقت سانس کی ہوا ایک دم سے باہر نہیں نکلتی' بلکہ زبان کی آوازوں کے ٹکڑے اور سانس کی ہوا کی نکاسی دونوں میں ایک ربط رہتا ہے۔ صوتی اعتبار سے زبان کی ادائیگی کے وقت آوازیں گروپ میں تقسیم ہوجاتی ہیں جن کو تنفّسی گروہ کہتے ہیں۔ یہ گروہ صوت رکن کہلاتے ہیں۔ کسی بھی تقریر کو صوت رکن میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

مصوتے:

مصوتے وہ آوازیں ہیں جن میں آواز کے اعضاً گونج کے خلا بناتے ہیں اور جن میں سے سانس کی ہوا بغیر کسی رگڑ کے گزر جاتی ہے۔

مصمتے:

وہ آوازیں ہیں جن میں سانس کی ہوا کو اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ ملتی ہے جس سے رگڑ پیدا ہوتی ہے۔

لینگ:

لسان یا زبان کو لینگ کہتے ہیں۔

پیرول:

عام بول چال کی زبان یا کلام کو پیرول کہتے ہیں۔

بل:

بل تنفّسی بہاؤ میں وہ زور ہے جس سے ایک صوت رکن دوسرے صوت رکن کے مقابلہ میں زیادہ زور

سے بولا جاتا ہے۔ عموماً ہر اس لفظ میں جس میں دو یا دو سے زیادہ صوت رکن ہونگے اس میں سے ایک صوت رکن دوسرے کے مقابلے میں زیادہ زور سے بولا جائے گا۔

لہر:

ایک ہی لفظ یا جملے کو کئی طرح سے ادا کیا جا سکتا ہے جس سے بولنے والا مختلف جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ لہجے کا یہ اتار چڑھاؤ حلق سے نکلنے والے سُر کو بدلنے سے پیدا ہوتا ہے جس کو لہر کہتے ہیں۔

سُر:

کچھ زبانوں میں سُر کے اتار چڑھاؤ سے لفظی معنوں میں تبدیلی کی جاتی ہے ان کو سُر کہتے ہیں۔

مارفیم یا صرفیے:

ماہرین ساختیات چھوٹی سے چھوٹی اکائی کو ”مارفیم“ کہتے ہیں۔ یہ متن یا مواد کی نمائندگی کرتی ہے۔

ساق:

لفظ کا وہ حصہ ہے جس میں تصریفی مارفیم جوڑے جا سکیں ساق کہلاتا ہے۔

علمِ لسانیات کی شاخیں:

(علمِ لسانیات کی شاخیں بیان کرنے کے لیے ڈاکٹر گیان چند جین کی تصنیف ”عام لسانیات“ سے استفادہ کیا گیا ہے۔)

ڈاکٹر شوکت سبزواری ”اُردو لسانیات“ میں لکھتے ہیں:

> ”لسانیات کی دو بڑی شاخیں ہیں توضیحی (یا تشریحی) لسانیات اور تاریخی لسانیات۔ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی زبان کو محض پہچاننے کے لیے توضیحی لسانیات سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن زبان کا محض پہچاننا چنداں مفید نہیں۔ اس کا جاننا یا یوں کہیے ناقدانہ جاننا بھی ضروری ہے۔ زبان کی ”جان پہچان“ زبان کا علم و عرفان ہے اور یہ علم و عرفان اس وقت حاصل ہوتا ہے جب زبان کے بارے میں یہ جاننے کے ساتھ کہ وہ کیا ہے اس امر کی معرفت بھی حاصل ہو جائے کہ کیوں ہے۔ کیا اور کیوں دونوں اس بات میں گویا لازم و ملزوم ہیں۔ توضیحی لسانیات، جیسے آج کل خصوصیت کے ساتھ امریکا میں بہت زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ کسی زبان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاتی کہ وہ زبان کیا ہے۔ ”کیوں“ اس کے دائرہ اختیار و اقتدار سے باہر ہے۔ اس کا علم تاریخی لسانیات سے ہوگا۔ اس اعتبار سے اُردو لسانیات کا منصب یہ ہونا چاہیے کہ وہ یہ بھی بتائے کہ اُردو کیا ہے اور کیوں؟“[۳۳]

توضیحی لسانیات:

زبان کی ساخت کا مطالعہ (تجزیہ) توضیحی لسانیات کہلاتا ہے۔ یہ لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے، اور اسی کی بنیاد پر اس علم کا چرچا ہوا ہے۔ یہ زبان کی ساخت کے حوالے سے بحث کرتی ہے، وضاحت اور تجزیہ اس کا لازمی عنصر ہے۔ آوازیں منہ سے ہی تلفظ ہوتی ہیں اور انھی آوازوں سے ہی الفاظ اور جملے بنتے ہیں، انھی الفاظ، جملوں کی بناوٹ اور معنیاتی نظام کے امتزاج سے ابلاغ کا حق ادا ہوتا ہے۔ زبان کی حقیقی غذا بول چال ہی ہے اور اسی بول چال کی بدولت یہ ارتقائی منزلیں طے کرتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں اپنی ترجمہ شدہ کتاب ”لسانیات کیا ہے؟“[۳۴] میں رقمطراز ہیں:

”توضیحی لسانیات کے مطالعے کو ہم مندرجہ ذیل حصوں میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱۔ فونیات: زبان میں تلفظ ہونے والی مختلف آوازوں کی توضیح اور ان کا تجزیہ۔

۲۔ فونیمیات: زبان میں عمل کے اعتبار سے آوازوں کی بنیادی اور ذیلی حیثیتوں کا تعین کرنا۔

۳۔ فونیم تقسیمیات: آوازوں کی مختلف رکنوں یا لفظوں میں ترتیب و تقسیم۔

۴۔ مارفیمیات: الفاظ کی تشکیل، عمل اور اقسام اور ان کی ساختوں کا توضیحی و تجزیاتی مطالعہ۔

۵۔ مارفونیات: مارفیموں کی تشکیل کے صوتی تغیرات کا جائزہ۔

۶۔ نحویات: لفظوں کی فقروں اور فقروں کی جملوں میں ترتیب و تقسیم اور ان کی مطابقت۔

۷۔ معنیات: الفاظ اور جملوں کے معانی اور ان کے سیاق و سباق کا تجزیہ۔

۸۔ لغتیات: زبان میں سرمایۂ الفاظ اور اس کی نوعیت وغیرہ۔“

فونیمیات:

اس میں کسی ایک زبان کی صوتیات کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس شاخ کو فونولوجی بھی کہتے ہیں۔

مارفیمیات یا صَرف:

اس میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً مادّے میں سابقے اور لاحقے لگا کر نئے الفاظ کا اشتقاق کیونکر ہوتا ہے۔

نحو:

اس کا موضوع کلام یعنی جملہ او فقرہ ہے۔ (مصباح القواعد)

قواعد نگاری:

مصنف مصباح القواعد کے مطابق صَرف و نحو کو ملا کر ”زبان کی قواعد“ کہا جاتا ہے[۳۵]۔ جدید لسانیات میں قواعد نگاری کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لسانیات میں قواعد یعنی صرف و نحو، مصادر اور معنیات کا بہت

عمل دخل ہے۔ یورپ کی طرح برصغیر میں بھی قواعد پر کام ہوا ہے۔ مولوی فتح محمد جالندھری کی ’’مصباح القواعد‘‘، ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی ’’قواعد اُردو‘‘، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کی ’’شمالی ہند کی اُردو کی تاریخی قواعد (۱۶۰۰ء تا ۱۸۱۰ء)، ڈاکٹر شوکت سبزواری کی ’’اُردو قواعد‘‘، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی ’’جامع القواعد‘ (حصہ صرف)‘‘، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی ’’حصہ نحو‘‘ اہم کام ہے۔

معنیات:

اس میں لفظوں اور جملوں کے مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔

لسانی زمانیات:

اس میں اعداد و شمار کی مدد سے کسی زبان کی عمر کا تعین کیا جاتا ہے۔ لسانی زمانیات لغاتی اعدادیات کی سب سے اہم شاخ ہے۔

لسانی عتیقیات:

اس میں قدیم زبانوں کی مدد سے قدیم تہذیبوں اور قبل تاریخ عصر کی تاریخ معلوم کی جاتی ہے۔ یہ اطلاقی لسانیات کی شاخ ہے۔

لغت:

ماہرین ساختیات نے معنیاتی توضیح کے سلسلے کی اقل ترین اکائی کو لغت کہا ہے جن کی مفصل فہرست ڈکشنری کہلاتی ہے۔

تدوین اللغات:

اس میں کسی زبان بالخصوص بچھڑی ہوئی زبان کے لغت بنانے کے اصول طے کیے جاتے ہیں۔

صوتیات:

سیّد حمید الدین قادری شرفی لکھتے ہیں:

> ’’ہر زبان صوتی ہوتی ہے انسان کو اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے اس کا وسیلہ لینا پڑتا ہے ہر انسان کے جسم کے بالائی حصہ میں اعضاء تکلم ہوتے ہیں یا آواز عضوی

> فعلیات کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر زبان کا تصور محال ہے۔ ہر زبان میں مخصوص اور محدود اصوات کا استعمال ہوتا ہے۔ لسانیات میں صوتیات کے مطالعہ کی بڑی اہمیت ہے اس میں آواز کی ترسیل کے اسباب اور سننے کے مسائل پر توجہ دی جاتی ہے۔ انسان کے مختلف اعضاء جیسے پھیپھڑے، حلق، منہ، ناک اور کان اس میں یعنی بولنے سننے میں اپنا اپنا حصہ ادا کرتے ہیں طب کے شعبہ علم الاعضاء کے خطوط پر لسانیات میں ان پر بحث کی جاتی ہے۔''[۳۶]

کسی بھی زبان میں جتنی زیادہ اصوات استعمال ہونگی وہ اسی زبان کا حصہ بن جاتی ہیں اور یہ اصوات تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ جب ہم کسی لمحے بہت سی آوازیں سنتے ہیں تو ہمارے کان ان تمام آوازوں میں تمیز کرنے سے قاصر ہوتے ہیں لیکن ان میں چند آوازیں یاد رکھی جاسکتی ہیں۔ ملفوظ آوازوں کا مجموعہ ہی زبان کہلاتا ہے، یہی آوازیں الفاظ بناتی ہیں، اس طرح ہر آواز کی اپنی شناخت اور خاص علامت ہوتی ہے۔ کسی بھی زبان کے حروف تہجی دراصل ان آوازوں کی علامتیں ہیں، اسی لیے یہ علامتیں اپنا ایک مفہوم رکھتی ہیں۔

ہنری سویٹ (Henry Sweet) اپنی کتاب "Practical Study of Languages" میں لکھتے ہیں:

> ''صوتیات تکلمی آوازوں کی سائنس ہے۔ یہ علمی نقطہ نظر سے تلفظ کا فن ہے۔ یہ زبان کی سائنس ہے لیکن عام طور پر فلکیات اور طبعی سائنسوں کی طرح ایک علم ہے''۔[۳۷]

لسانیات کی اس شاخ میں اصوات کی زیادہ سے زیادہ نزاکتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس میں تمام زبانوں کا مجموعی مطالعہ کیا جاتا ہے اور کسی ایک زبان یا بولی کی صوتیات پر بھی بحث کی جاسکتی ہے۔ صوتیات میں زبان کے مخارج کا مطالعہ کیا جاتا ہے، یعنی اس میں ہم بولی جانے والی زبان کا تجزیہ کرتے ہیں، تحریری زبان سے اس کا کوئی تعلق نہ ہے۔ آر۔ ایچ۔ رابنس (R. H. Robins) اپنی کتاب "General Linguistics, An Introductory Survey" میں لکھتے ہیں:

> ''زبان سے تلفظ ہونے والی آوازیں خارج ہوتی ہیں۔ صوتیات کی اس شاخ کو تکلمی

> صوتیات کہتے ہیں۔ آوازوں کی لہروں کا تجزیہ سمعی فونیات کا موضوع ہے، جو بولنے والے کے ہونٹوں سے سننے والے کے کانوں تک پھیلی ہوتی ہیں۔ صوتیات کی تیسری قسم جو آوازوں کو سنتے وقت کان کے اندرونی نظام سے بحث کرتی ہے اور انہیں پہچاننے کے لیے کان اور دماغ کے تعلق کا جائزہ لیتی ہے، اسے کوشی فونیات کہتے ہیں۔''۳۸

آر۔ ایچ۔ رابنس (R. H. Robins) مزید لکھتے ہیں:

> ''صوتیات لسانی ترسیل کا اہم ذریعہ ہے، جو تمام نارمل انسانوں میں پایا جاتا ہے، ماسوائے (گونگے بہرے اور پاگل) انسانوں کے تکلمی آوازوں کا مطالعہ صوتیات کہلاتا ہے۔''۳۹

ترسیمیات:

زبان کے لیے تحریر ایک خارجی لباس ہے اسی لیے لسانیات میں زبان کے تقریری روپ ہی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ فنِ تحریر کا مطالعہ لسانیات کا موضوع نہیں۔ چارلس ایف ہاکٹ نے (Graphonomy) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جیکب نے (Grammatology) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہاکٹ نے ترسیمیات کو لسانیات کی شاخ تو قرار نہیں دیا لیکن دونوں کو برابر کی حیثیت دے کر ثقافتی بشریات کا جزو قرار دیا تھا کیونکہ فنِ ترسیم بھی زبان کی طرح کلچر کے ذریعے ایک شخص سے دوسرے کو منتقل ہوتا ہے۔

تقابلی لسانیات:

تقابلی علم زبان لسانیاتی علم کی ایک شاخ ہے جس کا کئی صدیوں سے ایک خاص چلن رہا ہے۔ تقابلی علم زبان لسانیات کے مکمل علم کا محض ایک مختصر مگر پیچیدہ حصہ ہے۔ ہم لسانیات کی تعریف ''زبان کے علم'' کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ درحقیقت لسانیات کا بنیادی تعلق زبان کے غیر تاریخی (یعنی یک زمانی) مطالعے میں مضمر ہے۔

اُردو اور دوسری زبانوں کے لسانی رشتے کے حوالے سے سندھی، پنجابی، پشتو، کھوار، ہندکو، سرائیکی، پہاڑی، بلوچی اور بروشسکی کے تعلق پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن یہ سارا کام عموماً لسانی یا لغوی بنیادوں پر ہوا ہے۔ آریائی اور غیر آریائی زبانوں کے شجرے میں ان کی جگہ کو متعین کیا جاسکتا ہے۔ برصغیر کی تمام بولیوں،

مشرقی ہندی، بہاری، راجستھانی، پنجابی، گجراتی، مرہٹی اور دوسری بڑی زبانیں عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، یونانی، پرتگالی، ولندیزی وغیرہ کے الفاظ کا بھی اُردو میں شمار کریں، اور ہندی، عربی، فارسی الفاظ کا تناسب، تعدد اور استعمال معلوم کریں کہ جملے میں مرکزی معنی کی ترجمانی کس زبان کے الفاظ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر عطش درانی لکھتے ہیں:

> ”لسانیاتی یا لسانی تحقیق کار کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ صرف اس زبان سے پوری طرح آگاہ ہو جس پر وہ کام کر رہا ہے بلکہ اس سے متعلق دیگر زبانوں سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ جن کا حوالہ بار بار اس کے دیے گئے مواد اور کوائف میں جھلکتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کے اصل مقام، علاقے اور جگہ کے بارے میں سماجی اور تاریخی معلومات رکھتا ہو۔ خاص طور پر جغرافیائی معلومات اس پر مستزاد ہیں۔ یعنی ملک کی زمین کی نوعیت، آب و ہوا کی کیفیت اور اثرات، ثقافت، موسموں کے تفاوت کا جائزہ لے کیوں کہ یہ سب چیزیں ملک کے بسنے والوں کے خصائل، ان کے رسم و رواج کو متاثر کرتی ہیں اور زبان کی تشکیل میں سب کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ لہٰذا تحقیق کے سلسلے میں تحقیق کار کو ان مخصوص حلقوں میں جانا ہوگا۔ لسانی تحقیق میں حلقہ جاتی کام کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے لیے تحقیق کار کو ایک ایسے اطلاع کار کی ضرورت ہوگی جو اس مخصوص علاقے سے تعلق اور پوری واقفیت رکھتا ہو اور جو مفید مواد فراہم کرنے میں مدد دے سکتا ہو۔“[۴۰]

تجزیاتی لسانیات:

یہ زبان کے ڈھانچے کو منکشف کرتی ہے۔ کسی لفظ یا آواز کے ماضی میں کیا روپ تھے تجزیاتی لسانیات کو اس سے دلچسپی نہیں۔ اس میں صوتیات اور قواعد (صرف و نحو) وغیرہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> ”ایک معنی میں تجزیاتی لسانیات ہی زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ زبان کے ڈھانچے کو منکشف کرتی ہے۔ تاریخی لسانیات تبدیلی اور ارتقا کا مطالعہ کرتی ہے۔ آج کل دنیا

> کے تمام بڑے بڑے ماہرینِ زبان تجزیاتی لسانیات ہی سے سروکار رکھتے ہیں۔ تجزیاتی لسانیات کو تاریخ سے یہاں تک چڑھ ہے کہ وہ زبان کی گزشتہ تاریخ کو قطعاً غیر متعلق اور غیر اہم سمجھتی ہے۔ کسی لفظ یا آواز کے ماضی میں کیا روپ تھے تجزیاتی لسانیات کو اس کے سننے کی تاب نہیں۔“[۲۱]

تجزیاتی لسانیات میں صوتیات اور قواعد (صرف ونحو) وغیرہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے لیکن اس میں جو اصطلاحیں، جو روپ اور ان کے جو گروہ ہوتے ہیں، وہ زبان کے عام نظریے ہی کی دین ہیں۔ اس طرح تجزیاتی لسانیات عام لسانیات کے تابع ہے اور عام لسانیات کے اصول اور طریقے تب ہی کسی کام کے مانے جائیں گے جب عملی اطلاق میں کارآمد ہوں۔ جب بار بار کے تجربوں سے ان کی صحت مستند ہو جائے۔ اس طرح عام لسانیات اور تجزیاتی لسانیات دونوں ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔

علم الانساب:

نسلیات کے کلیے ہیں۔ لسانیات میں زبانوں کی نسبی گروہ بندی اور نسبی شجرے کے مطالعہ کو علم الانساب کہتے ہیں۔

اشتقاقیات:

ایل۔ گراف نے اسے لسانیات کی ایسی شاخ قرار دیا ہے جس میں کلموں کی ہیئتوں اور ان کے صوتی اور تشکیلیاتی رشتوں کا تجزیاتی مطالعہ، اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ ان کے ماخذ کی نشان دہی ہو سکے۔

ساختیات:

لسانی ساخت کے تجزیاتی مطالعے کا نام ہے۔ ساختیات میں مطالعے کی کئی سطحیں ہیں۔ صوتی‘ تشکیلیاتی یا صرفی‘ نحوی‘ معنیاتی اور اسلوبی۔ جدید توضیحی لسانیات انہی پر مشتمل ہے زبان کی صوتی سطح کا تجزیاتی مطالعہ ’فونیمیات‘ کا موضوع ہے۔ صرفی اور نحوی سطحوں پر ساختیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے۔

صوت نگاری:

تحریری نظام صوتی نظام کا مثنیٰ نہیں ہوتا۔ املاً میں یہی کافی ہے کہ کلمہ، لفظ میں اس طرح ڈھل جائے

کہ اس کی ایک قطعی اور آسانی سے مشخص کر دینے والی بصری حیثیت ہو۔

اسلوبیات:

اسلوبیات عام معنوں میں کسی لسانی گروہ کی مختلف قسم کی مروجہ زبان مثلاً سائنس، مذہب، قانون، ادب یا مختلف عمرانی طبقوں کی زبان کے مطالعے میں لسانیاتی تکنیک کے اطلاق کا نام ہے۔ اسلوبیات کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو یا تحریر کی کونسی نوعیت، کس موقع محل اور تناظر میں موزوں ہو سکتی ہے۔ رانا خضر سلطان اپنی کتاب ''انگریزی ادب کا تنقیدی جائزہ (۶۰۰ سے تا حال)'' میں لکھتے ہیں:

> ''اسلوبیات کے تجزیے میں لسانیات کا استعمال ضروری ہے۔ لیکن در حقیقت خالص اسلوبیات کے ضمن میں یہ سب نہیں ہے بلکہ اس میں اجتناب یا انتخاب کے ذریعہ فن کار اتحاد و اختلاف اتصال اور انقطاع کے طریق کار کو استعمال کرتا ہے۔ جن میں فنکارانہ حسن ہوتا ہے۔''۲؎

طارق سعید ''اسلوب اور اسلوبیات'' میں لکھتے ہیں:

> ''لسانیات اور اسلوبیات کا ایک مضبوط رشتہ ہے اور ماہرین لسانیات نے اسلوبیات کو ایک سائنس قرار دیا ہے اور سماجی تناظر میں اسلوبیات کو وضاحتی لسانیات کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ جو ادبی اظہار کے جملہ عناصر ترکیبی کا معروضی طور پر جائزہ لیتی ہے۔''۳؎

عصری لسانیات:

اگر زبان کا مطالعہ کسی مخصوص زمانے میں کیا جائے تو اسے عصری لسانیات کہتے ہیں۔

عصریاتی لسانیات:

اگر زبان کا مطالعہ زمانے کے تسلسل میں کیا جائے تو اسے عصریاتی لسانیات کہتے ہیں۔

عصری بولی علم:

اگر ایک زبان کی بولیوں کا ایک ساتھ مطالعہ کیا جائے تو اسے عصری بولی علم کہتے ہیں۔

نوعیاتی لسانیات:

اگر مختلف خاندانوں کی زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اسے نوعیاتی لسانیات کہتے ہیں۔

عصری نوعیاتی لسانیات:

مختلف خاندانوں (مثلاً دراوڑی اور الٹائی یا الٹائی اور اسکیمو) کا ایک عصر میں مطالعہ کیا جائے تو اسے عصری نوعیاتی لسانیات کہتے ہیں۔

لسانیات کے بارے میں (Teach Yourself Linguistics by Jean Aitchison) میں لسانیات کی وسعت کے بارے میں ایک ڈائیگرام کی مدد سے اس کی تمام شاخیں اور متعلقہ علوم کی وضاحت بیان کی گئی ہے۔ (فرڈی ننڈ ڈی سوسیئر Ferdinand de Saussure) نے اس بات کو شطرنج کے کھیل کی مثال سے سمجھا ہے کہ شطرنج کی کوئی بھی بازی شطرنج کے تمام اصولوں کو بروئے کار نہیں لاتی، لیکن ہر مختلف بازی ممکن اس لیے ہے کہ وہ شطرنج کے کلی اصولوں سے ماخوذ ہے۔ گویا شطرنج کے کھیل کا کلی نظام لینگ سے مشابہ ہے اور شطرنج کی ہر بازی پیرول ہے۔ ایک تجرید ہے اور دوسرا واقعہ ہے[۴۲]۔

Figure

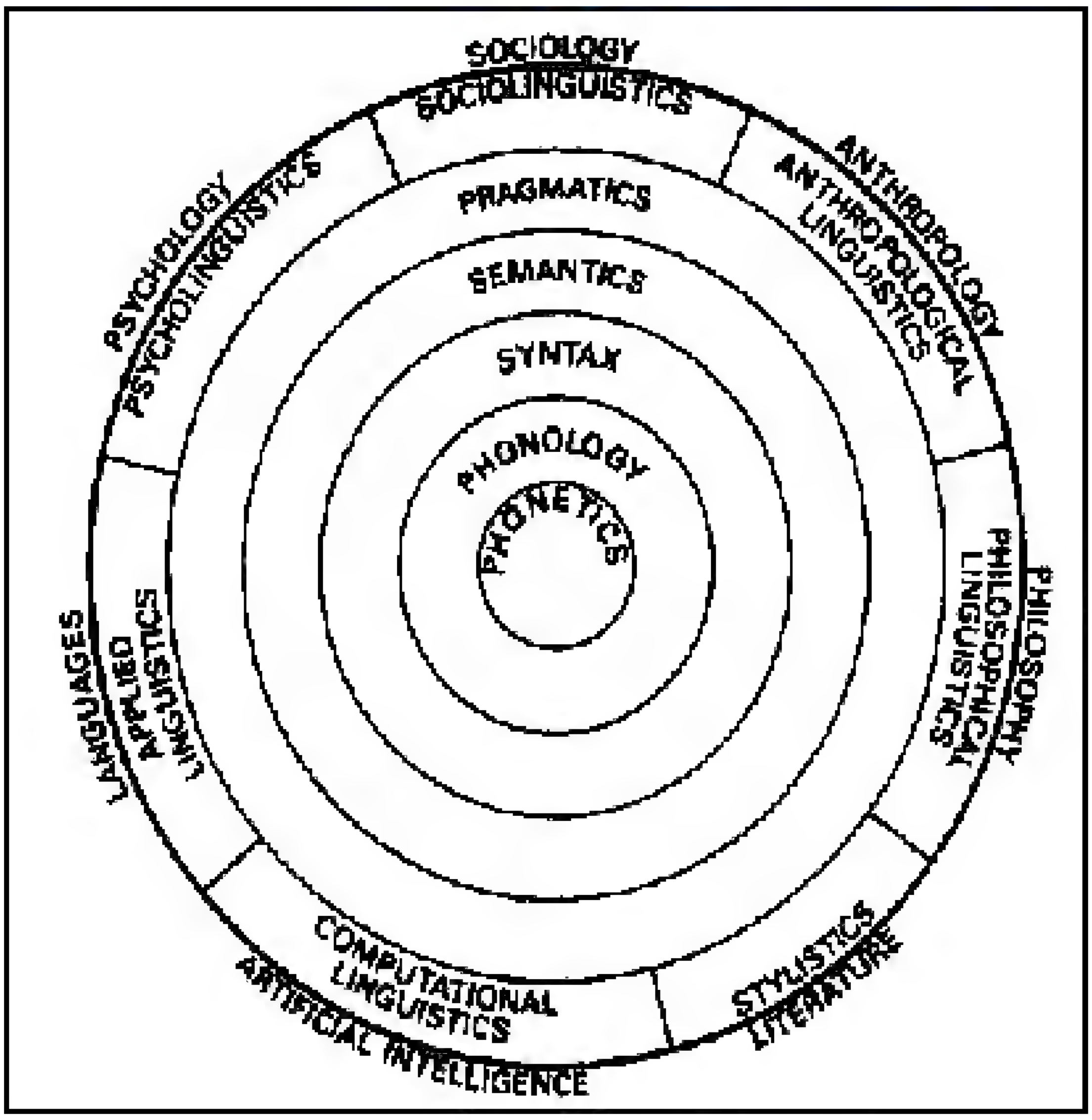
SOCIOLOGY
SOCIOLINGUISTICS
ANTHROPOLOGY
ANTHROPOLOGICAL LINGUISTICS
PHILOSOPHY
PHILOSOPHICAL LINGUISTICS
STYLISTICS
LITERATURE
COMPUTATIONAL LINGUISTICS
ARTIFICIAL INTELLIGENCE
LANGUAGES
APPLIED LINGUISTICS
PSYCHOLOGY
PSYCHOLINGUISTICS
PRAGMATICS
SEMANTICS
SYNTAX
PHONOLOGY
PHONETICS

انیسویں صدی میں زبان کا مطالعہ تاریخی اور ارتقائی حوالے سے کیا جاتا تھا۔ زبان جن تغیرات سے گزر کر موجودہ ارتقاء کو پہنچی ہے ان کا علم حاصل کیا جاتا تھا، تاہم کوئی زبان ایک مکمل ابلاغی نظام کے طور پر کیوں کام کرتی ہے، اس کا جواب تاریخی لسانیات کے پاس نہیں تھا۔ چنانچہ سوسیئر نے زبان کے ارتقائی مطالعے (جسے اس نے Diachronic کا نام دیا) کی جگہ زبان کے یک زمانی Synchronic مطالعے کا نظریہ پیش کیا جو زبان کے کلی نظام کی وضاحت کرسکتا ہے۔ سوسیئر یک زمانی مطالعے کو سائنسی کہتا ہے (ارتقائی مطالعے کو پھر غیر سائنسی کہنا چاہیے) تاریخی لسانیات کو رد کرنے کے ضمن میں سوسیئر اہم ترین دلیل دیتا ہے[۴۵]۔

گویا لسانی عمل ایک ذہنی حالت ہے جس زبان میں تاریخی تبدیلیوں کا شعور موجود نہیں ہوتا، وہ شعور لسانی عمل کو متاثر کرتا ہے۔ مگر ماہر لسانیات زبان کے زندہ، مکمل ابلاغی نظام (جو زبان بولنے والے کے یہاں منکشف ہوتا ہے) کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اسے زبان کی ''تاریخیت کو دبانا چاہیے۔ یک زمانیت کے اس تصور نے ساختیات اور نشانیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

لسانیات میں ہم بولی جانے والی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں نہ کہ لکھی ہوئی زبان کا یہی وجہ ہے کہ ہر سطح پر ہم صرف آوازوں کا ہی مطالعہ کرتے ہیں۔ کسی زبان کی آوازوں کا مطالعہ ہم تین زاویوں سے کرتے ہیں جن کی پہلے تفصیل بیان کر چکے ہیں۔

زبان کی آوازوں کو دو خاص قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک مصوتے اور دوسرے مصمتے۔ مصوتے وہ آوازیں ہیں جن میں آواز کے اعضاء کونج کے خلا بناتے ہیں اور جن میں سے سانس کی ہوا بغیر کسی رگڑ کے گزر جاتی ہے۔

مصمتے وہ آوازیں ہیں جن میں سانس کی ہوا کو اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ ملتی ہے۔ جس سے رگڑ پیدا ہوتی ہے۔ یہ رکاوٹ ہوا کو مکمل طور سے روک کر یا اس کو ایک تنگ راستے سے گزرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

مصوتوں کے پیدا کرنے میں صوت تانت ضرور تھرتھراتے ہیں۔ یعنی مصوتے ہمیشہ مسموع ہوتے ہیں۔ جبکہ مصمتے میں یہ ضروری نہیں ہے۔ اس لیے مصمتے دونوں طرح کے ہوتے ہیں یعنی مسموع اور غیر مسموع۔ مصوتوں اور مصمتوں کے علاوہ ایک تیسری قسم کی آوازوں کی ہے جن کو نیم مصوتے کہتے ہیں۔ یہ وہ آوازیں ہیں جن میں صوت تانت تھرتھراتے ہیں لیکن زبان سے کوئی رگڑ یا رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی ہے۔ انگریزی

میں W اور Y کی آوازیں نیم مصوتے ہیں۔ ان کو نیم مصوتہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ صوت رکن میں یہ مصمتوں کے مقام پر آتے ہیں۔

مصوتوں کی درجہ بندی کے لیے تین باتوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔

(ا) زبان کی اُونچائی: زبان کتنی اونچی اٹھتی ہے، زبان تالو کے قریب آتی ہے یا تالو سے دور یا نیچے رہتی ہے۔ اس اونچائی کو ہم اونچا، نیچا اور وسط میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(ب) زبان کا حصہ: زبان کا کونسا حصہ متحرک ہوتا ہے۔ یعنی زبان کا اگلا حصہ رجی یا وسطی۔

(ج) ہونٹوں کی گولائی: ہونٹوں کی شکل گول ہو جاتی ہے یا پھیلی ہوئی رہتی ہے یعنی گول، پھیلے ہوئے یا معمولی۔

معیاری مصوتے:

معیاری مصوتہ نمبر ۱: [i]

(ا) زبان کی اُونچائی : اُونچی
(ب) زبان کا حصہ : سامنے کا
(ج) ہونٹوں کی شکل : کم پھیلے ہوئے
مثال: : تین ، مشین

معیاری مصوتہ نمبر ۲: [e]

(ا) زبان کی اونچائی : نیچا اونچا
(ب) زبان کا حصہ : سامنے کا
(ج) ہونٹوں کی شکل : کم پھیلے ہوئے
مثال : انگریزی کے لفظ سیٹ (Set) میں

معیاری مصوتہ نمبر ۳: [ɛ]

(ا) زبان کی اونچائی : اونچا نیچا

(ب) زبان کا حصہ : سامنے کا

(ج) ہونٹوں کی شکل : کم پھیلے ہوئے

مثال : انگریزی کے لفظ ریٹ (Rate) میں

معیاری مصوتہ نمبر۴: [x]

(ا) زبان کی اونچائی : نیچا

(ب) زبان کا حصہ : سامنے کا

(ج) ہونٹوں کی شکل : کم کُھلے اور کم پھیلے

مثال : جیسے لفظ ' گئے ' ہے ' وغیرہ ہیں۔

معیاری مصوتہ نمبر۵: [a]

(ا) زبان کی اُونچائی : نیچا

(ب) زبان کا حصہ : پچھلا

(ج) ہونٹوں کی شکل : کھلے اور پھیلے ہوئے

مثال : جیسے لفظ ''آم'' میں

معیاری مصوتہ نمبر۶: [ə]

(ا) زبان کی اونچائی : اُونچا نیچا

(ب) زبان کا حصہ : پچھلا

(ج) ہونٹوں کی شکل : کُھلے اور گولائی کے ساتھ

مثال : جیسے انگریزی الفاظ (Cot) اور (Hot) میں

معیاری مصوتہ نمبر۷: [o]

(ا) زبان کی اُونچائی : نیچا اُونچا

(ب) زبان کا حصہ : پچھلا

(ج) ہونٹوں کی شکل : گول

مثال : جیسے انگریزی الفاظ (Coat) اور ''شُور'' میں

معیاری مصوتہ نمبر ۸: [u]

(ا) زبان کی اُونچائی : اُونچا

(ب) زبان کا حصہ : پچھلا

(ج) ہونٹوں کی شکل : گول اور آگے کو نکلے ہوئے

مثال : جیسے انگریزی لفظ (Pool) یا (Root) میں

دوہرے مصوتے:

یہ وہ مصوتے ہیں جن کو بولتے وقت ان کی خاصیت ایک مصوتے سے دوسرے مصوتے میں بدلنے لگتی ہے۔ دوہرے مصوتوں کو ڈفتھانگ (Diphthong) کہتے ہیں۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن میں بل شروع میں زیادہ ہوتا ہے اور بعد میں کم۔ یعنی شروع میں وہ ایک واضح نقطہ سے چلتے ہیں لیکن ایک مبہم نقطے پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کو گرتا ہوا مصوتہ کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جن میں بل شروع میں نہیں آخر میں ہوتا ہے۔ یعنی شروع میں وہ ایک مبہم نقطے سے چلتے ہیں اور ایک واضح نقطے پر ختم ہوتے ہیں ان کو اُبھرتے ہوئے مصوتے کہتے ہیں۔ اُردو میں آٹھ مصوتے اور دو دوہرے مصوتے ہیں۔ یہ مصوتے ذیل کے نقشہ میں دکھائے گئے ہیں۔ ان کی مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

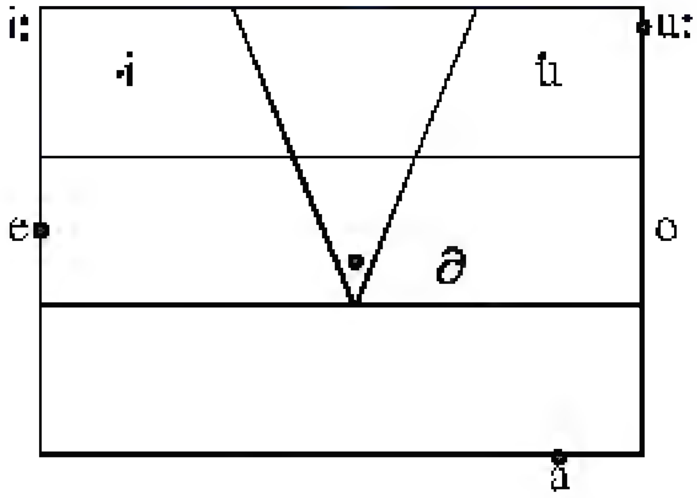

[i:] مثال تیں

[i] مثال ، اِس

[e] مثال ریل ، کھیل

[a] مثال ، اِسم - [o] مثال ، بول

[u] گھل - [u:] مثال ، طول [ə] مثال ، گپ

[əi] مثال ، کئی

[əu] مثال ، موت

دوہرے مصوتے دو مصوتوں کا ایسا مجموعہ ہوتے ہیں جو ایک آواز دے۔ دوہرے مصوتے دراصل مصوتے ہی ہوتے ہیں لیکن وہ دو مصوتوں کی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں: دوہرے مصوتوں میں طریقہ ادائیگی ابتدائی مصوتے سے لے کر اختتامی مصوتے تک مسلسل تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ سادہ مصوتوں میں زبان کی حالت قدرے یکساں ہوتی ہے لیکن ایسے مصوتے بھی پائے جاتے ہیں جن میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر ہم تصویر کے ذریعے زبان کی حالت کو بیان کرنے کی کوشش کریں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ کچھ مصوتوں کو ادا کرنے کے لیے زبان کو حرکت کرنا پڑتی ہے۔ ایسے پیچیدہ مصوتے کو جس کی خصوصیت میں حرکت شامل ہے، دوہرہ مصوتہ کہتے ہیں۔

آر-ایچ-رابنس لکھتے ہیں:

> ''مارفیم سب سے چھوٹی قواعدی اکائی ہے۔ قواعدی تجزیہ کے لیے لفظ بطور گرامر اور بنیادی اکائی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال کم سے کم گرامر اور بنیادی اکائی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی چھوٹی گرامر کی اکائیاں مارفیم کہلاتی ہیں۔ مارفیم کی دو اقسام ہیں۔ پابند مارفیم اور آزاد مارفیم۔ آزاد مارفیم وہ ہے جو خود ایک لفظ بناتا ہے۔ اور پابند مارفیم وہ ہے جو کم از کم کسی دوسرے مارفیم کو ظاہر کرتا ہے۔''[۶]

یورپی زبانوں اور سنسکرت کے متعلق علم لسانیات کے زاویے:

سنسکرت برصغیر کی سب سے قدیم زبان ہی نہیں بلکہ یہاں کے لوگوں کے مذہبی عقائد اور دیو مالائی عناصر بھی اسی زبان سے وابستہ ہیں۔ علاوہ ازیں اردو میں بھی سنسکرت کے نہ صرف الفاظ کسی نہ کسی سطح پر دخیل ضرور ہیں۔ اس لیے قبل اس کے کہ اردو زبان میں ''علمِ لسانیات'' کے مباحث کا جائزہ لیا جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی طور پر سنسکرت کے حوالے سے بھی مطالعہ کیا جائے۔ علاوہ بریں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انگریزوں کی برصغیر آمد سے قبل علم لسانیات کے حوالے سے چونکہ خاطر خواہ کام نہ ہوا تھا، خواہ وہ برصغیر کی کوئی زبان ہی کیوں نہ ہو، اس لیے مستشرقین نے جہاں برصغیر میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اُردو اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی اور دیگر زبانوں پر توجہ دی، وہیں انہوں نے سنسکرت کو بھی اس دھارے میں شامل کیا۔ انگریزوں کے ہاں اس زبان کی اہمیت کی مثالیں کچھ دور جا کر ہمیں فورٹ ولیم کالج میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں جہاں سنسکرت کی بہت سی کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے پر توجہ دی گئی۔

یورپ کو سنسکرت سے روشناس کرانے کا سہرا درحقیقت سر ولیم جونز کے سر بندھتا ہے۔ اس نے آکسفورڈ میں اپنے طالب علمی کے زمانہ سے ہی مختلف زبانوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ وہ ابھی چوبیس برس کا تھا تو اسے دس مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا جن میں یونانی، لاطینی، عبرانی، عربی، فارسی بھی شامل تھیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا اور ۱۷۸۳ء میں کلکتہ کی سپریم کورٹ کا جج مقرر ہو کر ہندوستان آیا۔ اس نے سنسکرت زبان کو بڑے شوق سے سیکھنا شروع کیا۔ ایک اور ماہر سنسکرت سر چارلس ولکنز (Sir Charles Wilkins)(۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۶ء) سے مل کر ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی بنیاد رکھی جو اپنے وقت میں مشرقی دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ تھا۔ فریڈرک شلیگل (Friedrich Schlegel)(۱۷۷۲ء تا ۱۸۲۹ء) نے ۱۸۰۸ء میں ایک کتاب ''اہلِ ہند کی زبان اور حکمت'' نامی شائع کی۔ اس نے سنسکرت اور یورپی زبانوں خاص کر یونانی، لاطینی اور جرمن کے مابین ایک گہرا رشتہ اور یک گونہ مطابقت موجود ہے۔ یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے ''تقابلی لسانیات'' کی اصطلاح وضع کی ہے۔

شلیگل کی کتاب سے متاثر ہونے والی ہستیوں میں سے باویریا کا ایک طالب علم فرانز بوپ

(Franz Bopp)(۱۷۹۰ء تا ۱۸۶۷ء) بھی تھا۔ ۱۸۱۲ء میں سنسکرت کے مطالعہ کے لیے پیرس پہنچا جہاں چار سال کے گہرے مطالعہ کے بعد اس نے ''فارسی اور یورپی زبانوں کا سنسکرت سے موازنہ'' نامی کتاب شائع کی۔ سنسکرت فارسی اور مشہور یورپی زبانوں کا ماخذ کوئی ایک ہی زبان ہے جسے قدیم آریائی زبان کہا جاتا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں اسے برلن یونیورسٹی میں سنسکرت اور تقابلی صرف ونحو کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں اس کی پہلی کتاب کی گولڈن جوبلی کے موقع پر اس کی خدمات کے اعتراف میں دنیا کے ہر حصے کے اہل علم حضرات کے چندہ سے برلن میں اس کے نام پر سنسکرت اور تقابلی صرف ونحو کی تعلیم کے لیے ایک بوپ ادارہ قائم کیا گیا۔ اور اسی ادارے کی کوششوں سے لسانیات بھی دیگر صف اوّل کے سائنسی علوم میں شمار ہونے لگی۔ اس ادارے سے ایک طرف میکس مولر (Max Muller) تعلیم پا کر نکلا اور برطانیہ میں لسانیات کے مطالعہ کی بنیاد ڈال دی۔ دوسری طرف مولر کا ہم عصر اور امریکہ میں لسانیات کا پیش رو ولیم وٹنے بھی اسی ادارہ کا فارغ التحصیل طالب علم تھا۔ اینگلو جرمن فلاسفر اور ماہر لسانیات میکس مولر (Max Muller)(۱۸۲۳ء تا ۱۹۰۰) اور امریکن ماہر لسانیات ولیم وٹنے (William Dwight Whiteny)(۱۸۲۷ء تا ۱۸۹۴ء) دونوں کو فرانز بوپ کے شاگرد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ان کی لسانیات کے لیے خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ لیوی سٹراس تو اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور یہ کہتا ہے:

> ''ساختیاتی لسانی ماڈل، انسانی ذہن کی بنیادی ساخت کو منکشف کرتا ہے۔ یہ ساخت ان طریقوں اور قوانین کی حامل ہے جو تمام سماجی اداروں، فنون اور علوم کی تشکیل کرتے ہیں۔''[۲۷]

رومن جیکب سن نے اپنا نظریہ اپنے مشہور ترسیلی ماڈل کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس ماڈل کے مطابق کسی پیغام کی ترسیل میں چھ عناصر حصہ لیتے ہیں: مقرر، پیغام، سامع، تناظر، کوڈ اور وسیلہ۔ یعنی مقرر کسی سامع کو پیغام بھیجتا ہے۔ یہ پیغام ایک کوڈ میں ہوتا اور تناظر میں با معنی ہوتا ہے۔ پیغام کی ترسیل کسی وسیلے (آواز یا کاغذ) سے ہوتی ہے۔ اس ماڈل کی بنیاد پر زبان کے چھ وظائف ہیں۔ جب ترسیلی عمل سے زور مقرر پر ہو تو زبان کا وظیفہ جذباتی (Emotive) ہو جاتا ہے، جب زور سامع پر ہو تو Conative، جب تناظر کو مرکزی اہمیت دی جائے تو زبان کا وظیفہ حوالہ جاتی ہو جاتا ہے۔ جب کوڈ پر زور دیا جائے تو وظیفہ، میٹا لنگول ہوگا جب وسیلے پر زور دیا جائے تو

Phatic ہوگا اور جب سارا زور پیغام پر ہو تو زبان کا وظیفہ شاعرانہ ہوگا۔

رومن جیکب سن نے مقالہ ‘‘لسانیات اور شعریات’’ کے عنوان سے ۱۹۵۶ء میں انڈیا یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ ان کے پیش نظر بنیادی سوال یہ تھا کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو ایک لسانی عمل کو آرٹ کا نمونہ بناتی ہے؟ اس سوال کا جواب انھوں نے لسانیات میں ہی تلاش کیا۔ گویا ان کے نزدیک شعریات سے مراد محض شاعری ہے۔ ادب کی دیگر اصناف ان کے پیش نظر نہیں ہیں۔ اور شاعری کی شعریات بھی زبان کے ایک مخصوص استعمال سے عبارت ہے۔ یعنی زبان کے چھ کے چھ وظائف بہ یک وقت کارفرما ہوتے ہیں۔ شاعری اس وقت وجود میں آتی ہے جب ان چھ وظائف میں درجہ بندی قائم ہو جاتی ہے اور پہلے درجے پر پیغام آجاتا ہے۔ باقی تمام عناصر اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔

لسانیات—دریدا نے سوسیئر کا یہ نکتہ تو قبول کیا کہ معنی تفریق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ کہ زبان کا سارا نظام فرق سے عبارت ہے۔ پھول اس لیے پھول ہے کہ اس کے فونیم کول، ہول اور فول سے الگ اور متفرق ہیں، مگر دریدا اس بات کو ماننے پر تیار نہیں تھا کہ زبان میں فرق کا یہ سلسلہ کبھی ختم ہوتا ہے۔ یہ محض ملتوی ہوتا ہے اور ہمیں کسی معنی کی وحدت کا تجربہ اس لیے ہوتا ہے کہ زبان کی تفریقی ساخت کو دبایا جاتا ہے۔

جرمن ماہر لسانیات فریڈرک فان شلیگل نے سنسکرت، یونانی، لاطینی اور جرمانی زبانوں کی مماثلت سے خاصی بحث کی ہے اور مماثل کلموں کی طویل فہرست دی ہے اور اس مماثلت کو ہم نسبی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس نے پہلی بار جرمن زبان میں تقابلی گرامر کے لیے ایک اصطلاح استعمال کر کے زبانوں کی اندرونی ساخت کی مماثلت کو ہم نسبی کی بنیاد ٹھہرایا ہے اور یہ کہا ہے کہ زبانوں کے حسب نسب کی صحیح معلومات اندرونی ساخت اور تقابلی گرامر ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس نے پہلی بار ساختیاتی بنیادوں پر زبانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس طرح صوریاتی تشکیلیاتی تقسیم کی داغ بیل اسی نے ڈالی ہے۔ اسی نے مادے کی عضویاتی نمو کی نشان دہی کی اور اندرونی تبدیلی کو تعریف کی اصطلاح سے موسوم کیا۔

ہند یورپی زبانوں کے باقاعدہ علمی تقابل کا آغاز صحیح معنوں میں جرمن ماہر لسانیات فرانز بوپ (۱۷۹۱ء–۱۸۶۷ء) کے ایک رسالے سے ہوا جو ۱۸۱۶ء میں شائع ہوا تھا اور جس میں سنسکرت، یونانی، لاطینی، فارسی اور جرمانی زبانوں کے افعال کے تعریفی لاحقوں سے بحث کی گئی تھی۔ اس سے پہلے ڈینش ماہر لسانیات، ریسک

قدیم نارس یا قدیم اسکنڈی زبان کے آغاز سے متعلق ۱۸۱۴ء میں جو تحقیق کر چکا تھا اس میں زبانوں کے تقابل اور ان کے رشتوں کے اصولوں کا تعین کر کے اسکنڈی نیوین اور جرمانی زبانوں کا تقابل کیا گیا تھا۔ لیکن چوں کہ اس کا کارنامہ ۱۸۱۸ء میں شائع ہوا اور جرمن زبان کے مقابلے میں ڈینش جیسی کم معروف زبان میں تھا اس لیے تقابلی گریمر یا تقابلی لسانیات کا بانی بوپ (Bopp) ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔ ریسک نے جرمانی اور دوسری ہند یورپی زبانوں کے الفاظ کی صوتی مماثلت پر بھی غور کر کے مصمتوں کے تبادل کی نشان دہی کی۔ جیکب گرم نے ۱۸۱۹ء میں جرمانی زبانوں۔ گاتھک، اسکنڈی نیوین، انگریزی، فری سین، ڈچ اور جرمن کی تقابلی گریمر کی پہلی جلد شائع کی۔ ۱۸۲۲ء میں دوسری جلد مکمل کی۔ اس میں جرمانی اور دوسری یورپی زبانوں کے الفاظ کی مماثلت سے بحث کرتے ہوئے حروف کے باقاعدہ تبادل کا فارمولا پیش کیا، جسے بعد میں ”گرمز لا“ سے موسوم کیا گیا۔ جرمانی زبانوں کے بارے میں بلوم فیلڈ لکھتے ہیں:

> ”انگریزی ہند یوروپی زبان جرمینک کی شاخ ہے اور جرمن، ڈچ، فلیمش، فراسین، ڈینش، سویڈش، نارجین اور آئس لینڈک ہے۔ یہ تمام زبانیں ایک شجرہ رکھتی ہیں، ہند یوروپی کی عام بولی پروٹو جرمینک کہلاتی ہے۔ کرسچین دور کے شروع میں پروٹو جرمینک زبانوں نے مشترکہ ثقافتی اور لسانی گروپ تشکیل دیا ہے جو یورپ کے شمال میں رہتے ہیں۔“[۴۸]

۱۸۳۳ء میں بوپ نے سنسکرت، یونانی، لاطینی، فارسی، گاتھک اور جرمن زبانوں کی تقابلی گریمر لکھی اسی دور میں ولیم فان ھمبولٹ (۱۷۶۷ء-۱۸۳۵ء) نے اپنی ایک کتاب میں لسانیات عامہ کے موضوعات، زبان کی ماہیت، ارتقا اور زبانوں کی تشکیلیاتی تقسیم پر قلم اٹھایا یہ کتاب ۱۸۳۶ء میں منظر عام پر آئی۔ بلوم فیلڈ اسے لسانیات عامہ کی پہلی عظیم کتاب قرار دیتا ہے۔

۱۸۳۳ء اور ۱۸۳۶ء کے درمیان آگسٹ فریڈرک پاٹ (۱۸۰۲ء-۱۸۸۷ء) کی تصریفی تحقیقات شائع ہوئیں۔ جنھیں ہند جرمانی (ہند یورپی) تقابلی گریمر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی تصنیف میں صوتیات، مشتقات اور تصریف کے علاوہ اشتقاقی فرہنگ بھی ہے، جس میں تین سو چھتر ایسے مادے دیئے گئے ہیں جو سنسکرت اور معروف ہند یورپی زبانوں میں مشترک ہیں۔ یہ تمام مادے افعال ہیں۔ وہ سنسکرت مادوں کو بنیادی

اہمیت دیتا ہے اور سنسکرت کو قدیم ترین ہند یورپی کی نمائندہ زبان سمجھتا ہے۔ اس نے الفاظ کی مختلف صورتوں اور ہم رشتہ یا متعلقہ زبانوں کی متوازی صورتوں کا تقابل کر کے ان کے ماخذ کا کھوج لگانا چاہا ہے۔ اس طرح الفاظ کی تحقیق کے ذریعے سے ان کی تاریخ مرتب کی ہے۔ ہند یورپی زبانوں کی اشتقاقیات، پاٹ ہی کی مرہون منت ہے۔ جرمن ماہر لسانیات اگسٹ شلیخر کی کتاب ’’ہند یورپی زبانوں کی تقابلی گرامر‘‘ (۱۸۶۱ء) بوپ کی گرامر سے زیادہ مقبول ہوئی۔

ایڈورڈ سپیر (Edward Sapir) (۱۸۸۴ء-۱۹۳۹ء) اور بلوم فیلڈ (۱۸۸۷ء-۱۹۴۹ء) کی اہم نام کتابیں امریکی لسانیات کے ارتقاً میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کے اثرات امریکہ سے باہر کی دنیائے لسانیات پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ دونوں بالکل مختلف بلکہ متضاد نقطۂ نظر رکھتے ہیں، تاہم ان کے نقطہ ہائے نظر کو ایک دوسرے کا تکملہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر بشریاتی ہے اور دوسرے کا کرداریت پسند سپیر کی لسانی دلچسپیوں میں بڑی وسعت ہے۔ اس نے امریکا کی متعدد قدیم زبانوں کا مطالعہ عمرانیاتی تناظر میں کیا تھا۔ وہ لسانی حقائق کی عمرانی سطح اور انسانی قدر کو مقدم سمجھتا تھا۔ اس کی یہ رائے تھی کہ زبان اپنے بولنے والوں کے لیے باہمی رشتوں کی عمدہ علامت تشکیل دیتی ہے۔ اس کے مطالعہ زبان کا رویہ کم و بیش اس ذہنیاتی یا نفسیاتی نظریے پر مبنی ہے کہ زبان کے تغیرات اس کے طبی عناصر ہر انسان کی مرضی و منشا، خیال یا جذبے کے عمل کے زیر اثر رونما ہوتے ہیں۔ وہ لسانی گروہوں کے ’’لسانیاتی شعور‘‘ کو ملحوظ رکھنا بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ آٹو جیسپرسن (Otto Jesperson) زبان کی سائنس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’زبان کی سائنس اس وقت شروع ہو گئی تھی جب پہلی دفعہ انسان کے ذہن میں یہ
> مسائل ابھرے تھے۔ کہ تمام لوگ ایک جیسی زبان کیوں نہیں بولتے؟ سب سے
> پہلے الفاظ کس نے تخلیق کیے؟ کسی بھی چیز اور اس کے نام کے مابین رشتہ کیا ہے؟
> ......وغیرہ‘‘[۹]

جیسپرسن اپنی اسی کتاب (Language: Its Nature Development and Origin) میں لکھتا ہے: ’’اشتقاقیات‘‘ کا مقصد کسی کلمے کے صحیح معنی کا تعین ہے۔ جیسپرسن اس پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

> ''اکثر کلموں کے معانی کا تعین اشتقاقیات کی مدد کے بغیر بھی ممکن ہے۔ ہم سینکڑوں ایسے کلموں کے صحیح معنی جانتے ہیں، جن کی بدلتی ہوئی ہیئتوں یا تاریخ اور ماخذ کا قطعاً علم نہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی نام کا ماخذ اس کے مسمّی پر بالالتزام روشنی ڈالتا ہے اور بعض کلموں مثلاً ''مذہب''، ''تہذیب'' وغیرہ کی تعریف بیان کرتے وقت ان کے حقیقی یا مفروضہ ماخذ کا تذکرہ تمہید کے طور پر ضرور کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اشتقاقیات کے لیے "Etymology" کی اصطلاح وضع کرنے والوں کے پیش نظر یونانی کلمہ "Etumon" بمعنی صحیح رہا ہوگا۔ لیکن اب اشتقاقیات کا منصب کلموں کی موجودہ دلالتوں کی توضیح وتشریح یا معنی نہیں ہے۔ وہ ہمیں مدلول سے متعلق کچھ نہیں بتاتی۔''[۵۰]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''سوسیئر کے فلسفہ لسان کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سوسیئر نے اس خیال کو ہمیشہ کے لیے رد کر دیا کہ زبان لفظوں کے ایسے مجموعے کا نام ہے' جس کا بنیادی مقصد اشیا کو نام دینا ہے۔ سوسیئر کے فلسفے کی رو سے یہ سمجھنا غلط ہے کہ لفظ ایسے مظہر ہیں جو اشیا سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ لفظ محض نشان ہے۔ خواہ یہ بولا جائے یا لکھا جائے جو دو طرفوں پر مشتمل ہے۔ (کاغذ کی دو طرفوں کی طرح)۔ نشان کی ایک طرف کو وہ معنی نما کہتا ہے۔ دوسری طرف کو تصورِ معنی کا نام دیتا ہے۔''[۵۱]

زبان کے جس تصور کو سوسیئر نے رد کر دیا۔ اس کو یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

Word = Thing

لفظ = شے

''اس کے بجائے سوسیئر زبان کے جس ماڈل کو پیش کرتا ہے۔ وہ یوں ہے۔

$$\text{Sign} = \frac{\text{Signifier}}{\text{Signified}}$$

معنی نما

> یعنی زبان میں لفظ معنی رکھتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ لفظ کا شے سے ایک اور ایک کا رشتہ ہے۔ بلکہ اس لیے کہ لفظ رشتوں کے جامع نظام کا حصہ ہیں۔''[۵۲]

سوسیئر سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری پانچ چھ برسوں میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۱ء تک لسانیات پر جنیوا یونیورسٹی میں لیکچر دیئے جو اس کی موت کے دو برس بعد اس کے شاگردوں نے شائع کیے۔ اس کتاب کا نام (Course De Linguistic Generale) ہے۔ ہم اپنی تمام سرگرمیوں کا آغاز نشان سازی کے ذریعے کرتے ہیں۔ چاہے یہ نشانات لفظوں کی صورت میں ہوں یا کسی اور صورت میں، اگر ثقافت میں اس سے ترسیل یا ابلاغ کا کام لیا جا رہا ہے تو یہ نشان ہے۔

حواشی

۱ عبدالحق، مولوی ڈاکٹر، ''قواعدِ اردو''، لاہور: لاہور اکیڈمی، س۔ن، ص ۲۹

۲۔ ''کفایت اردو لغت''، لاہور: محکمہ تعلیم حکومتِ پنجاب، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۲۷

۳۔ چرنجی لال منشی، ''مخزن المحاورات''، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص ۴

۴۔ ''المنجد'' عربی اردو، کراچی: دارالاشاعت، طبع یازدہم ۱۹۹۴ء، ص ۹۲۱

۵۔ Oxford Advance Learners Dictionary, London: Oxford University Press, 1993, pg. 1617

۶۔ Robins, R.H., "General Linguistics: An Introductory Survey", London: Longman, 1971, pg.8

۷۔ ''المنجد'' عربی اردو، ص ۹۲۱

۸۔ آموزگار، حبیب اللہ، ''فرہنگ آموزگار''، تہران، چاپ دوم ۱۳۳۲، ص ۶۱۳

۹۔ مسعود عالم، ڈاکٹر، ''جدید اردو لغت''، لاہور: کمبائنڈ پبلشرز، ۲۰۰۰ء، ص ۶۳۲

۱۰۔ آزاد، محمد حسین، ''سخندانِ فارس''، لاہور: شیخ مبارک علی، طبع سوم ۱۹۵۶ء، ص ۱۵

۱۱۔ کیفی، برجموہن دتاتریہ، ''کیفیہ''، لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء، ص ۶۰

۱۲۔ زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر، ''ہندوستانی لسانیات''، لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۱ء، ص ۳۱

۱۳۔ فرید کوٹی، عین الحق، ''اردو زبان کی قدیم تاریخ''، لاہور: اورینٹ ریسرچ سنٹر، مارچ ۱۹۷۹ء، ص: ۳۶

۱۴۔ Hornby, A.S., "Oxford Advance Learner's Dictionary of Current English", Oxford: Oxford University Press, N.A, pg472

۱۵۔ دہلوی، سید احمد، ''علم اللسان'' دہلی: دفتر فرہنگ آصفیہ، ۱۸۹۵ء، ص ۱۳۔۱۴

۱۶۔ قاضی جاوید، ''جدید مغربی فلسفہ''، لاہور: فکشن ہاؤس، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۶۔۱۲۷

۱۷۔ خلیل صدیقی، ''لسانی مباحث''، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۳۰۰

۱۸۔ Pillsbury & Meader, "The Psychology of Language", Newyork: D. Appleton and Company, 1928, pg17

۱۹۔ اقتدار حسین خان، ڈاکٹر، ’’لسانیات کے بنیادی اصول‘‘، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۵ء، ص ۱۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۲

۲۱۔ Crystal, David, "What is Linguistic?", London: Edward Arnold (Publishers) Ltd., Fourth Edition, pg.3

۲۲۔ Barber, Charles L., "The Story of Language", New Delhi: Cosmo Publications, 2007, pg.10

۲۳۔ گلزار احمد، صوفی، مرتبہ: ’’کشاف اصطلاحاتِ نفسیات‘‘، نظر ثانی و اضافہ: محمد شمیم ہاشمی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء، ص ۲۳۶

۲۴۔ زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر، ’’ہندوستانی لسانیات‘‘، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، مارچ ۱۹۶۰ء، ص ۱۷

۲۵۔ نصیر احمد خاں، ڈاکٹر، ’’اردو لسانیات‘‘، نئی دہلی: اردو محل پبلی کیشنز، پہلا ایڈیشن مارچ ۱۹۹۰ء، ص ۱۵

۲۶۔ نصیر احمد خاں، ڈاکٹر، مترجم: ’’لسانیات کیا ہے؟‘‘، مصنف: ڈیوڈ کرسٹل، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴

۲۷۔ Hockett, Charles F., "A Course in Modern Linguistics", New York: Maclemon Company, 1958, pg.2

۲۸۔ Southworth, Franklin C., & Daswani, Chander J., "Foundations of Linguistics", New York: The Free Press, 1974, pg.5

۲۹۔ حمید الدین قادری شرفی، سید، ’’ہند آریائی اور اردو‘‘، حیدر آباد (آندھرا پردیش)، ۱۹۸۶ء، ص ۳۴

۳۰۔ عبد السلام، ڈاکٹر، ’’عمومی لسانیات: ایک تعارف‘‘، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء، ص ۷

۳۱۔ صدیقی، ڈاکٹر عتیق احمد، مترجم: ’’توضیحی لسانیات: ایک تعارف‘‘، مصنف: گلیسن جونیئر، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۲ء، ص ۳

۳۲۔ ورما، ڈاکٹر سدھیشور، ’’آریائی زبانیں‘‘، حیدر آباد (دکن): اعظم اسٹیم پریس، ۱۹۴۲ء، ص ۹

۳۳۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’اردو لسانیات‘‘، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء، ص ۵

۳۴۔ نصیر احمد خاں، ڈاکٹر، مترجم: ’’لسانیات کیا ہے‘‘، ص ۱۵

۳۵۔ جالندھری، فتح محمد خاں، ''مصباح القواعد''، حصہ اول، رامپور: اشاعت خانہ رامپور، ۱۹۴۵ء، ص ۵

۳۶۔ حمید الدین قادری شرفی، سید، ''ہندآریائی اور اردو''، ص ۴۶

۳۷۔ Sweet, Henery, "The Practical Study of Languages", London: Oxford University Press, 1972, pg.4

۳۸۔ Robins, R.H., "General Linguistics: An Introductory Survey", London: Longmans, 2nd Ed.1971, pg.4

۳۹۔ Ibid, pg.82

۴۰۔ عطش درانی، ڈاکٹر، ''جدید رسمیاتِ تحقیق''، لاہور: اردو سائنس بورڈ، طبع اول، ۲۰۰۵ء، ص ۲۰۱

۴۱۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ''عام لسانیات''، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۳ء، ص ۲۴

۴۲۔ خضر سلطان، رانا، ''انگریزی ادب کا تنقیدی جائزہ (۶۰۰ء سے تا حال)''، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵۹

۴۳۔ طارق سعید، ''اسلوب اور اسلوبیات''، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۹

۴۴۔ Aitchison, Jean, "Linguistics: Teach Yourself", N.A.,, pg.8

۴۵۔ Saussure, Ferdinand De, "Course de Linguistique General", Paris: Payot, 4th Edition1991, pg.81

۴۶۔ Robins, R.H., "General Linguistics: An Introductory Survey", pg.96

۴۷۔ Lodge, David, Ed: "Modern Criticism and Theory", Delhi: Pearson, 2003, pg.31

۴۸۔ Bloomfield, L., "Language", London: Allen & Unwin, First Edition 1933, pg.18

۴۹۔ Jesperson, Otto, "Language: Its Nature, Development and Origin", London: Allen & Unwin Ltd., 1922, pg.19

۵۰۔ Ibid, pg.316

۵۱۔ نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند، ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، بار سوم ۲۰۰۴ء، ص ۴۵۔ ۴۶

۵۲۔ نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند، ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، ص ۴۶

بابِ دوّم

اُردو زبان کے نظریات

اردو زبان کا تعلق برِصغیر پاکستان و ہند سے ہے۔ اگر اس کے ذخیرۂ الفاظ کی طرف نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں دنیا کی تقریباً ہر بڑی زبان کے الفاظ کسی نہ کسی طور پر ہم روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں اور یہ چیز صرف الفاظ تک محدود نہیں ہے، بہت سے محاورات، ضرب الامثال اور تراکیب ایسی ہیں جو ہم نے بعینہٖ دیگر زبانوں سے حاصل کر رکھی ہیں۔ ان زبانوں میں عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے ساتھ ساتھ مقامی زبانیں یعنی پنجابی، سنسکرت، گجراتی اور دراوڑی بھی شامل ہیں۔ اگر لفظ ''اُردو'' کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ''اُردو'' ترکی یا تاتاری زبان کا لفظ سمجھا جاتا ہے اور ان زبانوں میں لشکر یا بازارِ لشکر کو اُردو کہتے ہیں۔ چونکہ اس زبان کی ابتداء ترکی اور ایرانی لشکروں کی آمد و رفت اور لین دین کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ اس لئے یہی نام رکھ دیا گیا۔ تاہم یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ اُردو کو لشکر سے منسوب کرنے کے عوض اردشہر یا اردبیل (قدیم شاہانِ ایران) کا مشتق سمجھا جائے تو زیادہ قرین قیاس ہے۔

اگر ''اردو لسانیات'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ لفظ اُردو کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لفظ ''اُردو'' بذاتِ خود ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ''لشکر'' یا ''خیمہ'' ہے۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

> ''یہ لفظ ترکی میں مختلف شکلوں میں اُردہ، اوردو اور اُردو جس کے معنی فرودگاہ، لشکر اور
> پڑاؤ نیز لشکر و حصہ لشکر ہیں۔''[۱]

ہمارا انگریزی (Horde) بھی اس (اُردو) سے متعلق کہا جاتا ہے۔ ۱۱۹۳ء کے بعد سے جس وقت فوج کا قیام دہلی میں ہوا، اسے ''اُردو یا اُردوئے معلیٰ'' (عسکر اعلیٰ) کے نام سے پکارا جانے لگا۔ عام خیال یہ ہے کہ شہر کے باشندے ہندی کی علاقائی بولی (شاخ) برج بولتے تھے جب کہ اس لشکر یا فوج کی زبان فارسی تھی تاہم اس خیال کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ برج کسی زمانہ میں دہلی کی زبان تھی۔ دارالسلطنت کے لوگ جس زبان میں گفتگو کرتے تھے وہ ہندی کی ابتدائی شکل تھی۔ جسے کھڑی بولی کے نام سے جانا جاتا تھا۔

اُردو کوتر کی سنسکرت، بھاشا، پرتگیزی، فارسی، عربی، انگریزی غرض کہ تمام گزشتہ موجودہ اور انڈو ایرین اور سامی زبانوں کا مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ اس دعویٰ کی ایک بولتی ہوئی دلیل یہ ہے کہ دنیا کی کوئی زبان خواہ مغرب میں بولی جاتی ہو یا مشرق میں، شمال میں جاری ہو یا جنوب میں؛ ایسی نہ ملے گی جو اپنی مخالف زبانوں کے تمام لہجوں پر پوری طرح قادر ہوسکتی ہے۔ عجم (ایران) ٹ، ڑ، ڈ، ص، ض، ط، ظ اور مخلوط ہائے ہوز (ھ) کے بولنے میں گونگا ہے۔ عرب، پ، چ، ژ، گ پر زبان نہیں ہلا سکتا۔ انگلستان بھی، غ، ڑ نہیں بول سکتا۔ اس طرح ہندوستان میں اُردو کے سوا تمام پراکرتیں اپنا شین (ش) قاف (ق) درست نہیں رکھتیں۔ یہ بات اُردو ہی کے لئے مخصوص ہے کہ اجنبی سے اجنبی لہجے کی نقل کا اصل اتار لیتی ہے۔

اس لحاظ سے ''اردو'' کا مطالعہ کسی قدر دقیق اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ''اردو'' زبان کی پیدائش سے متعلق کوئی حتمی اندازہ ابھی تک نہیں لگایا جاسکا کہ اس کا آغاز کب کیسے اور کہاں سے ہوا؟ البتہ اس ضمن میں ماہرینِ لسانیات نے اپنی اپنی بساط، مطالعہ اور تحقیق کی مدد سے کچھ نظریات پیش کیے ہیں جن کی مدد سے اردو زبان کی ابتدا کے متعلق مدلل قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ اس کے باوجود کسی نظریے کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا جس کا سبب یہ ہے کہ ہر نظریے سے متعلق دلائل کو سو فیصد تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی انہیں سو فیصد رد کیا جا سکتا ہے۔ آئندہ سطور میں اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو زبان کی پیدائش کے نظریات کا جائزہ لیا جائے گا تا کہ اس امر کا اندازہ لگایا جا سکے کہ اردو زبان کی پیدائش کی اصل حقیقت کیا ہے اور وہ کون سے محرکات تھے جن کی مدد سے اِس خطے میں ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آئی۔

ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو نام ہیں جسے لسانیوں کی اصطلاح میں کھڑی بولی کہا جاتا ہے۔ یعنی کھڑی بولی دیوناگری لپی میں ہندی اور فارسی لپی میں اُردو کہلاتی ہے اور یہ نام ان کی لپیوں سے یوں چپک گئے ہیں کہ دونوں دو مختلف زبانیں معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرا بڑا فرق ان کے تلفظ کا ہے کہ ایک ہی لفظ دونوں میں الگ الگ دو طرح بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو میں فارسی کا لفظ فارسی کی بول چال کے مطابق ادا کیا جاتا ہے لیکن ہندی میں وہی لفظ سنسکرت سے مستعار لیا گیا

> ہے، جس کا مکتوبی روپ فارسی بول چال سے مختلف ہے۔ بہر حال لپیوں اور مستعار لفظوں کے تلفظ کا فرق محض سطحی ہے۔ اس فرق سے ان زبانوں کے بنیادی ڈھانچے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ اُردو اور ہندی دونوں کی تاریخ مشترک ہی نہیں بلکہ ایک ہے۔ پھر بھی اُردو والوں کو ہندی کے مورخین سے تاریخ زبان کی تدوین میں کوئی مدد نہیں مل سکی کیونکہ انھوں نے ہندی کے ذیل سے راجستھانی، برج بھاشا، مرہٹی، اودھی، بہاری وغیرہ بہت سی زبانوں کو سمیٹ لیا جس سے کھڑی بولی کی تاریخ کا سر رشتہ ہی ہاتھ سے نکل گیا اور ادھر اُردو کے مورخین نے جو قلم اٹھایا تو اُردو کے دامن میں لاہور کی پنجابی، دہلی کی ہریانی، لکھنؤ کی اودھی اور بیجاپور کی دکنی کو بھر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو کی صحیح تاریخ ابھی تک سامنے نہیں آسکی۔"[۲]

ڈاکٹر حامد حسن قادری اُردو کو غیر آریائی زبان قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اُردو سنسکرت سے پہلے وجود میں آئی اور سنسکرت کے قواعد سے اس کے قواعد انتہائی مختلف ہیں۔ یہی بات عین الحق فرید کوٹی دراوڑی کے حوالے سے کرتے آئے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اُردو" ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی تھی۔ اگرچہ "دکن میں اُردو" ۱۹۲۳ء میں چھپی مگر لسانی اہمیت کے مواد، لسانیات کے سائنٹفک تصور اور نظریہ سازی کی بنا پر "پنجاب میں اُردو" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ لسانی تحقیقات اور ان کے تجزیاتی مطالعہ کے لحاظ سے یہ عرصہ زیادہ نہیں لیکن جس زبان میں خود نثر کی عمر ۲۰۰ برس (میر امن کی باغ و بہار ۱۸۰۱ء) جس میں تنقید کی عمر سو برس (حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" ۱۸۹۲ء) ہو تو اس میں لسانی نظریہ سازی کی اتنی عمر بھی غنیمت ہے۔ البتہ انگریزوں اور دیگر مغربی مستشرقین کے کام سے قطع نظر کر کے صرف اُردو مصنفین کو لیں تو انشا کی "دریائے لطافت" کو پہلی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے، اگرچہ یہ فارسی میں لکھی گئی ہے۔ اُردو لسانیات کا سرمایہ مخطوطات، قدیم مسودات اور قلمی بیاضوں کی صورت میں ملتا ہے اور انھی پر ماہرین لسانیات کی تحقیقات کی اساس استوار نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ آثارِ قدیمہ، کتبے، سکے، فرامین اور اسی نوع کے دیگر تاریخی شواہد سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عطش درانی اپنی کتاب "اُردو جدید تقاضے، نئی جہتیں" میں لکھتے ہیں:

> "اُردو کے لسانی پہلو پر تحقیق کے ساتھ دو بڑے المیے وابستہ رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ

> ادب اور تنقید کے علی الرغم زبان پر تحقیق کو جامعات کے اُردو شعبوں میں پذیرائی نہ مل سکی اور دوسرے علم زبان یعنی زبان کے ماضی کا علم اور لسانیات یعنی زبان کے حال کا سائنسی علم اُردو دانوں کے ہاں سندِ تفریق اور وجۂ امتیاز حاصل نہ کر پائے۔ انھیں ایک ہی علم سمجھا گیا اور دونوں کو ”لسانیات“ ہی کی اصطلاح سے یاد کیا گیا ہے۔ اگر ہمیں اُردو کو ترقی دینا ہے تو اسے ان دونوں المیوں سے نجات دلانا ہوگی۔ جامعات کے اُردو شعبوں میں ادب کے پہلو بہ پہلو مگر اس سے مقدار میں زیادہ زبان پر تحقیق اور علم زبان اور لسانیات کو علیحدہ علیحدہ تحقیقی موضوع کے طور پر پروان چڑھانا ہوگا۔ جامعات کے اُردو شعبوں کو اُردو ادب سے زیادہ اُردو زبان اور لسانیات کے شعبے قرار دینا ہوگا۔“[۳]

لفظ زبان کی بنیادی اینٹ کہلاتا ہے۔ یہ لسانیاتی علامت ہے۔ اس حوالے سے کی گئی تحقیق گویا علم، زبان اور لسانیات دونوں کی بنیادی تحقیق کہلائے گی۔ اس کے بھی کئی پہلو پر تحقیق انجام دی جا سکتی ہے۔ مثلاً ”اشتقاقیات“ اور اس کی ذیل میں لفظی مادوں پر بحث، خاص طور پر غیر عربی الفاظ کے مادوں کا تجزیہ یعنی لاحقوں، سابقوں اور حرفوں کا تجزیہ، فارسی امر اور لاحقوں میں امتیاز کی واضح حدود، اصولِ نحو کے ساتھ مختصر کیے گئے الفاظ اور سابقوں میں امتیاز وغیرہ۔ لفظوں کی تشکیل میں ساق، مفرد آمیزش، تصریف، صوتیات اور فونیمیات کے کئی پہلو تشنۂ تحقیق ہیں۔ کسی خاص خطے یا مقام سے اُردو زبان کو مخصوص کرنے کے پہلو بہ پہلو ماہرین کے لسانی نظریات بھی ملتے ہیں جنھوں نے اُردو کا کسی خاص بولی یا زبان سے تعلق جوڑا۔ اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزادؔ (برج بھاشا) ڈاکٹر شوکت سبزواری (قدیم ویدک بولی) ڈاکٹر مسعود حسین خاں (ہریانوی) ڈاکٹر سہیل بخاری (مرہٹی) اور عین الحق فرید کوٹی (دراوڑی) وغیرہ ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ”کائنات کی سانس وقت کی ڈگر پر چل رہی ہے اور بولنے کی زبان سانس کی ڈور سے بندھی ہوئی ہے۔ خدا نے آواز بنائی اور انسان نے بولی‘ جو آواز ہی سے بنی ہے۔“[۴]

عین الحق فرید کوٹی فرماتے ہیں:

> ''وہ واسطہ جس سے ہم دوسروں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ''زبان'' کہلاتی ہے۔ اور یہ ایک ایسے صوتی سلسلے کا نام ہے، جو کہ انسان کے اعضائے نطقی کے ذریعے ظہور میں آتا ہے اور اعضائے سماعی کے ذریعے سماعت پذیر ہوتا ہے۔ یہ سماجی عمل دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اقوام میں الفاظ واشتقاق، صرف ونحو، معانی و بیان اور بلاغت وصوتیات کے تحت زمانی ومکانی حالات کے مطابق جاری رہتا ہے اور اب اتنا ترقی کر چکا ہے کہ کسی زبان کے مطالعے کو ایک سائنس کی حیثیت بھی حاصل ہو چکی ہے ''معرفۃ اللغات'' ایک علمی موضوع بن گیا ہے اور انسان کی علمی تاریخ میں پہلی بار غیر ملکی زبانوں سے لاعلمی کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔''[۵]

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''اُردو زبان کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ایک لالۂ خودرو ہے جس نے اپنی غذا برِّ ہند کے مختلف خطوں کے عوام سے حاصل کی اور اس کے اثمار وسیع پیمانے پر تقسیم کیے۔ اُردو زبان اولمپک کی اس شمع کی طرح ہے جس کا الاؤ تو ایک مرکزی جگہ پر روشن ہوتا ہے لیکن جس کی روشنی نگر نگر، قریہ قریہ اور شہر شہر گردش کرتی ہے اور لوگوں میں زندگی اور تحرک کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ چنانچہ اُردو کو مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے معاشرتی امتزاج کا خوبصورت ترین ثمر قرار دیا گیا ہے۔''[۶]

لیکن یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ مسلمان یہ زبان باہر سے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے اور نہ اس زبان کو انہوں نے یہاں آ کر دفعتاً نافذ کر دیا تھا بلکہ یہ لسانی اختلاط کا نتیجہ تھی۔ اور یہ اختلاط برِّ ہند کے ہر اس خطے میں ظہور پذیر ہوتا رہا جہاں مسلمانوں کی قدم آرائی کے آثار ملتے ہیں۔ اس ضمن میں دکن میں اُردو کی ابتدائی نشوونما کا دعویٰ کیا گیا تو دلیل یہ دی گئی کہ دکن میں عربوں کے تجارتی روابط زمانہ قبل از اسلام سے قائم تھے۔ اس ضمن میں سیّد سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

> ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اس وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''[۷]

حافظ محمود شیرانی نے ملتانی، پنجابی اور اُردو کی لسانی شہادتوں سے قریبی مماثلت ثابت کی اور پنجاب میں اُردو کی تشکیل کے ضمن میں یہ استدلال پیش کیا:

> ''سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان نہیں بنی تھی تو غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ہے ایسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے اور چونکہ یہ پنجاب میں بنی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار ہو۔ بہرحال قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوئے ہیں جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں۔''[۸]

ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی نے بھی لکھا ہے کہ:

> پنجابی مسلمان جو ترک افغان فاتحین کے ہمراہ نئے دارالحکومت دہلی میں آئے...... وہ دہلی میں اپنی بولی بولتے آئے تھے جو دہلی کے شمالی اضلاع اور شمال مغربی علاقوں کی زبان سے حد درجہ مشابہت رکھتی تھی، انہوں نے اس زبان کو جو کاروباری زبان بن گئی تھی، لہجہ و آہنگ دیا اور اس کے نقش و نگار کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔''[۹]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پنجاب میں اُردو کے فروغ کے سلسلے میں پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی کے اس خیال کو بھی قابل توجہ قرار دیا ہے کہ:

> ''پنجابی کے بارے میں دو خاص باتیں ذکر کے قابل ہیں: ایک تو یہ کہ شورسینی پراکرت کے آثار جس قدر پنجابی میں پائے جاتے ہیں اور آج تک موجود ہیں اتنے کسی اور زبان میں نہیں پائے جاتے۔ اور دوسرے یہ کہ غیر ملکی الفاظ سے مہمان نوازی کا برتاؤ سب سے پہلے اس کے حصے میں آیا۔''[۱۰]

ڈاکٹر وحید قریشی نے ابتدائے اُردو کی بحث کو ان الفاظ میں سمیٹا ہے:

> ''اُردو کی ابتدا پاکستان میں ہوئی، اس کی ادبی ترقی، ادبی سرمایہ بیرون پاکستان تخلیق ہوا لیکن اس کا لسانیاتی نظام مقامی زبانوں سے مربوط ہے۔''[۱۱]

مولانا آزاد نے ''آبِ حیات'' میں زبان اُردو کی تاریخ کا آغاز اس طرح کیا ہے:

> ''اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔''[۱۲]

ماہرین لسانیات کی اکثریت نے مولانا آزاد کے اس نظریہ کو درست تسلیم نہیں کیا لیکن حکیم سیّد شمس اللہ قادری نے ''اُردوئے قدیم'' میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ اُردو کا منبع اور مخرج برج بھاشا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اُردو زبان کی ابتدا کب ہوئی اور کس مخصوص علاقے کو اس کی جنم بھومی قرار دیا جاسکتا ہے، اس کے متعلق اب تک ماہرین لسانیات نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ان نظریات میں لسانی اور تاریخی اعتبار سے مضبوط ترین نظریہ حافظ محمود شیرانی کا سمجھا جاتا ہے جنہوں نے زبان اُردو کے آغاز کا سہرا پنجاب کے سر باندھا۔ شیرانی صاحب اس نظریے کے اولین پیش کار تو نہیں ہیں لیکن انہوں نے پہلی بار قدیم منظوم اور منثور قلمی آثار، بکھرے ہوئے مواد اور محققانہ باریک بینی سے اسے مربوط انداز میں پیش کیا۔ شیرانی صاحب ''پنجاب میں اُردو'' (۱۹۲۷ء) کی اشاعت کے بعد بھی اس موضوع پر مقالات کی صورت میں مسلسل لکھتے رہے۔ لیکن ان کے بعد یہ موضوع تشنۂ تحقیق ہی رہا۔ جو کچھ لکھا گیا اس میں یا تو شیرانی صاحب کے نظریے کا بطلان ہے یا برِصغیر کے کسی اور خطے کو زبان اُردو کی ابتدا کا شرف دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ برسوں بعد جس شخص نے اُردو زبان کے آغاز و ارتقا سے متعلق لسانیاتی مباحث کو نیا رُخ دیا۔ وہ بھی پنجاب ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا نام عین الحق فریدکوٹی ہے۔''[۱۳]

زبان کے معنی کا تعلق بولنے والے کی بہ نسبت سننے والے کے ذہن سے زیادہ ہے۔ بولنے والا چاہے جتنا سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرے، زبان کے بنیادی مقصد یعنی امدادِ طلبی کا واضح تاثر اس حقیقت پر منحصر ہے کہ سننے

والے نے اس کا کیا مفہوم سمجھا۔ اس کے ثبوت میں وہ کثیر تعداد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جنھیں ہم عرف عام میں غلط فہمیاں کہتے ہیں اور جو بولنے اور سننے والے کے درمیان پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جس طرح ابتدا میں لفظ کے معنی متعین کیے گیے ہیں، اسی طرح ہر لفظ کا تلفظ بھی طے کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ معنی کی طرح تلفظ بھی ایک ایسا اجتماعی عمل ہے جو افراد معاشرہ کی باہمی رضامندی سے رواج پاتا ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ کسی بھی زبان میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی دو قسمیں یعنی ''خارجی'' اور ''داخلی'' ہیں۔ خارجی تبدیلی اس وقت عمل میں آتی ہے جب دو زبانیں ایک دوسرے کے قریب پہنچتی ہیں اور ان میں نہ صرف الفاظ کا بلکہ آوازوں کا بھی لین دین ہونے لگتا ہے۔ زبان کی داخلی تبدیلی تقلیدی نمونوں کے پیش نظر پیدا ہوتی ہے جبکہ مروجہ الفاظ کی مثالوں کو سامنے رکھ کر دوسرے الفاظ تیار کر لئے جاتے ہیں۔ مثلاً اُردو میں لفظوں پر ''کڑ'' کا لاحقہ اضافہ کر کے اسما بنانے کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آرہا ہے جس کے ثبوت میں بھلکڑ (بھول سے)، سدھکڑ (سادھو سے)، گدکڑ (کودسے) وغیرہ الفاظ ہمارے سامنے ہیں۔ مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی اپنی کتاب ''افاداتِ سلیم'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہندی اور فارسی دونوں آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔ اُردو زبان کے تیار کرنے میں ان دونوں زبانوں نے کام کیا ہے۔ عربی ایک دوسرے خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے، جس کو سامی خاندان کہتے ہیں۔ اگر ہم اُردو زبان کے ان الفاظ کو شمار کریں، جو ہندی اور فارسی سے لیے گئے ہیں تو بمقابلہ عربی زبان کے الفاظ کے اِن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زبان میں آریائی الفاظ کے درمیان چھ اور ایک کی نسبت ہے۔ اُردو زبان کی قدرتی ساخت آریائی ہے۔ کیونکہ اس کی گرامر وہی ہے جو آریائی زبانوں کی مشترک گرامر ہے۔ عربی کے الفاظ بلاشبہ اس میں شامل کیے گئے ہیں۔''[۲۴]

مولانا کا یہ بھی خیال ہے کہ:

> '' اُردو زبان کو عام ہندوستانی زبان بنایا جائے اور ہندی کے آسان عام فہم اور شیریں الفاظ کا اُردو میں اضافہ کیا جائے، اس طرح ہمارے ہندو بھی اُردو سے زیادہ

> مانوس ہو جائیں گے، ہندی زبان کی ایک وسیع فرہنگ اُردو میں تیار کر دی جائے۔ یہ کام ہندو بھائیوں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے، اس فرہنگ میں سنسکرت الفاظ کو بھی شامل کیا جائے۔ اس طرح اُردو زبان کا دائرہ وسیع ہوگا اور ہندوستان کے ہر صوبہ کے لیے عام فہم ہو جائے گی، جو حضرات بنگالی' گجراتی' مرہٹی' پنجابی وغیرہ جدید زبانوں کا علم رکھتے ہیں وہ ایسے الفاظ کی فہرستیں تیار کریں اور ہماری زبان کے شاعروں اور انشا پردازوں کے سامنے رکھیں، اس طرح ہندوستان کی اسپیرنٹو جو یورپ کی ایک مصنوعی مشترک زبان ہے کی طرح ہماری زبان بھی ہو سکتی ہے اگر اس میں جدید آریائی زبان کے مشترک الفاظ بڑھا دیے جائیں۔''[۱۵]

تمام آریائی زبانوں میں الفاظ کے آگے پیچھے چھوٹے چھوٹے اجزا شامل کر کے نئے الفاظ بنا لیے جاتے ہیں۔ لفظ کے شروع میں جو جز لایا جاتا ہے اسے انگریزی میں پری فکس اور اُردو میں سابقہ کہتے ہیں، اور جو جز لفظ کے آخر پر لگایا جاتا ہے، اسے انگریزی میں سفکس اور ہماری زبان میں لاحقہ کہتے ہیں۔ افاداتِ سلیم سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

فارسی سابقے:

با:۔ باضابطہ۔ باقاعدہ۔ باوفا۔ باایمان۔ بامروت۔ باادب۔ باحیا
بے:۔ بےادب۔ بےایمان۔ بےبس۔ بےچین۔ بےدھڑک۔ بےڈھب
نیم:۔ نیم بسمل۔ نیم تر۔ نیم ملا۔ نیم حکیم
ہم:۔ ہم رنگ۔ ہم درد۔ ہم سفر۔ ہم سُر

ہندی سابقے:

اَن:۔ اَن پڑھ۔ اَن گھڑ۔ اَن جان۔ اَن مول
مہا:۔ مہابلی۔ مہاپاپ۔ مہاجن۔ مہاراجہ۔ مہادیو
نِر:۔ نِرملی۔ نِرمل۔ نِربھاگ۔ نِراس

فارسی لاحقے:

انہ:۔ عالمانہ۔معشوقانہ۔سالانہ۔مستانہ

انی:۔ جسمانی۔روحانی۔برفانی۔نورانی

خانہ:۔ شفاخانہ۔جیل خانہ۔ڈاک خانہ۔بھٹیارخانہ

نویس:۔ عرضی نویس۔اخبارنویس۔چٹھی نویس۔کاپی نویس

ہندی لاحقے:

الا:۔ پٹیالہ۔جوالہ۔بنیالہ۔کوڑیالہ

ونت:۔ بونت۔جسونت۔سادونت۔لاج ونت

یرا:۔ سپیرا۔ٹیرا۔مکیرا۔پتھیرا

یلا:۔ رسیلا۔پتھریلا۔شرمیلا۔نشیلا

ہندی فارسی اور عربی لفظوں کے آخر میں مصدر کی علامت لگا دی جاتی ہے جس سے مختصر الفاظ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی، فرانسیسی، جرمنی جو یورپ کی ترقی یافتہ زبانیں ہیں، ان میں بے شمار نئے مصادر بنائے گئے ہیں۔ مولانا وحیدالدین سلیم نے ہندی، فارسی اور عربی مصادر کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں[۱۹]۔

ہندی مصادر:

انگلانا (انگلی سے)۔پتھرانا (پتھر سے)۔بنیانا (پانی سے)۔تنبیانا (تانبے سے)۔

ٹھکرانا (ٹھوکر سے)۔چٹیانا (چوٹ سے)۔چتھاڑنا (چیتھڑے سے)۔چکرانا (چکر سے)

فارسی مصادر:

انگیزنا (انگیز سے)۔بخشنا (بخش سے)۔تراشنا (تراش سے)۔خریدنا (خرید سے)۔

داغنا (داغ سے)۔شرمانا (شرم سے)۔

عربی مصادر:

بحثنا (بحث سے)۔ بدلنا (بدل سے)۔ تحصیلنا (تحصیل سے)۔ دفنانا (دفن سے)۔
غلیفنا (غلاف سے)۔ کفنانا (کفن سے)۔

بیشتر ماہرین لسانیات زبان کے علامتی منصب کو اساسی اہمیت دیتے ہیں۔ زبان کا علامتی نظام ہی لسانیات، گرامر، فونیمیات، معنویات حتّٰی کہ منطق تک کے لیے مطالعاتی مواد فراہم کرتا ہے۔ اکثر ماہرینِ لسانیات، لسانیاتی تحقیقات میں زبان کے اغراض و مقاصد کو ملحوظ رکھنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے اور زبان کے علامتی حیثیت اور علامتوں ہی کو زبان کی روح قرار دیتے ہیں۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ”زبان لفظوں سے بنتی ہے اور لفظ آوازوں کا مجموعہ ہوتے ہیں اس لیے عام طور پر آوازوں کے تغیر اور لفظوں کی ساخت پر غور کرنا لسانیات کا ضروری پہلو قرار پاتا ہے۔ الفاظ شعر و ادب میں بھی کام آتے ہیں اور لکھنے والا ان کے مفہوم پر خاص طور سے غور کرتا ہے مگر علم اللسان کا نقطۂ نظر سے آوازوں کا فرق لفظوں کی بناوٹ اور زبانوں کی خاندانی خصوصیات زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لسانیات کا علم لفظوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہ معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے کہ اس کے یہ اجزاء اور کن زبانوں میں پائے جاتے ہیں اور اس طرح وہ یہ جان لیتا ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبان سے کیا تعلق ہے وہ الفاظ کی بناوٹ اور تاریخ پر غور کر کے یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ یہ زبان کن دوسری زبانوں سے خاندانی رشتہ رکھتی ہے۔“ [۱۷]

انہوں نے اپنی کتاب ”اُردو لسانیات کا مختصر خاکہ“ کے آخر پر زبانوں کے خاندان کا ایک مفصل نقشہ پیش کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

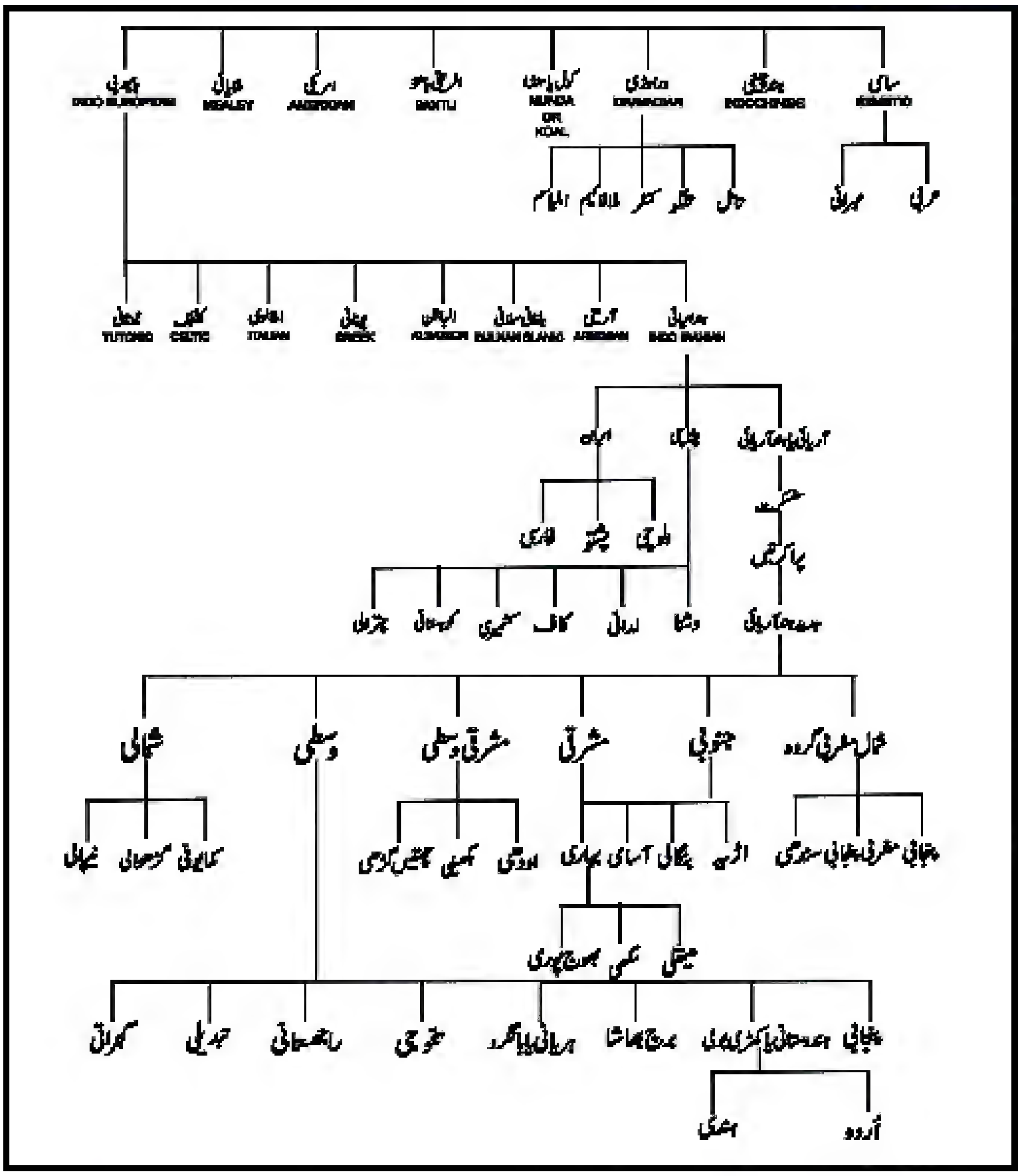
سامی
SEMITIC
ہند چینی
INDOCHINESE
دراوڑی
DRAVIDIAN
کول یا منڈا
MUNDA
OR
KOAL
افریقی بنتو
BANTU
امریکی
AMERICAN
ملایا
MALAY
ہند یورپی
INDO EUROPEAN
عربی
عبرانی
تامل
تلگو
کنٹر
ملایالم
المیاسم
ہند ایرانی
INDO IRANIAN
آرمنی
ARMENIAN
بلقانی سلاوی
BALKAN SLAVIC
البانی
ALBANIAN
یونانی
GREEK
اطالوی
ITALIAN
کلٹی
CELTIC
ٹیوٹنی
TEUTONIC
آریائی یا ہند آریائی
پشاچ
ایرانی
سنسکرت
پراکرت
بلوچی
پشتو
فارسی
جدید ہند آریائی
وشنا
ریلی
کافر
کشمیری
کوہستانی
چترالی
شمال مغربی گروہ
جنوبی
مشرقی
مشرقی وسطی
وسطی
شمالی
پنجابی
مغربی پنجابی
سندھی
اڑیہ
بنگالی
آسامی
بہاری
اودھی
بگھیلی
چھتیس گڑھی
کمایونی
گڑھوالی
نیپالی
میتھلی
مگہی
بھوجپوری
پنجابی
ہندوستانی یا کھڑی بولی
برج بھاشا
ہریانی یا بانگرو
قنوجی
راجستھانی
بھیلی
گجراتی
اُردو
ہندی

لسانی مطالعہ کے ابتدائی ادوار میں زبان کو مذہبی اور فلسفیانہ نوعیت کے حصوں میں تقسیم کیا جاتا رہا۔ مذہبی حوالہ سے قدیم ہند، مشرقِ وسطی اور اٹھارویں صدی تک کے یورپ میں پائے جانے والے تصور کا پتہ چلتا ہے جبکہ مصر اور یونان فلسفیانہ طرزِ فکر کے فروغ میں اہم کردار کے حامل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

> ”جب تک مافوق الفطرت طاقتوں یا تقدیرِ الٰہی پر عقیدہ راسخ رہا۔ اس وقت تک
> حیات وکائنات کی الہامی توجیہات ہی اطمینان بخش ثابت ہوتی رہیں لیکن جب یہ
> عقیدہ متزلزل ہوا اور انسانی ذہن پر الہامی توجیہات کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو عقل

وشعور کی رہ نمائی حاصل کی گئی اور آہستہ آہستہ سائنسی نقطۂ نظر پیدا ہوا۔''[۱۸]

ڈاکٹر انیس ناگی نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے:

> ''زبان کا یہ تصور ناقص ہے کہ کوئی زبان مکمل طور پر جذباتی نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں زبان کا وظیفہ صرف ہنگامی جذبات کا اظہار نہیں ہے۔ آہ' واہ' ہائے ایسے کلمات جذبے کی موجودگی کا سراغ تو دیتے ہیں مگر ان کی قدر و قیمت کا پتہ نہیں دیتے۔ اگر آہ اور واہ میں کارفرما اصول کو لسانی ادراک سے تعبیر کر لیا جائے تو حیوان اور انسان کی زبان میں فرق قائم نہیں رہتا۔ انسان کا لسانی اظہار ایک ترقی پذیر عمل ہے۔ حیوان کا اظہار صوتی ہو تو ہو مگر اسے لسانی نہیں کہا جا سکتا۔''[۱۹]

لسانی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ زبان کے آغاز کے سلسلہ میں ماہرین نے جس قدر توجہ دی ہے۔ شاید ہی کسی اور موضوع کو نصیب ہو سکی ہو لیکن اس ضمن میں جو کچھ بھی پیش کیا گیا اس کا بیشتر حصہ قیاس و مفروضات پر مبنی ہے۔ چونکہ تحقیق کو کبھی حرف آخر نہیں کہا جا سکتا ہے کہ زبانوں کے ارتقائی نظریات جس قدر بھی پائے جاتے ہیں کسی نہ کسی پہلو سے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ محمد قاسم نوری فرماتے ہیں:

> ''یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ زبانیں تخلیق نہیں کی جا سکتیں بلکہ قدرتی اور صدیوں کے تاریخی عمل سے تشکیل پاتی بنتی سنورتی اور فنا ہو جاتی ہیں۔ دنیا کے کسی بھی ملک کی کسی بھی زبان کو ہم کسی خاص فرقے' قبیلے یا قوم کی زبان قرار نہیں دے سکتے۔ کوئی قوم اپنا کلچر' اپنی تہذیب اور اپنی زبان ساتھ لے کر پیدا نہیں ہوتی بلکہ مختلف بولیوں کے ملاپ سے یا دوسری زبانوں کے اثر سے اپنا علیحدہ رنگ اختیار کرتی ہے اور صدیوں کی اتھل پتھل کے بعد اس قابل ہوتی ہے کہ اسے نیا نام یا انفرادیت حاصل ہو سکے۔''[۲۰]

دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کی تعداد ہزاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ ماہرین نے پرکھنے کی کوشش کی ہے کہ مختلف زبانوں کا رشتہ کیا ہے؟ نیز ایسے اصول و ضوابط بھی بنائے گئے ہیں۔ جن سے پتہ چل سکے کہ عالمی سطح پر زبانوں کو مختلف گروہوں اور خاندانوں میں کیسے تقسیم کیا جا سکتا ہے اور یہ تقسیم مقبولیت کی کن حدود کو چھو سکتی ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''برعظیم ہندوپاکستان کو 'زبانوں کی کٹھالی' کہا گیا ہے کیونکہ اس خطے میں جہاں ہند یورپی خاندان کی زبانوں کی اکثریت ہے۔ وہاں ڈراوڑی' ہند چینی اور مونڈا خاندان کی زبانوں کے اثرات بھی کچھ کم نہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق چونکہ ہند یورپی خاندان کی ایک شاخ ہند ایرانی یا ہند آریائی سے ہے اس لیے ہم باقی خاندانوں کو زیرِ بحث نہیں لاتے۔''۲۱

ہر زبان کے سیکھنے کے لیے قاعدے قانون کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ یہ قانون دوسری زبانوں کے لیے اجنبی اور منفرد بھی ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کو صحیح طور پر سیکھنے اور بیان کرنے کے لیے ان اصولوں کی پاسداری ضروری ہوتی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اہلِ زبان اپنی زبان سیکھنے کے لیے صرف ونحو کے محتاج نہیں ہوتے۔ بچپن ہی سے جو الفاظ ان کے کانوں میں پڑتے ہیں وہی سیکھ کر بولنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ مختلف کلمے جان جاتے ہیں اور لاشعوری طور پر زبان کے قواعد کی تصحیح کی جانب گامزن رہتے ہیں۔ البتہ مادری زبان کے علاوہ کوئی زبان سیکھنا مقصود ہو تو قواعد کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے ماہرین اپنے طور پر قواعد مرتب کرتے ہیں تاکہ دوسری زبان بولنے والے بھی ان کی زبان سیکھنا چاہیں تو سیکھ سکیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان سیکھنے والے خود بھی قواعد ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''دنیا کی اکثر زبانوں کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان زبانوں کے قواعد اور لغت کی ابتدائی تالیف وتدوین کا کام بالعموم ان لوگوں نے انجام دیا جو خود اہل زبان نہ تھے بلکہ کسی ضرورت سے وہ کوئی زبان بطور ثانوی زبان سیکھتے اور استعمال کرتے تھے۔''۲۲

اس رائے کی روشنی میں اُردو زبان کے حوالہ سے طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں اہل زبان کی تحریر کردہ کتابوں میں سیّد انشاءاللہ خان انشاء کی کتاب ''دریائے لطافت''، حیدر جنگ بہادر کی کتاب "Key to Hindustani" اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب ''قواعدِ اُردو'' کے علاوہ متعدد کتب صرف ونحو کی نمائندگی کرتی ہیں، وہاں مستشرقین میں سے اسٹیفاس پیٹروئسر جارج گریرسن، جمس شلزے اور رہیڈ لے کے نام نمونے کے طور پر

پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اُردو زبان کی بنیاد کے بارے میں جو نظریات سامنے آئے ہیں اُن کے مطالعہ سے علم ہوگا کہ مورخینِ زبانِ اُردو میں سے کچھ اُردو کا تعلق عربی اور فارسی سے جوڑتے ہیں جبکہ درحقیقت اُردو کا بنیادی ڈھانچہ مقامی زبانوں سے جوڑنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے وارث سرہندی کی یہ رائے خاصی اہمیت کی حامل ہے:

> ''کسی بھی زبان کی بنیاد کوئی باہر کی زبان نہیں ہو سکتی۔ جو زبان جس ملک میں پیدا ہوئی ہو، اس کی بنیاد اس ملک کی کوئی زبان اور مقامی بولیاں ہو سکتی ہیں۔ چونکہ اُردو کا مولد و منشا برعظیم پاک و ہند ہے۔ اس لیے لامحالہ اُردو کی بنیاد سنسکرت اور دوسری پراکرتیں ہو سکتی ہیں۔ رہا غیر زبانوں سے الفاظ کا اخذ و قبول تو یہ ثانوی بات ہے اور زندہ زبانوں میں یہ لین دین ہوتا ہی رہتا ہے۔''[۲۳]

ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں داخل ہو جانے اور اس میں گھل مل جانے کے باوجود بھی اس کی اصلیت سے انکار ممکن نہیں۔

ہر زبان کا دیگر زبانوں سے قریبی تعلق ہونے کے باعث متعدد الفاظ مستعار لیے جاتے ہیں۔ اس طرح زبانوں میں اشتراک کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اشتراک اس قدر گہرا بھی ہو جاتا ہے کہ بعض الفاظ کا تعین ناممکن ہو جاتا ہے یعنی الفاظ کے اخذ و قبول کا معاملہ اس قدر مشکل ہوتا ہے کہ الفاظ ہر زبان کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ قومی زبان اُردو کے علاوہ دیگر پاکستانی زبانیں بظاہر الگ الگ ہونے کے باوجود مربوط اور یک رنگ نظر آتی ہیں۔ اُردو نے سندھی، سرائیکی، پنجابی، پشتو، بلوچی اور براہوئی کے بیشتر اثرات قبول کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو پاکستان کی دوسری زبانوں کے قواعد سے ہم آہنگ اور ذخیرہ الفاظ میں اشتراک رکھتی ہے۔ پروفیسر ممتاز حسن اُردو اور پاکستانی زبانوں کے اشتراک کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''پاکستان کے پانچ بڑے لسانی علاقے ہیں، پنجابی، پشتو، سندھی، ملتانی، بلوچی۔ یہ ساری زبانیں اسی ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس سے اُردو کا تعلق ہے۔ ان میں سے پنجابی، لہندا، ملتانی یا سرائیکی، پشتو اور سندھی یہ بولیاں اسی ایک

> شورسینی پراکرت ابھرنش کی بیٹیاں ہیں۔ جس کی ایک بیٹی اُردو یا مغربی ہندی یا کھڑی بولی ہے۔ یہ سارے رشتے ناتے اور یہ سارے تاریخی اسباب کمزور رہ جائیں گے۔ اگر اُردو نے مقامی بولیوں سے الفاظ قبول کرنے اور مقامی لب ولہجہ کی پذیرائی میں خست اور تاخیر سے کام لیا۔"[۲۴]

یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان نہ کوئی فرد ایجاد کر سکتا ہے اور نہ اسے فنا کیا جا سکتا ہے۔ مختلف تہذیبی عوامل، رنگارنگ قدرتی عناصر، مسلسل میل جول اور رسوم و معاشرت گھل مل کر رفتہ رفتہ صدیوں میں جا کر کسی زبان کے خدوخال اجاگر کرتے ہیں۔ یہ سب کے منہ چڑھی زبان جسے آج ہم اردو کے نام سے پکارتے ہیں، جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور "عربی، ایرانی، ہندی" تینوں تہذیبوں کا سنگم اور ان کی منفرد علامت ہے اور یہ کوہِ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک سمجھی اور بولی جانے لگی۔ گریرسن نے لکھا ہے کہ:

> "برعظیم کی ساری جدید زبانیں اپ بھرنش ہی کے بچے ہیں۔"[۲۵]

جبکہ حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ:

> "مسلمان اقوام نے ہندوستان میں اپنے لئے ایک زبان مخصوص کر لی ہے اور جوں جوں ان کے مقبوضات فتوحات کے ذریعے سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں۔ یہ زبان بھی ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال وجنوب میں پھیلتی جاتی ہے۔"[۲۶]

البتہ ڈاکٹر شوکت سبزواری یہ تسلیم نہیں کرتے کہ "اُردو نے پنجاب میں جنم لیا اور پنجاب کی بیٹی ہے۔"[۲۷] اور ڈاکٹر جمیل جالبی اسی نظریے کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرتے ہیں[۲۸]۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کا اردو سے وہی تعلق ہے جو ایک ماں کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔ بیٹی بیاہ کر کہیں چلی جائے لیکن ماں اور بیٹی کا ازلی رشتہ اسی طرح قائم رہتا ہے اور چونکہ ماں کبھی ڈائن نہیں بن سکتی، اس لئے اردو اور اہل پنجاب کا یہ رشتہ ناتا اسی طرح قائم ہے۔ "اُردو" دراصل "ہندوستانی" سے ترقی پا کر بنی جو دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو "ہندوستانی" زبان دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی۔ اس لیے ہندوستانی مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب متفقہ طور سے

اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں۔ البتہ اس میں یہ اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو اس کی ادبی شکل ہے۔

عصر حاضر کے بہت بڑے نفسیاتی نقاد اور ''مختصر ترین تاریخ'' کے نام سے پکارے جانے والے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''میر امن لسانیات کے ماہر نہیں مگر انہوں نے ''باغ و بہار'' کے دیباچہ میں اردو کے آغاز اور تشکیل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے کئی اور ماہرین متفق نظر آتے ہیں۔ ان کے بقول: ''حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر کے ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے ان ہی کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودھی بادشاہ آئے اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمانوں کی آمیزش پائی۔ آخر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا آتا ہے۔ ہندوستان کو لیا ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال و جواب کرتے ایک زبان اردو مقرر ہوئی۔''[۲۹]

گویا ایک ایسا ملک جو مختلف قوموں، مختلف نسلوں، مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا، وہاں یہ امر ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو۔ وہ پیدا ہوئی اور اس کا نام ''اردو'' ہے۔ میر امن کی تحریر سے مستشرقین بھی گمراہ ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہارنل نے اردو کو مخلوط زبان قرار دیا۔ مشہور ماہر لسانیات اور ''لسانیات جائزہ ہند'' (Linguistic Survey of India) کے مصنف گریرسن کی ابتدائی رائے بھی یہی تھی جبکہ ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

> ''آج بھی اسی دوآبہ کی ایک بولی یعنی کھڑی ہندوستان کی لنگوا افرینکا بنی ہوئی ہے جو

> یقیناً اسی تاریخی حادثہ کا طفیل ہے کہ مسلمانوں نے دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔‘‘[۳۰]

ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور لارڈ ولز لی کی کوششوں سے مئی ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اور پروگرام کے مطابق انگریز ملازمین کمپنی نے ہندوستان کی مقامی زبانیں سیکھنے کی کوششیں بھی شروع کر دیں تھیں۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اس کام میں نمایاں حصہ لیا جس کا اعتراف رام بابو سکسینہ، سید احتشام حسین اور مولوی عبدالحق صاحب نے بھی کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے جان گلکرسٹ کی خدمات کو اس حد تک خراج تحسین پیش کیا ہے کہ:

> ’’بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اردو شاعری پر کیا تھا اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان گلکرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ہے۔‘‘[۳۱]

اُردو زبان کی ابتداء کے بارے میں سب سے پہلے جو نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ میر امن، سرسید، مولانا صہبائی، شمس اللہ قادری اور مولانا محمد حسین آزاد کے نظریات ہیں۔ ان تمام فاضلین نے اردو زبان کی تاریخ پیدائش مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد بلکہ مغلوں کے عہد میں تلاش کی ہے۔

میر امن اپنی کتاب ’’باغ و بہار‘‘ مولفہ ۱۸۰۲ء کے مقدمہ میں زبان اردو کے آغاز کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ’’جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئیں لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی اس لئے اکٹھے ہونے سے آپس مین لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان مقرر ہوئی۔‘‘[۳۲]

میر امن کے اس بیان کے بعد امام بخش صہبائی رسالہ ’’قواعد اردو‘‘ میں اور شمس اللہ قادری ’’تاج اردو‘‘ میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان مصنفین کے بعد ہمارے سامنے مولانا آزاد کا نظریہ آتا ہے جو بقول ڈاکٹر مسعود حسین:

> ’’لسانی تحقیق کے مرد میدان ہیں۔‘‘[۳۳]

’’آزاد‘‘ اپنی تصنیف ’’آبِ حیات‘‘ کے دیباچہ میں زبان اردو کی ابتداء کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ”اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا
> خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان
> کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا
> وطن ہے۔“[۳۴]

رام بابو سکسینہ کی تصنیف ”تاریخ زبان اردو“ کے بعد ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی کی کتاب ”پنجاب میں اردو“ شائع ہوتی ہے جس میں وہ نہایت مدلل طور پر پچھلے تمام نظریات کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اردو کا ماخذ برج بھاشا یا مغربی ہندی نہیں بلکہ پنجابی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اردو اور پنجابی کی صرف ونحو، تذکیرو تانیث کے قواعد اور توابع کے اصولوں کی مطابقت و مماثلت دکھاتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ اردو زبان برج بھاشا وغیرہ کی نسبت پنجابی خصوصاً ملتانی کے قریب تر ہے۔

مشہور ماہرین لسانیات ڈاکٹر گراہم بیلی، گریرسن اور ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی بھی اس سلسلہ میں شیرانی صاحب کے ہم نوا اور ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر بیلی نے اردو کو پنجابی کی بولی ٹھولی سے ترقی پا کر بنی ہوئی زبان قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اُردو ۱۰۲۷ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔ قدیم پنجابی اس کی ماں ہے اور قدیم کھڑی بولی مانڈر، برج سے براہِ راست اسکا کوئی تعلق نہیں[۳۵]۔

اُردو ایک ایسی زبان ہے جس کی ارتقائی منازل کا تعین کرنا بہت مشکل ہے اور بحث جاری ہے اور لسانیات کی تحقیق پر قطعی نتیجے تک پہنچنا بہت مشکل ہے کیونکہ زبان انسان کے روزمرہ امتیازی کاموں کا سہارا ہے۔ زبان اظہار و خیال کا ذریعہ ہے اور نفسیاتی تحقیقات کا آلہ ہے اور تجربات زندگی کی محافظ ہے۔ علوم وفنون زندگی کا سہارا ہے۔ زبان قدما کی علمی میراث کے لئے جسم و جان ہے اور یہ چراغ زندگی کا روغن ہے، ذہن کی تربیت کرتی ہے، ذہن کو چمکاتی ہے اور انسانی زندگی کا محور اعظم ہے۔

زبان کوئی ایک شخص ایجاد نہیں کرتا۔ یہ لاکھوں، ہزاروں انسانوں کے میل ملاپ اور بول چال سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے لسانیاتی تناظر میں قطعی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔ یہ کوئی ریاضی کا کلیہ نہیں ہے کہ اخذ کرلیا جائے کیونکہ تحقیق اور تنقید کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ مختلف ماہرین لسانیات اپنے اپنے نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی صاحب اس میدان کے سرخیل ہیں جو اردو کا رشتہ پنجابی سے جوڑتے ہیں اور

صرف ونحو سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عطش درانی اردو زبان کی ابتدا کے متعلق اپنے نظریات کا پرچار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”مسلمانوں کے ساتھ یہاں یہاں یہ زبان پہنچی وہاں وہاں علاقائی اثرات کو جذب کر کے اپنی شکل بناتی رہی اس کا ایک ہیولیٰ سندھ وملتان میں تیار ہوا۔ پھر یہ لسانی عمل سرحد اور پنجاب میں ہوا۔ جہاں سے تقریباً ایک صدی بعد دہلی پہنچا اور وہاں کی زبانوں کو جذب کر کے اور ان میں جذب ہو کر سارے برعظیم میں پھیل گئی۔ گجرات میں گجری کہلائی دکن میں اسے دکنی کے نام سے پکارا گیا۔ کسی نے اسے ہندی یا ہندوی کہا۔ کسی نے اسے لاہوری یا دہلوی کے نام سے موسوم کیا مختلف زبانوں کے علاقوں کا اس زبان پر دعویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے سب سے فیض اٹھا کر اپنے وجود کو انفرادیت بخشی ہے۔ اس لئے یہ زبان برعظیم کی سب ”زبانوں کی زبان ہے۔“ ۳۶

وحیدالدین سلیم اُردو کو فارسی کی ہندی میں آمیزش کہتا ہے ۳۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک اردو زبان مسلمانوں کے زیر اثر پروان چڑھی وہ بھی اسے برعظیم پاک وہند کی تمام زبانوں کی زبان (لسان الاسنہ) قرار دیتے ہیں ۳۸۔ اسی بات کو ہم نے لسان الارض کا نام دیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ اور آب حیات سے بھی اس کی تائید معلوم ہوتی ہے۔ اس دور میں زبان اردو یا زبانِ اردوئے معلّیٰ کہا گیا اور ”اردو“ زبان کا نام بقول میر امن شاہ جہاں کے عہد میں رائج ہوا۔ اُردو کو کبھی ہندی، کبھی ہندوی اور کبھی ہندوستانی کہا گیا۔ خانِ آرزو اسے ہندی اہل اردوئے ہند کہتے ہیں۔

اُردو کا خمیر دنیا بھر کی زبانوں سے مل کر بنا ہے۔ اسی بناء پر ہم اردو کو بین اللسانی زبان یا لسان الارض قرار دیتے ہیں۔ بقول سر عبدالقادر اُردو ہماری اسپرانتوا ہے جس کی تائید اُردو کے تکنیکی جائزے سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے اُردو لسان الارض ہے۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ (Gilchrist) اپنی تصنیف ”ہندوستانی لسانیات“ (Hindostani Philology) میں رقمطراز ہیں کہ:

> ہندوستانی (اُردو) زبان نے امیر تیمور کے حملے (۹۹۔۱۳۹۸ء) کے دوران موجودہ

> صورت اختیار کی۔ مولوی محمد حسین آزاد اور سید احسن مارہروی کا خیال ہے کہ اُردو زبان برج بھاشا اور فارسی کی ملاوٹ سے ظہور میں آئی جسے ہم زیادہ سے زیادہ قطب الدین ایبک (۱۱۹۲ تا ۱۲۱۰ء) کے دور سے شمار کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور سید سجاد ظہیر ''ہندوی'' اور فارسی کی آمیزش کو محمود غزنوی (۹۹۸ تا ۱۰۳۳ء) کے زمانے سے منسوب کرتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کی رائے ہے کہ اُردو کی ابتدا محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے (۷۱۲ء) کے وقت سے شروع ہو گئی تھی۔ مغربی محققین نے اس پہلو میں کافی محتاط روش اختیار کی ہے۔ سر جارج گریرسن (G. A. Grierson) اور سر چارلس لائل (Sir Charles Layall) نے صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے جب مقامی زبانوں میں فارسی الفاظ کی آمیزش شروع ہوئی تو اس کے نتیجے میں ایک نئی زبان نے جنم لیا جو آگے چل کر اُردو کہلائی۔''[۳۹]

اُردو کو ترکی، سنسکرت، بھاشا، پرتگیزی، فارسی، عربی، انگریزی غرض کہ تمام گزشتہ موجودہ اور انڈو ایرین اور سامی زبانوں کا مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ اس دعویٰ کی ایک بولتی ہوئی دلیل یہ ہے کہ دنیا کی کوئی زبان خواہ مغرب میں بولی جاتی ہو یا مشرق میں، شمال میں جاری ہو یا جنوب میں، ایسی نہیں ملے گی جو اپنی مخالف زبانوں کے تمام لہجوں پر پوری طرح قادر ہو سکتی ہے۔ عجم (ایران) ٹ، ڑ، ڈ، ص، ض، ط، ظ اور مخلوط ہائے ہوز (ھ) کے بولنے میں گونگا ہے۔ عرب، پ، چ، ژ، گ پر زبان نہیں ہلا سکتا۔ انگلستان بھی، غ، ڑ نہیں بول سکتا۔ اس طرح ہندوستان میں اُردو کے سوا تمام پراکرتیں اپنا شین (ش) قاف (ق) درست نہیں رکھتیں۔ یہ بات اُردو ہی کے لئے مخصوص ہے کہ اجنبی سے اجنبی لہجے کی نقل کا اصل اتار لیتی ہے۔ اس حوالے سے رام بابو سکسینہ کی تصنیف ''تاریخ ادبِ اُردو'' کا یہ اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

> ''عام طور پر لوگ اُردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کی ابتداء مسلمان حملہ آوروں کی فوج میں اور مسلمان سلاطین ہند کی دارالسلطنتوں میں پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے فارسی نژاد ہونے کی غلطی عام لوگوں کو تو اس وجہ سے بھی محسوس ہوتی ہے کہ اس میں فارسی لفظ بکثرت ہیں اور اس کی شاعری کی

> بحریں اور اس کا رسم الخط بھی مثل فارسی کے لئے۔ اس غلطی کی بناء پر عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ بمقابلہ ہندی کے جو ہندوؤں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے اور اسی غلط فہمی سے ایک عرصۂ دراز سے سخت مقابلہ اور مباحثہ درمیان معاونین اُردو اور طرفداران ہندی کے ان دونوں زبانوں کی عمدگی اور خوبی اور نیز ان کی استعداد قبولیت عامہ کی نسبت چلا آتا ہے اور اس بحث میں لوگ ایک معمولی بات یعنی زبان اُردو کی اصل کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان اُردو اس ہندی بھاشا کی ایک شاخ ہے۔ جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلا واسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے۔ زبان اُردو کی اصل اور ماں سمجھی جاسکتی ہے۔ گو کہ ''اُردو'' کا نام اس زبان کو ایک عرصۂ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اُردو کی صرف و نحو، محاورات اور کثرت ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کی ابتداء ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام ہوگئی۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی جائے ورود اور ان کا دارالسلطنت بنا ہوا تھا۔''[۴۰]

اسی بیان کو کسی قدر اضافے مگر مختلف طریق سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بیان کرتے ہیں:

> ''ماہرین لسانیات کا اس پر اتفاق ہے کہ برصغیر پاک وہند میں سنسکرت کے بعد جو دور عوامی بولیوں یعنی پراکرتوں کا تھا ان میں عربی، فارسی، ترکی اور بعد میں مغربی زبانوں پر پرتگالی، فرانسیسی اور سب سے آخر میں انگریزی کے اثر اور عمل دخل سے جو زبان کا روپ پیدا ہوا وہ مختلف زمانوں میں اور مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا اور اُردو اس کا آخری اور نکھرا روپ اور نام ہے۔''[۴۱]

اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ بیان بھی اہم ہے جو انہوں نے ''مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راؤ پدم راؤ'' کے مقدمہ میں تحریر کیا:

> ''اُردو زبان اپنے ارتقاء کے دوران، اسلوب، لہجہ اور ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے دو

> منزلوں سے گزری ہے۔ اس کی پہلی منزل خالص ہندی روایت ہے۔ اس دور میں اور یہ دور مسلمانوں کی آمد اور ان کے تہذیبی اثرات کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے اظہار کے لئے پراکرت و سنسکرت کے علاوہ شورسینی اپ بھرنش کی بولیوں سے فیض حاصل کیا اور عربی و فارسی کے الفاظ خال خال استعمال کئے اس دور کی زبان فکر اور تصوف پر ہندی اسطور کا رنگ گہرا ہے۔ امیر خسرو کا کلام ہو۔ بابا فرید یا شاہ باجن کا وہاں ہمیں یہی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اہل علم و ادب جو اُردو ادب و شاعری کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اسے صرف فارسی، عربی ادب اور اسلامی اثرات کو اپنایا اور ہندی روایت و فکر کو نظر انداز کیا۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ اُردو شاعری کی پہلی روایت خالص ہندی اصناف اور اوزان پر قائم ہوئی اور ہندوی تصوف کے اسی رنگ کو قبول کیا جو برصغیر میں ناتھ پنتھیوں، بھگتی کال اور نرگن واد کی شکل میں رائج تھا۔ اس دور کی شاعری کی اصناف وہی ہیں جو برصغیر میں بھجن، گیت اور دوہروں کی شکل میں زمانہ قدیم سے چلی آ رہی تھیں لیکن جب اس روایت کو استعمال میں آتے آتے تقریباً پانچ صدیاں گزر گئیں اور اس روایت میں نئی نسلوں کے نئے ذہنوں کی تخلیقی پیاس بجھانے کی صلاحیت باقی نہیں رہی اور اس روایت سے تخلیقی سطح پر جو کچھ لیا جا سکتا تھا لیا جا چکا تو نئے ذہن نے نئے راستوں کی تلاش شروع کی۔''[۴۲]

اگر ہم ڈاکٹر محمد باقر کی زبان میں کہیں تو لبِ لباب یہ ہے ''اُردو'' زبان سات دریاؤں کی اس سر زمین کی پیداوار تھی جس پر آریاؤں نے شروع شروع میں قبضہ کیا تھا یعنی یہ آریاؤں کی زبان آریائی سے بھی قدیم تر ہے اور اس کی موجودہ شکلیں اُردو، پنجابی، ملتانی، بہاولپوری اور خیر پوری وغیرہ ہیں۔ پنجاب کا اپنا نام فارسی کے دو کلمات سے مرکب ہے اور یہ نام کسی فارسی دان اس وقت رکھا تھا جب وہ یہاں پہنچا۔

''پنجاب'' کا لفظ ہماری یعنی ہندو پاک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جہانگیر کے عہد (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) میں استعمال ہوتا ہے۔ غالباً وہ پہلا شخص ہے جو اپنی توزک میں اس لفظ کا استعمال کرتا ہے۔ اکبر کے عہد میں

(۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) یہ لفظ استعمال ہوتا نظر آتا۔ جس زبان کو ہم اس وقت پنجابی کہہ رہے ہیں اس کا نام بھی کچھ اور ہوگا کیونکہ جہانگیر کے زمانے سے بیشتر اس علاقے کا نام ہی کچھ اور تھا۔

مولانا شیرانی مرحوم نے موجودہ اُردو کا مقابلہ موجودہ پنجابی سے کر کے یہ نتیجہ نکالنا چاہا تھا کہ اُردو نے پنجاب میں جنم لیا۔ اُردو پنجابی کی بیٹی ہے۔ تاہم درج بالا صورتِ حال میں یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ مشابہت ماں اور بیٹی ہی میں نہیں بلکہ دو ماں جائی بہنوں میں بھی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے زبان کے قدیم و جدید صرفی نحوی اور صوتی سرمایہ کا پہلے اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے۔ اُردو زبان کا لسانی تجزیہ کر کے اس کا تاریخی ارتقاء دکھایا گیا ہے اور قدیم زمانے سے لے کر آج تک کی عہد بہ عہد تبدیلیاں پیش کی گئی ہیں۔ اُردو کا صحیح مقام، مولد اور منشاء متعین کرنے کے لئے صرف اتنا کافی نہ تھا کہ اس کی موجودہ شکل و صورت کا مقابلہ اس کی ہمسر بولیوں کے آج کے رنگ روپ سے کر دیا جائے اور بس۔ لسانیات کی اصطلاح میں اسے ''تاریخی گرامر'' کہتے ہیں۔ جب تک اُردو کی تاریخی گرامر واضح نہ ہو، جب تک اُردو کا مکمل لسانی تجزیہ کر کے اس کا عہد بہ عہد ارتقاء نہ دکھایا جائے، دوسری ہمسر زبانوں سے اس کا رشتہ ٹھیک ٹھیک دریافت نہیں ہو سکتا۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک ادبی گلدستہ ''ادب کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' مرتب کیا جو ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اُردو کراچی کی طرف سے شائع ہوا جس کے مطابق سلاطین دہلی کے عہد میں سرکاری اور تدریسی زبان فارسی تھی۔ اس لیے بڑی حد تک تصنیف و تالیف کا کام فارسی میں ہوا۔ عہد سلاطین دہلی میں اُردو کی نشوونما میں امیر خسرو کا خاصا ہاتھ رہا ہے۔ ان کے دوہوں کے علاوہ ان کی مثنویوں اور دوسرے شعری و نثری نوشتوں میں بھی اُردو کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری بھی اس کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''یہ حقیقت ہے کہ اُردو کی نشوونما میں صوفیاؔ و علماؔ کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ جب عربی اور فارسی، علمی و تہذیبی اور سرکاری و درباری زبانیں تھیں۔ اس وقت صوفیا نے برصغیر کی عام فہم زبان ہندی کو اپنایا اور اس کے ذریعے عوام سے رابطہ رکھا۔ میٹھے بولوں سے ان کے دلوں کو لبھایا اور روح کو تڑپایا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے دل بدل دیے، 'رام' سے رحیم کہلوایا اور لوگ ''دھرم'' سے دین کے دائرے میں

داخل ہوئے۔''۴۳؎

حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے اثرات سے برج بھاشا میں عربی، فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا۔ جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد اُردو زبان کی صورت اختیار کرلی۔''۴۴؎

حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو سے لے کر شاہ باجن اور نظامی تک اور نظامی سے لے کر میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم بلکہ ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو تک ہندوی روایت ہی کا دور دورہ رہتا ہے۔ نویں صدی ہجری میں فارسی اثرات بہت دبے دبے داخل ہونا شروع ہوتے ہیں اور فارسی بحور و اصناف بھی خال خال استعمال میں آنا شروع ہوجاتی ہیں لیکن اسلوب، لہجہ اور ذخیرہ الفاظ پر اب بھی ہندوی چھاپ گہری بلکہ غالب رہتی ہے۔

دراصل اُردو کا سنگ بنیاد مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے رکھا جاچکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت حاصل نہیں کی۔ جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو تخت نہ بنالیا اُردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہند آریائی دور میں ملک کے اس حصہ میں بولی جاتی تھی۔ جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اُردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی مگر اس سے تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ وجمن میں بولی جاتی تھی کیونکہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ اس کی اس وقت کے اختلافات ظاہر کرنے والی بہت کم خصوصیتوں کا اس وقت تک پتہ چلا ہے۔ یہ واقعہ دراصل بارہویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے کہ موجودہ زبانوں نے ان اختلافات کی پرورش شروع کی جو آج انہیں ایک دوسرے سے جدا ظاہر کرتے ہیں۔

انشاء اللہ خان انشاء سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی تک ان تمام محققین اور ماہرین لسانیات و تاریخ ادبیات کی تحقیقات اور بیانات کی تفصیل میں جانا تو ممکن نہیں لیکن ان سب سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ اُردو میں اس دھرتی کی قدیم و جدید زبانوں کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اس نے قدیم دراوڑی زبانوں میں جڑیں پکڑی ہیں۔ تو ہند آریائی زبانوں میں پروان چڑھی ہے۔ سامی اور تورانی زبانوں نے

اسے برگ و بار عطا کئے ہیں تو ہند یورپی زبانوں کی فضاء سے بھی اس نے رابطہ جوڑا ہے۔ اُردو میں جہاں قدیم سنسکرت، پہلوی اور فارسی کا ذخیرہ الفاظ ہے وہیں جدید ہندی، فارسی، عربی، ترکی زبانوں کا آمیزہ بھی ہے۔ اس میں پراکرتوں مثلاً پالی، شورسینی، برج بھاشا، اپ بھرنش سے لے کر دکھنی زبانوں تلیگو، ملیارم، تامل، کرناٹکی، کنڑی نیز بنگلہ، آسامی تک اور سندھی، پنجابی لنڈا، جٹکی، پشتو، ملتانی، بلوچی، براہوی تک کے الفاظ موجود ہیں۔ اس نے یورپی زبانوں مثلاً یونانی، پرتگالی، ہسپانوی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریزی سے بھی کسبِ فیض کیا ہے۔

اُردو لسانیات اور زبان یا لفظ اُردو کے آغاز و ارتقاء میں حتمی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ تحقیقات جاری ہیں اور جاری و ساری رہیں گی۔ کوئی مفروضہ قائم کرنا مشکل ہے اور اس زبان کی لسانی تشکیل میں بہت سی زبانوں نے حصہ لیا ہے۔ اسی لئے یہ کہنا بجا ہے کہ اُردو کا خمیر بہت سی زبانوں سے مل کر اٹھا ہے جس کی بناء پر ہم اُردو کو بین اللسانی زبان یا لسان الارض قرار دیتے ہیں۔

حواشی

۱۔ شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو''، لاہور: کتاب نما، ۱۹۷۲ء، ص ۵۳

۲۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ''اردو کی زبان''، کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۳

۳۔ عطش درانی، ڈاکٹر، ''اردو جدید تقاضے''، نئی جہتیں، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۹

۴۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ''اردو کی کہانی''، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۵ء، ص ۱

۵۔ فرید کوٹی، عین الحق، ''اردو زبان کی قدیم تاریخ''، لاہور: اورینٹ ریسرچ سنٹر، مارچ ۱۹۷۹ء، ص ۳۶

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''شعر اردو کا سفر''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء، ص ۷

۷۔ سلیمان ندوی، سید، ''نقوشِ سلیمانی''، مشمولہ: ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند''، چھٹی جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۸ء، ص ۶۴

۸۔ شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو''، ص ۵۳

۹۔ چیٹر جی، ڈاکٹر سنیتی کمار، ''ہند آریائی اور ہندی''، مترجم: ''عتیق احمد صدیقی، دہلی: لبرٹی آرٹ پریس، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷

۱۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادبِ اردو''، جلد اول، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء، ص ۵۹۶

۱۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، ''پاکستانی قومیت کی تشکیلِ نو''، لاہور: مطبع ندارد، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۴

۱۲۔ آزاد، محمد حسین، ''آبِ حیات''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۴

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، بحوالہ: ''اردو زبان کی قدیم تاریخ''، مصنفہ: عین الحق فرید کوٹی، لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع چہارم ۱۹۹۶ء، ص (افتتاحیہ)

۱۴۔ سلیم پانی پتی، وحید الدین، مولانا، ''افاداتِ سلیم''، لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، س۔ن، ص ۳

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۷۔ احتشام حسین، سید، ’’اردو لسانیات کا مختصر خاکہ‘‘، مرتبہ: آغا سہیل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، س۔ن، ص

۱۸۔ خلیل صدیقی، ’’زبان کا ارتقا‘‘، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷

۱۹۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، ’’شعری لسانیات‘‘، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء، ص ۸

۲۰۔ نوری محمد قاسم، ’’ہندوستانی زبان‘‘، لاہور: دردا کادمی، ۱۹۶۹ء، ص ۴

۲۱۔ مہر، ڈاکٹر عبدالحق، ’’پاکستانی قومیت کی تشکیلِ نو‘‘، لاہور: مطبع ندارد، ص ۱۲۴

۲۲۔ صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، مترجم: ’’ہندوستانی گرامر‘‘، مصنفہ: بنجمن شلزے، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۱

۲۳۔ وارث سرہندی، ’’زبان و بیان‘‘، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء، ص ۹۶

۲۴۔ ممتاز حسن، پروفیسر، ’’ادب اور شعور‘‘، کراچی: ادارہ نقدِ ادب، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۵۔۱۹۶

۲۵۔ ’’دی امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا‘‘، جلد اول، مشمولہ: ’’تاریخ ادب اردو‘‘، جلد اول، مصنفہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع چہارم جون ۱۹۹۵ء، ص ۴

۲۶۔ شیرانی، حافظ محمود، ’’مقالاتِ حافظ محمود شیرانی‘‘، جلد اول، مرتبہ: ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۲

۲۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ’’تاریخ ادب اردو‘‘، جلد اول، ص ۱

۲۸۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’اردو زبان کا ارتقا‘‘، ڈھاکا: ڈھاکا یونیورسٹی، ۱۹۵۶ء، ص

۲۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ’’اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ‘‘، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۶۷

۳۰۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر، ’’مقدمہ تاریخ زبان اردو‘‘، لاہور: ادارہ اردو مرکز، ۱۹۶۶ء، ص ۳۶

۳۱۔ عبدالقیوم، مرتبہ: ’’تاریخ ادب اردو‘‘، جلد اول، کراچی: ایجوکیشنل پبلشرز، ۱۹۶۱ء، ص ۲۴۹

۳۲۔ میر امن، ’’باغ و بہار‘‘، مرتبہ و مقدمہ: ممتاز حسین، کراچی: اردو سٹریٹ، ۱۹۵۸ء، ص ۱۳

۳۳۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر، ’’مقدمہ تاریخ زبان اردو‘‘، ص ۳۶

۳۴۔ آزاد محمد حسین، ’’آبِ حیات‘‘، مرتبہ: تبسم کاشمیری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء، ص ۴

۳۵۔ شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو''، ص ۱۷

۳۶۔ عطش درانی، ڈاکٹر، ''اردو اصطلاحات سازی''، اسلام آباد: انجمن شرقیہ علمیہ، طبع اول مئی ۱۹۹۳ء، ص ۲۷

۳۷۔ سلیم پانی پتی، وحید الدین، مولانا، ''وضعِ اصطلاحات''، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۵ء، ص ۲۷

۳۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اول، ص ۱

۳۹۔ فرید کوٹی، عین الحق، ''اردو زبان کی قدیم تاریخ''، ص ۱۷

۴۰۔ سکسینہ، رام بابو، ''تاریخ ادب اردو''، مترجم: مرزا محمد عسکری، لاہور: نیشنل بک ہاؤس، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۳۵

۴۱۔ صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، ''اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول ۱۹۸۱ء، ص ۳

۴۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، مرتبہ: ''مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راؤ پدم راؤ''، کراچی: انجمن ترقی اردو، اشاعت اول ۱۹۷۳ء، ص ۳۷

۴۳۔ قادری، ڈاکٹر محمد ایوب، ''اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ''، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، طبع اول ۱۹۸۸ء، ص ۱۹

۴۴۔ شمس اللہ قادری، حکیم، ''اردوئے قدیم''، لکھنؤ: مطبع نول کشور، ۱۹۳۰ء، ص ۱۴

باب سوم

اُردو میں لسانی مباحث

(ابتدا تا قیامِ پاکستان)

حصہ اوّل:

برصغیر کی زبانوں کا آغاز، ارتقا اور بناوٹ

دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی صحیح تعداد کا پتا لگانا بہت مشکل ہے، تاہم ماہرین لسانیات کے ایک محتاط اندازے کے مطابق پوری دنیا میں پانچ ہزار تا سات ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض زبانیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور بعض زبانیں آپس میں ملتی جلتی ہیں یعنی باہم مماثلت رکھتی ہیں۔ جو زبانیں باہم مماثلت رکھتی ہیں (یعنی جن زبانوں میں لسانیاتی بنیادوں پر یکسانیت پائی جاتی ہے) انھیں ”ہم رشتہ زبانیں“ (Related Languages) کہتے ہیں۔ ہم رشتہ زبانوں کو ایک گروہ یا زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ مماثل یا ہم رشتہ زبانوں کے اسی گروہ یا زمرے کو ”لسانی خاندان“ (Language Family) کہتے ہیں۔ اس حوالے سے سنسکرت، یونانی، لاطینی، کیلٹک اور جرمانک یہ تمام زبانیں اپنی ساخت کے اعتبار سے باہم بے حد یکسانیت رکھتی ہیں۔ ان کے اندر پائی جانے والی مماثلتیں اتنی گہری ہیں کہ یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ان کا ارتقا کسی ایک مشترک ماخذ سے ہوا ہے جو اَب ناپید ہے۔ اس طرح کے لسانی مشاہدات پہلے بھی کیے جاتے رہے تھے، لیکن اِس نظریے نے عالموں کے ذہنوں کو نئے سرے سے مہمیز کیا اور ان میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا، نیز یورپ میں انگریزی اور جرمن زبانوں کی قدیم شکلوں کے یونانی، لاطینی، سنسکرت اور دوسری زبانوں سے منظم اور باقاعدہ طور پر مقابلے کا آغاز ہوا۔ انیسویں صدی کے دوران اس تقابلی مطالعے کی بنیاد پر ان زبانوں کی گروہ بندی ہند یورپی خاندانِ السنہ میں کی گئی۔

جب ہم زبانوں کے ان خاندانوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ بات علم میں آتی ہے کہ ہند یورپی خاندانِ السنہ دنیا کا سب سے بڑا اور اہم لسانی خاندان ہے۔ اس میں شامل زبانیں روس اور یورپ کے تقریباً سبھی ممالک میں بولے جانے کے علاوہ ہندوستان، پاکستان، ایران، افغانستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور نیپال میں بھی بولی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے ہند یورپی خاندانِ السنہ کی حسبِ ذیل گیارہ شاخیں بتائی جاتی ہیں:

۱۔	کیلٹک	(Celtic)
۲۔	جرمانک	(Germanic)
۳۔	لاطینی	(Latin)
۴۔	یونانی	(Greek)
۵۔	البانیائی	(Albanian)
۶۔	بالٹک	(Baltic)
۷۔	سلاوی	(Slavic)
۸۔	اناطولیائی	(Anatolian)
۹۔	آرمینیائی	(Arminian)
۱۰۔	ہند ایرانی	(Indo-Iranian)
	ایرانی	(Iranian)
	انڈک/ہند آریائی	(Indic/ Indo-Aryan)
۱۱۔	تخاری	(Tocharian)

زبانوں کے ان خاندانوں میں سے انڈک یا ہند آریائی، ہند یورپی خاندانِ السنہ کی ایک نہایت اہم شاخ ہے جس کا ارتقا ہندوستان میں ہوا۔ ہند آریائی کے بولنے والے آریا قوم کے لوگ ہیں جن کی تاریخ ساڑھے تین ہزار سال پرانی ہے۔ ''اُردو'' زبان کا تعلق بھی اسی ہند آریائی خاندان سے ہے۔

ہند آریائی کا قدیم دور ۱۵۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م، یعنی پورے ایک ہزار سال تک قائم رہتا ہے۔ یہ دور آریاؤں کی قدیم زبان سنسکرت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس دور میں علاقائی سطح پر سنسکرت کی شکلیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ سنسکرت زبان کے سب سے بڑے قواعد نویس پانِنی کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔

اگر ہم لسانیات کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیں تو بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ روایتی قواعد کی ترقی یافتہ شکل ہی لسانیات ہے جس کی ابتدا پہلی صدی کے اوائل میں ہو چکی تھی۔ روایتی قواعد سے مراد مختلف اندازِ فکر رکھنے والے لوگوں کے وہ خیالات ہیں جو اُن کی تحریروں میں مختلف طریق ہائے کار اور قواعدی اصولوں کی شکل میں

بکھرے ہوئے ہیں۔

زبان ہمیشہ سے فلسفہ، منطق، مذہب، علم بیان، فصاحت و بلاغت، تدریس زبان اور ادبی تنقید سے وابستہ رہی ہے۔ ان علوم کا شاید ہی کوئی ایسا مفکر ہو جس نے زبان اور اس کے قواعد پر اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔ زبان سے متعلق پرانے خیالات وسیع سیاق و سباق میں ملتے ہیں جبکہ انسان کی تہذیب اور روایات کی تاریخ شاہد ہے کہ انسان نے ہمیشہ زبان کی ابتداً کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ Cultural Anthropology کی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قدیم سے قدیم کلچر میں زبان کا تصور ابتدا سے ہی ملتا ہے جیسے آدمؑ، شیطان اور خدا کی گفتگو جس کا ذکر انجیل مقدس اور قرآن پاک دونوں میں آیا ہے۔ اسی طرح قدیم مصر کے عقائد کی رو سے تھوتھ (Thorth) نامی خدا بول چال اور تحریر کا بانی تھا۔ چنانچہ زبان کو محفوظ کرنے کے لیے قواعد یں لکھی گئیں جیسے ویدک سنسکرت کی قواعد جو پانِنی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی۔ سنسکرت زبان کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اپنی تصنیف ''اردو کی لسانی تشکیل'' میں ویدک اور کلاسیکی سنسکرت پر بحث کی ہے[1]۔

۱۔ ویدک سنسکرت: قدیم ہند آریائی دور میں ہندوستان میں شمال مغرب تا مشرق جس زبان کا ارتقاً اور فروغ عمل میں آیا اسے ''سنسکرت'' کہتے ہیں۔ سنسکرت کے سب سے قدیم نمونے ہمیں ویدوں کی زبان میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی لیے اس زبان کو ویدک سنسکرت کہا جاتا ہے۔ سب سے قدیم وید ''رگ وید'' ہے۔ جو ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اس دور میں تین اور وید تخلیق کیے گئے جن کے نام ہیں: سام وید، یجر وید اور اتھر وید۔ ان ویدوں کی زبانوں میں تھوڑا بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ''رگ وید'' کی تخلیق کا زمانہ ۱۲۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ ق م مانا گیا ہے۔ دوسرے ویدوں کو مذہبی تقدس حاصل تھا اس لیے انھیں حفظ کر لیا جاتا تھا اور نسل در نسل ان کی زبانی منتقلی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ''رگ وید'' میں ایک ہزار سے زیادہ حمدیہ نظمیں (Hymns) پائی جاتی ہیں۔ ویدک قواعد نویس میکڈانل کا خیال ہے کہ ''رگ وید'' ادبی زبان میں تخلیق کی گئی ہے جو بول چال کی زبان سے مختلف ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مصمتوں کی ہائیت اور معکوسیت جو زمانہ حال کی اُردو کی نمایاں صوتی خصوصیات ہیں، ویدک سنسکرت میں ارتقاً پذیر ہو چکی تھیں یعنی اُردو کی ہائیہ اور معکوسی آوازوں مثلاً

پھ بھ تھ دھ اورٹ ٹھ ڈ ڈھ وغیرہ کا وجود قدیم ہند آریائی دور سے پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اُردو کے سبھی دس مصوتے بھی یعنی اَ، آ، اِ، ای، اُ، اُو، اے، او، اَے، اَو بھی ویدک سنسکرت میں ارتقا پا چکے تھے۔

۲۔ کلاسیکی سنسکرت: ویدک سنسکرت کے بعد کلاسیکی سنسکرت کا ارتقا عمل میں آیا۔ سنسکرت زبان میں جب ادبی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ کلاسیکی سنسکرت کہلائی۔ دھیریندر ورما کلاسیکی سنسکرت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''یہ مصنوعی یا ادبی زبان تھی''۔ ''مہا بھارت'' اور ''رامائن'' جیسی تصانیف جنھیں بلا تامل عالمی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے، کلاسیکی سنسکرت میں ہی تخلیق کی گئیں۔ کلاسیکی سنسکرت کو عام اصطلاح میں محض ''سنسکرت'' کہتے ہیں۔ کبھی کبھی ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت دونوں کو ملا کر ''سنسکرت'' کہا جاتا ہے۔ ویدک سنسکرت کو کبھی کبھی ویدک بھاشا (= زبان) بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ صوتی اور قواعدی اعتبار سے ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت میں اختلافات پائے جاتے تھے۔ تاریخی اعتبار سے اُردو کا لسانیاتی رشتہ سنسکرت سے استوار ہے۔ اُردو بالخصوص قدیم اُردو میں سنسکرت کے بے شمار الفاظ پائے جاتے ہیں جنھیں ''تتسم'' کہتے ہیں۔ اُردو کے صوتی نظام میں بھی سنسکرت نژاد آوازیں (جنھیں ہندی الاصل آوازیں بھی کہتے ہیں) عربی و فارسی آوازوں سے بہ لحاظِ تعداد زیادہ ہیں کیوں کہ بنیادی طور پر اُردو ایک ہند آریائی زبان ہے۔

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> ''آریا لوگ داخلۂ ہند مشرق کی جانب بڑھتے گئے، سنسکرت زبان کی مرکزیت ختم ہوتی گئی اور اس کا ایک معیار قائم رہنا مشکل ہو گیا، نیز مقامی بولیوں کے ساتھ باہم میل جول کی وجہ سے اس کی تین علاقائی شکلیں قائم ہو گئیں جنھیں ادیچیہ، پراچیہ اور مدھیہ دیشہ کہتے ہیں۔ ان بولیوں کا تعلق عوام الناس سے تھا، کیوں کہ سنسکرت اپنے اصلی روپ میں ادبی اور مرصع بن چکی تھی۔''[۲]

۵۰۰ ق م تک پہنچتے پہنچتے ''سنسکرت'' دم توڑنے لگی تھی اور اس کی جگہ ایک نئی زبان ''پراکرت'' جو سنسکرت کی ہی

بدلی ہوئی شکل تھی معرضِ وجود میں آ رہی تھی۔ اس عہد کے ایک حساس عالمِ زبان پانِنی نے لسانی تبدیلی کے اس عمل کو محسوس کر لیا۔ اسی کو روکنے کے لیے اس نے ''اشٹا دھیائی'' تخلیق کی اور سنسکرت زبان کو قواعد کے اصولوں میں جکڑ بند کر دیا۔ پانِنی سنسکرت زبان کا جید عالم اور ماہرِ صوتیات نیز قواعد داں گزرا ہے جس کی شہرہ آفاق تصنیف اشٹا دھیائی، اس زبان کی ایک نہایت جامع، مستند اور مکمل قواعد ہے۔ یہ سنسکرت زبان کی انتہائی حیرت انگیز لسانیاتی توضیح بھی ہے جس سے قدیم ہندوستان میں توضیحی لسانیات کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے اور جس کا لوہا مغربی دنیا نے بھی مانا ہے۔ ممتاز امریکی ماہرِ لسانیات لینارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ کتاب ''ذہنِ انسانی کا ایک عظیم کارنامہ'' ہے[۳]۔

سنسکرت میں قواعد کا زمانہ لگ بھگ ۵۰۰ ق م کا ہے۔ آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل پانِنی نے ''اشٹا دھیائی'' میں سنسکرت کے لسانیاتی مسائل پر گہرے غور و فکر سے کام لیا ہے جس کی کوئی اور مثال مشرق و مغرب میں نہیں ملتی۔ ''اشٹا دھیائی'' سنسکرت زبان کی منظوم قواعد ہے جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے (اسی لیے اس کا یہ نام پڑا)۔ اس میں تقریباً چار ہزار سوتر (شعری سطور) پائے جاتے ہیں۔ ان سوتروں کی مدد سے پانِنی نے سنسکرت زبان کی نہایت جامع اور مکمل توضیح بیان کی ہے اور اس کی ساخت کا انتہائی باریک بینی سے تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پانِنی کے عہد تک اس زبان کا نام سنسکرت نہیں پڑا تھا۔ پانِنی نے اپنی زبان کو ''بھاشا'' کہا ہے۔ لفظِ سنسکرت جس کے معنی شستہ و شائستہ اور نفیس کے ہیں۔ اسمِ خاص کے طور پر زبان کے معنی میں بہت بعد میں استعمال ہوا۔

پراکرتوں کا آغاز و ارتقا:

ہند آریائی کے ارتقا کا دوسرا دور وسطی ہند آریائی کہلاتا ہے۔ یہ دور ۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ء سن عیسوی قائم رہتا ہے۔ اس دور میں پراکرتیں پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ سنسکرت کے زوال کے بعد ۵۰۰ ق م سے پراکرتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ''پراکرت'' درحقیقت ایک ایسی زبان تھی جو سنسکرت زبان میں تبدیلی کے نتیجے میں فطری طور پر ظہور پذیر ہوئی تھی۔ یہ ایک سہل اور سادہ زبان تھی۔ بہت مقبول ہو گئی۔ سنسکرت کو مذہبی تقدس بھی حاصل ہو گیا تھا اور یہ عام لوگوں سے زیادہ پنڈتوں اور پروہتوں کے تصرف میں آ چکی تھی۔ یہ سنسکرت کی ہی کوکھ

سے پیدا ہوئی تھی۔ لسانیات کا یہ عام اصول ہے کہ جب ایک زبان مرنے لگتی ہے تو اس کے بطن سے دوسری زبان پیدا ہو جاتی ہے جو اسی کی متغیر شکل ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی مردہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آتی ہے۔ زبانوں کے ارتقا اور فنا کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ پراکرت کا ماخذ و منبع بھی سنسکرت زبان ہے۔ جب سنسکرت زبان کے تلفظ، قواعد اور نحوی ڈھانچے میں کافی حد تک تبدیلیاں رونما ہو گئیں تو یہ زبان بالکل بدل گئی۔ سنسکرت کی یہی بدلی ہوئی شکل ''پراکرت'' کہلائی۔ سنسکرت زبان میں تبدیلی کا یہ عمل لسانیات کی مختلف سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے مثلاً تلفظ یا صوتیات کی سطح پر اس زبان میں سب سے بڑی تبدیلی یہ واقع ہوئی کہ اس کے مصمتی خوشے ٹوٹ کر مشدد بن گئے۔ اس تبدیلی کو صوتی ادغام کہتے ہیں۔ پراکرت میں صوتی ادغام کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں جن میں مصمتی خوشے کا ایک مصمتہ ٹوٹ کر دوسرے مصمتے کے ساتھ مدغم ہو جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں[۹]:

سنسکرت	پراکرت	اُردو
پُتر	پُتّ	پوت
ہست	ہتّھ	ہاتھ
شُشک	سُکّھ	سوکھ
دُگدھ	دُدّھ	دودھ
مِتر	مِتّ	میت
ادی	اَجّ	آج
اگن	اَگّی	آگ
پتر	پَتّ	پات = پتا

اس طرح کی بے شمار صوتی تبدیلیاں نیز فعلی قواعدوں اور بعض نحوی تبدیلیاں سنسکرت زبان میں رونما ہوئیں جن کے نتیجے میں پراکرتوں کا ظہورِ عمل میں آیا۔ ان لسانی تبدیلیوں کے پس منظر میں اُردو زبان کے ارتقا کی بھی جھلک دیکھی

جاسکتی ہے کیوں کہ پراکرت کی مشدد شکلیں اُردو میں سہل کر دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں خفیف مصوتہ ماقبل، طویل مصوتے میں تبدیل ہو جاتا ہے، مثلاً ہست > ہتھ > ہاتھ، دُگدھ > دُدھ > دودھ، سپت > سَت > سات، پُتر > پُت، مِتر > مِت > میت (=دوست) وغیرہ

پہلی پراکرت کو ابتدائی پراکرت بھی کہتے ہیں۔ اس کے زمانے کا تعین ۵۰۰ق م تا ۱ق م کیا گیا ہے۔

پہلی پراکرت میں پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبانوں کا شمار ہوتا ہے۔ یہ دونوں پراکرت کی اولین شکلیں ہیں۔

شورسینی پراکرت شورسین کے علاقے کی زبان تھی جس کا مرکز متھرا (اتر پردیش) تھا۔ کھڑی بولی ان میں سے ایک ہے اُردو کی بنیاد اور اصل و اساس ہے۔ ماگدھی پراکرت بنیادی طور پر مگدھ کے علاقے کی زبان تھی جو اب جنوبی بہار کا حصہ ہے۔ اردھ ماگدھی پراکرت کا علاقہ شورسینی پراکرت اور ماگدھی پراکرت کے درمیان کا علاقہ تھا۔ اردھ ماگدھی پراکرت نے جین مذہب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جین مذہب کے ماننے والوں کی ابتدائی مذہبی اور ادبی تصانیف اسی پراکرت میں پائی جاتی ہیں۔ مہاویر جین نے جس زبان میں جین مذہب کی تعلیمات دیں وہ اردھ ماگدھی کی قدیم شکل تھی۔ یہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب زبان تھی۔ اردھ ماگدھی میں /ر/ اور /ل/ دونوں آوازیں پائی جاتی تھیں لیکن سنسکرت کا ش، س کی آواز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مہاراشٹری پراکرت مہاراشٹر کی زبان تھی اور تمام ادبی پراکرتوں میں یہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ادبی پراکرت سمجھی جاتی تھی۔ قواعد نویسوں نے اسے ''مثالی پراکرت'' کہا ہے۔ ان کی وجہ کا مرکز یہی پراکرت تھی۔ پنجاب اور کشمیر میں بولی جاتی تھی۔ اس میں ادبی تصانیف کا فقدان ہے۔ یہ خالص ہند آریائی زبان نہیں ہے۔ اپ بھرنش کے لغوی معنی ہیں بگڑی ہوئی یا بھرشٹ (Corrupt) زبان۔ اپ بھرنش کی اصطلاح دوسری صدی قبل مسیح کے ممتاز قواعد داں اور ''مہابھاشیہ'' کے مصنف پاتنجلی کے عہد سے ملتی ہے لیکن اس نے یہ اصطلاح زبان کے معنی میں استعمال کی تھی۔ اپ بھرنش کی باقاعدہ قواعد گیارہویں صدی عیسوی کے قواعد نویس ہیم چندر نے لکھی جو ''ہیم چندر شبدانوشاسن'' کے نام سے مشہور ہے۔ پراکرت کی بگڑی ہوئی شکل اپ بھرنش کہلائی۔ بعض ماہرین لسانیات اپ بھرنش کو پراکرت کی ہی ایک شکل تسلیم کرتے ہیں اور اسے ''تیسری پراکرت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اپ بھرنش زبانوں کا آغاز و ارتقا (۵۰۰ءتا ۱۰۰۰ء):

اپ بھرنش پراکرت سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے جہاں جہاں پراکرتیں بولی جاتی تھیں انھیں علاقوں میں اپ بھرنشیں معرضِ وجود میں آ گئیں۔ مشہور قواعد نویس مارکنڈے نے اپ بھرنش کی تین اقسام بیان کی ہیں۔ جوناگر، اُپ ناگر اور براچڈ ہیں۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ بیان کرتے ہیں:

> ”شورسینی اپ بھرنش شورسینی پراکرت سے نکلی ہے۔ اس کا علاقہ وہی ہے جو شورسینی پراکرت کا علاقہ تھا اور جس کا مرکز شورسین دیس (متھرا) تھا۔ ۱۰۰۰ سن عیسوی کے بعد اس کے بطن سے کھڑی بولی، راجستھانی، پنجابی (مشرقی) اور گجراتی زبانیں پیدا ہوئیں۔ کھڑی بولی کا تعلق مغربی ہندی (پانچ بولیوں کے مجموعے کا نام) سے ہے۔ اسی سے اُردو اور ہندی زبانیں ارتقاء پاتی ہیں۔ مغربی ہندی کی دوسری بولیوں، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کا ارتقاء بھی شورسینی اپ بھرنش سے ہوا ہے۔“[۵]

ماگدھی اپ بھرنش کا ارتقاء ماگدھی پراکرت سے ہوا۔ اس کا چلن مشرق کے ایک وسیع خطے میں تھا۔ جس میں بنگال، آسام، اڑیسہ اور بہار کے علاقے شامل ہیں۔ ان علاقوں کی جدید زبانیں یعنی بنگالی، آسامی، اُڑیا اور بہار کی تقریباً تمام بولیاں ماگدھی اپ بھرنش سے ہی نکلی ہیں۔ مغربی ماگدھی اپ بھرنش کی بولیوں کو جارج گریرسن نے ”بہاری“ کے نام سے یاد کیا ہے جس میں تین بولیاں: میتھلی، مگہی اور بھوجپوری شامل ہیں۔ اردھ ماگدھی اپ بھرنش، شورسینی اپ بھرنش اور ماگدھی اپ بھرنش کے درمیان کے علاقے کی زبان تھی۔ اس سے مشرقی ہندی کی بولیاں معرضِ وجود میں آئیں۔ مہاراشٹری اپ بھرنش کا ارتقاء مہاراشٹری پراکرت سے ہوا یہ مہاراشٹر کے علاقے کی زبان تھی۔ اس کے بطن سے موجودہ مراٹھی زبان کا ارتقاء ہوا۔

شمال مغربی اپ بھرنش دو زمروں میں منقسم ہے۔ ”براچڈ اپ بھرنش“: اس کا ارتقاء سندھ کے علاقے میں ہوا اور اس سے سندھی زبان پیدا ہوئی۔ ”کیکیئی اپ بھرنش“: اس سے مغربی پنجابی پیدا ہوئی جسے لہندا بھی کہتے ہیں۔ سندھی اور لہندا (مغربی پنجابی) میں گہرا لسانیاتی رشتہ پایا جاتا ہے[۶]۔

دھیریندر ورما نے پشاچی اپ بھرنش کا بھی ذکر کیا جو پشاچی پراکرت سے ارتقا پذیر ہوئی ہے۔ پشاچی اپ بھرنش سے ہی ۱۰۰۰ سنِ عیسوی کے بعد دردزبانیں مثلاً کشمیری وغیرہ پیدا ہوئیں۔

جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقاء:

۱۰۰۰ سنِ عیسوی تک پہنچتے پہنچتے اپ بھرنشوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کی جگہ پورے شمالی ہندوستان میں مغرب تا مشرق بہت سی بولیاں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقاء کی تاریخ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوتا ہے۔ ۱۱۹۳ء میں دہلی کو فتح کر کے وہاں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کر لی۔ سنیتی کمار چیٹر جی کا خیال ہے کہ اگر مسلمان ہندوستان میں نہ آئے ہوتے تو جدید ہند آریائی زبانوں کے ادبی آغاز و ارتقاء میں دو ایک صدی کی ضرور تاخیر ہو جاتی ہے۔

تمام جدید ہند آریائی زبانیں اور بولیاں کسی نہ کسی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی لیے ان کے نہ صرف علاقے متعین ہیں بلکہ بعض علاقائی لسانی خصوصیات بھی ان میں اب تک پائی جاتی ہیں۔ اُردو کا کھڑی بولی سے پیدا ہونا ایک ایسی لسانی حقیقت ہے جسے کسی بھی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم اُردو (قدیم دکنی اُردو) پر ہریانوی کے اثرات رہے ہیں۔ کھڑی بولی کی طرح ہریانوی نواحِ دہلی کی ایک بولی ہے۔

دکنی اُردو کے تحریری نمونوں کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی اعتبار سے بے حد اہمیت ہے، لیکن ان کی لسانی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ دکنی اُردو کا ادبی سرمایہ ہمارے لیے ایک ایسا ٹھوس لسانی مواد فراہم کرتا ہے جس سے زبان اُردو کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس میں ظہور پذیر ہونے والی لسانی خصوصیات کچھ تو شمالی ہندوستان کی بولیوں کی دین ہیں جن کے خمیر سے یہ زبان تیار ہوئی ہے اور کچھ مقامی لسانی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ دکنی اُردو کی بعض لسانی خصوصیات جن میں صوتی، صرفی، نحوی اور قواعدی خصوصیات شامل ہیں معیاری اُردو سے بہت مختلف ہیں اور ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

صوتی نقطۂ نظر سے اردو حروفِ تہجی کی آوازوں میں فرق کیسے ہوتا ہے؟ اسے یوں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

(الف): /ق/ کی /خ/ میں تبدیلی:

دکنی اُردو میں /ق/ کی آواز /خ/ کی آواز میں بدل دی جاتی ہے۔ اس صوتی تبدیلی کے قدیم دکنی

تصانیف میں تحریری ثبوت بھی ملتے ہیں مثلاً قطب مشتری (وجہی) میں ''اَقل'' (بجائے عقل) ملتا ہے۔

(ب) مصوتوں کی تخفیف و طوالت:

مصوتوں کی تخفیف و طوالت دکنی اُردو کی ایک اہم صوتی خصوصیت ہے۔ بعض الفاظ میں طویل مصوتوں کی جگہ مختصر مصوتے اور مختصر مصوتوں کی جگہ طویل مصوتے پائے جاتے ہیں۔ مصوتوں کی تخفیف کی مثالیں یہ ہیں: اَدمی (آدمی)، اَسمان (آسمان)، کَجل (کاجل)، پُھل (پھول)، بھک (بھوک)، بَدل (بادل) وغیرہ۔ ڈاکٹر سہیل بخاری ''اردو کی زبان'' میں لکھتے ہیں:

> ''اسی طرح مختصر مصوتوں کی جگہ طویل مصوتے پائے جاتے ہیں، مثلاً ہانسی (ہنسی)، جاگہ (جگہ)، پوتلی (پتلی)، بیجلی (بجلی) وغیرہ
>
> پراکرت میں مندرجہ ذیل آوازیں پائی جاتی تھیں
>
> اصوات علت:
>
> مختصر: ءَ ءِ ءُ ءَ ءٚ ءٔ
>
> طویل: ٰء ءٖ ءٗ ءے ءٓ ءٔ ءٓ
>
> اصوات صحیحہ:
>
> الپ پران: ب پ ت ٹ ج چ د ڈ ر ڑ ک گ ل م ن ݨ س
>
> مہاپران: بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ رھ ڑھ کھ گھ لھ مھ نھ سھ
>
> بے رنگ: ء
>
> صفیری: س
>
> اَنفی: نون غنہ یا انوسر ویا پالی نگہت
>
> ان سے موازنہ کرنے کے لیے ذیل میں ویدک و سنسکرت کی آوازیں بھی دی جاتی ہیں۔
>
> اصوات علت: مختصر: ءَ ءِ ءُ رِ لَ
>
> طویل: ٰء ءٖ ءٓ ءٖ ءٗ ءٔ رٓ لٓ

اصوات صحیحہ:

حلقی: ک کھ گ گھ حلقی ن

حنکی: چ چھ ج جھ حنکی ن

تحی: ٹ ٹھ ڈ ڈھ نٹ

دندانی: ت تھ د دھ ن

شفوی: پ پھ ب بھ م

نصف علت: ی ر ل و

صفیری: ش شٹ س ہ

خالص انفی: نون غنہ یا انوسرو

پراکرت کے طویل سر اس کے مختصر سروں سے ٹھیک دگنے ہوتے ہیں یعنی

ءِ + ءِ = ءٖ، ءُ + ءُ = ءٗ، ءٚ + ءٚ = ءٚٚ، ءٜ + ءٜ = أ ۔

اس کا ثبوت پنجابی زبان کے لہجے سے ملتا ہے جس میں ہر طویل سر کو دو ٹکڑے کر کے ادا کیا جاتا ہے اور اُردو دانوں کو ناواقفیت کے باعث ایک درمیانی ہمزہ کا گمان گزرتا ہے۔''[۵]

ویدک سنسکرت کی دیوناگری لپی میں پراکرت کی اصوات علت کے لیے دس حروف ہیں اور دس ہی ان کی علامات بھی مقرر ہیں جو اُردو لپی کی طرح حروف صحیحہ پر چپکا دی جاتی ہیں۔ اس طرح اس میں ءِ ءُ ءٚ ءٜ کے لیے نہ مخصوص حروف ہیں نہ علامات جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ویدک میں یہ چاروں مختصر سر نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ویدک وسنسکرت میں پہنچ کر پراکرت الفاظ کے مختصر اور طویل دونوں قسم کے سروں میں سخت گڑ بڑ ہو گئی ہے بلکہ ایرانی اثرات کے باعث جدید زبانوں میں بھی اب آ کر ان کی صورت یوں مسخ ہو گئی ہے کہ پہچانے نہیں جاتے۔

''اس ضمن میں چند مثالیں دیکھیں:

ویدک وسنسکرت	پراکرت	اُردو

ءَ وَ ر	ءُ ءُ ر	اَور
ک وَ ن	کُ ءُ ن	کَون
لَ وَ ٹ	لُ ءُ ن	لون (نمک)
نَ ی ن	نِ ءِ ن	نَین (آنکھ)
رَ ی ن	رِ ءِ ن	رَین (رات)
شَ وَ نٹ ڈ	سَ ءَ ں ڈ	سونڈ
سَ مِ ن	م ھِ ءِ ں	میں (اندر)
ک رِ ل	ک ھِ ل	کھیل
پ رَ ہ ر	پ ھَ رِ ءِ ر	پھریا (پھریا)

> یہ جو کہا جاتا ہے کہ سنسکرت کے اَو اور اَی پراکرت میں ءُ اور ءِ ہو جاتے ہیں اس تقابلی مطالعے سے بالکل غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہوا یہ ہے کہ سنسکرت میں پراکرت کے طویل سروں ءُ (ءُ + ءُ) اور ءِ (ءِ + ءِ) کو دو زبر یا ایک زبر سے ظاہر کیا ہے اور آخری زبر اور زیر کے لیے و 'ہ' ی کو خواہ مخواہ داخل کر دیا گیا ہے۔"[9]

حروف کے جتنے تبادل بیان کیے جاتے ہیں ان میں سے کچھ تو واقعی آوازوں سے متعلق ہیں لیکن بیشتر ایسے ہیں جو الفاظ کے مختلف مکتوبی رویوں سے پیدا ہو گئے ہیں[10]۔

پراکرت میں اسم کی صرف دو جنسیں مذکر و مؤنث' دو عدد واحد و جمع اور دو اسی حالتیں فاعلی و غیر فاعلی ہوتی تھیں۔ بے جان جنس صرف قدیم ایرانی کی خصوصیت تھی جہاں صرف قدیم ایرانی کی خصوصیت تھی جہاں سے ویدک و سنسکرت میں پہنچی اور پھر اس کی تقلید میں گرامر نویسوں نے اسے بھی پراکرت کے سر منڈھنے کی کوشش کی چنانچہ جدید زبانوں میں صرف مرہٹی اور گجراتی ہی دو ایسی زبانیں ہیں جن میں یہ جنس پائی جاتی ہے اور جو یقینی طور پر سنسکرت کے زیر اثر ان میں داخل ہوئی ہے۔ پراکرت میں مذکر فاعلی کا خاتمہ آیا اُو اور مونث فاعلی کا خاتمہ

اِی یا اِیا ہوتا تھا۔ پراکرت کے گرامر نویس پراکرت کی جنس کو عام طور پر بے ضابطہ کہتے ہیں جس سے ان کی مراد یہ ہے کہ کہیں تو یہ سنسکرت کی جنس سے مطابقت رکھتی ہے اور کہیں اس کے خلاف نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

> "سنسکرت کی مرکب حرکات اَے اور اَو پالی ہیں۔ اِے اور اُو ہو جاتی ہیں جو پراکرت میں اَءِ، اَءُ کے روپ میں ملتی ہیں۔ اُردو اس باب میں پالی کی ہم نوا ہے کہ اس میں اَءِ، اَءُ کی آوازیں نہیں ملتیں۔ میرے نزدیک اس بیان میں منطقی مغالطہ ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اُردو میں اَءِ، اَءُ کی آوازیں نہیں ملتیں لیکن یہ غلط ہے کہ سنسکرت اَے، اَو کی جگہ اور ان کے مقابلہ میں اُردو والے پالی کی طرح اِے، اُو کی آوازیں نکالتے ہیں۔"[۱۱]

یورو آریائی، ایرانی آریائی، ہند آریائی اور ہندوستانی زبانوں کی پڑتال کر لینے کے بعد اس بارے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ ان زبانوں میں صوتی تبادل جس استقلال، قاعدے اور ضابطے کے ساتھ ملتا ہے وہ کسی خارجی عامل، حادثے یا اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود زبان کے مزاج اور سرشت میں شامل ہے اور زبان کے فروغ اور ارتقا کا ضامن ہے۔ یہاں معنی کی بات کا موقع نہیں ہے۔

آریائی: ک = گ   ت = د   پ = ب   چ = ج
اُردو: ک = گھ   ت = دھ   پ = بھ   چ = جھ   ٹ = ڑھ،
گ = کھ   د = تھ   ب = پھ   ج = چھ   ڈ، ڑ = ٹھ

ایک اور فرق ان دونوں زبانوں کے صوتی تبادل میں یہ ہے کہ آریائی زبان میں واو اور بے کی آوازیں کسی شرط کے بغیر ہر جگہ باہم بدل جاتی ہیں لیکن اُردو میں ایسا نہیں ہے۔[۱۲]

۱۰۰۰ء تک ہند آریائی زبان اپنی تاریخ کے نئے دور - جدید ہند آریائی دور - میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندوستانی تاریخ میں عظیم واقعات ہو چکے تھے اور بیرونی عہد آفریں اثرات کے باوجود ہندوستانی تہذیب کا امتزاجی عمل بلا روک ٹوک جاری رہا۔ ہندوستانی طرزِ معاشرت اور ہندوستانی فکر کا دائرہ برابر وسیع ہوتا رہا۔ ہندوستان کے دل و دماغ اور ہاتھوں کو محسوس کرنے، غور و فکر کرنے اور تخلیق کرنے کی جو آزادی حاصل تھی۔ اس

کے نتیجہ میں انسانیت کے لیے مستقل اقدار کی حامل چیزیں وجود میں آرہی تھیں۔ ۱۰۰۰ء تک ہندوستانی تہذیب سے علمی اور سائنسی تصورات اور ایسی متعدد فنی تخلیقات شامل ہو چکی تھیں جنھیں بالآخر انسانی عظیم اکتسابات میں شامل کیا جا رہا ہے۔ آریائی زبان اور کسی حد تک دراویدی نے بھی ہندوستان کی اس تمدنی پیش رفت کا ساتھ دیا تھا۔ اوّل الذکر نے ویدی "سنسکرت" پالی اور پراکرت کی شکل میں موخر الذکر نے تامل، کنٹر اور تلگو (اس کے نمونے ۱۰۰۰ء سے بھی ماقبل دور کے ملتے ہیں) کی شکل میں خالص ادب، فلسفہ اور اس دور کے مطابق سائنس کی عظیم المرتبت تخلیقات کی ہیں ۱۰۰۰ء کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا، مذہب اسلام کے مقلد ترکوں اور دیگر غیر ملکیوں کی شمالی ہند پر اور شمالی ہند کے مسلمانوں کی دکن پر فتح اس کا سبب بنی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی زبانوں کو ہندوستانی ذہن اور ہندوستانی تہذیب کی نئی شکل کے اظہار کا کام انجام دینا پڑا۔ پراکرتوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ علاقائی اپ بھرنشوں سے گزر کر پراکرتیں جدید ہند آریائی زبانوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ سنسکرت بالکل مردہ زبان نہیں ہو گئی تھی۔ قدیم ادب کے ذخیرہ کی شکل میں اس کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ اور سنجیدہ تصانیف کے لیے اسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ جیسے جیسے بول چال کی زبانیں قدیم ہند آریائی کے اس معیار سے دور ہوتی گئیں۔ جس کی نمائندگی سنسکرت کرتی تھی۔ ان دونوں (سنسکرت اور بول چال کی) زبانوں میں خارجی اختلاف بھی وسیع تر ہوتا گیا[۱۳]۔

برصغیر پاک و ہند کی زبانوں پر ابتدائی کام گریرسن نے کیا ہے جس میں بعض خامیوں کے باوجود تمام متاخرین ماہرین لسانیات نے اپنے تحقیقی کام کی بنیادیں اس پر رکھتے ہوئے اسے ایک سند تسلیم کرلیا ہے۔ گریرسن کی تقسیم کے مطابق ہند آریائی خاندان کے پشاچہ گروہ کے اس ذیلی گروہ یعنی پہاڑی زبانوں کے گروہ اور اس کی حدود کی تفصیل یہ ہے کہ انتہائی مشرق میں کھس کورا (Khas-Kura) یا مشرقی پہاڑی بولی جاتی ہے جسے عام طور پر نیپالی کہا جاتا ہے۔ گڑھوال کے علاقہ میں بولی جانے والی پہاڑی جسے گڑھوالی یا کماؤنی بھی کہا جاتا ہے کو سنٹرل یا وسطی پہاڑی کا نام دیا گیا ہے جس کی جانسر (Jaunsar)، باور (Bawar)، شملہ کی پہاڑی ریاستوں، کلو (Kulu)، منڈی (Mandi)، سکت (Suket)، چمبہ اور مغربی کشمیر میں بولی جانے والی پہاڑی کو مغربی پہاڑی زبانوں کے گروہ میں شامل کیا گیا ہے۔ پہاڑی گروہ کی زبانوں کے تین ذیلی گروہوں اور انکی حدود سے متعلق گریرسن کے الفاظ اس طرح ہیں:

> "The Pahari Language fall into three main groups. In the extreme east threre is Khas-Kura or Eastern Pahari, Commonly called Naipali, the Aryan Language spoken in Nepal. Next in Kumaon and Garhwal, we have the central Pahari Languages Kumaoni and Garhwali. Finally in the west we have the western Pahari Languages spoken in Jaunsar, Bawar, the Simla Hill States, Kulu, Mandi and Suket, Chamba, and Western Kashmir".[۱۲]

گریرسن نے پہاڑی گروہ کی زبانوں کو تین گروہوں میں یعنی مشرقی، وسطی اور مغربی میں تقسیم کرکے انکا مطالعہ آسان بنانے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن وہ ہند آریائی زبانوں کے پہاڑی گروہ کے بہتے دریا جیسے بے مثال تسلسل کے باعث تذبذب کا شکار ہو کر ریاست جموں و کشمیر کی پہاڑی زبان کو بے تصریح کہنے پر مجبور ہوا جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ نہ صرف جموں و کشمیر کی پہاڑی زبان کی حدود ہی جو ریاست کے باہر تک ہیں متعین نہیں کر سکا بلکہ خطے کی اس زبان سے متعلق بھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ گریرسن کے تحقیقی کام میں خامیاں رہی ہیں۔

گریرسن نے اپنے شہرہ آفاق تصنیف (Linguistic Survey of India) میں اتنا زیادہ کام کرکے آنے والے ماہرین لسانیات کے لیے راہیں ہموار کی ہیں، لیکن محکمہ مال کے اہلکاروں کے تراجم اور لسانی نمونہ جات کے اندراج میں سہو اور خطا کے احتمالات کو کیسے رد کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند گریرسن کی تحقیق کے حوالہ سے اپنے خیالات یوں بیان کرتے ہیں:

> ”بیسویں صدی کے ربع اوّل میں گریرسن نے ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ لیا تھا۔ یہ جائزہ سرانجام دے کر گریرسن نے ہمارے ملک کی بہت بڑی خدمت کی لیکن اسکا طریقہ کار سائنسی نہ تھا۔ اس نے نثر کے ایک دو صفحات لکھ کر کلکٹروں کو بھیج دیے اور انھوں نے پٹواریوں کی مدد سے انکا مقامی بولی میں ترجمہ کرا دیا۔ اس ترجمے کو دیکھ کر گریرسن نے فیصلہ کیا کہ کس علاقے کی کون سی بولی ہے اور کس بولی کا کونسا علاقہ

> ہے۔ جہاں زبانوں یا بولیوں کے ڈانڈے ملتے ہیں وہاں تشفی بخش مطالعہ لسانیات میں تربیت یافتہ شخص ہی کرسکتا ہے۔''۱۵

زبانوں یا بولیوں کے ڈانڈے ملنے اور ان کے وجود کا ایک دوسری سے علیحدہ تعین ماہرین لسانیات کے لیے بھی امتحانی نوعیت کا کام ہوتا ہے اور بعض اوقات حد درجہ کوشش کے باوجود سہو اور غلطی کے احتمال کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہند آریائی زبانوں میں تسلسل کے پیش نظر ان کی حدود اور وجود کے تعین میں لغزش کے امکانات اور بھی زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر سد ھیشور ورما لکھتے ہیں:

> ''عہد حاضر کی ہند آریائی کی نہایت نمایاں خصوصیت اس کا تسلسل ہے۔ ہنگری اور رومانی زبانوں کی طرح ہند آریائی میں کبھی عدم تسلسل نہیں ہوا۔ عموماً وہی حروف علت اور وہی حروف صحیح جو قدیم آریائی زمانے میں بولے جاتے تھے اب بھی بولے جاتے ہیں۔ اس تسلسل کی وجہ سے عہد حاضر کی ہند آریائی زبانوں کی حد بندی نہایت مشکل ہو گئی ہے۔ مثلاً یہ واضح طور پر پتہ لگانا مشکل ہے کہ پنجابی زبان کہاں ختم ہوتی ہے اور ہندی کہاں شروع ہوتی ہے۔''۱۶

بابائے اُردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''اُردو حروف تہجی کل ملا کر پچاس ہیں اور ان میں ہر قسم کی آواز ادا کرنے کی گنجائش ہے اور اس خیال سے اُردو ابجد کو دنیا کی بہت سی زبانوں پر ایک طرح کا تفوق حاصل ہے۔ مگر دنیا کی کوئی ابجد کامل نہیں ہے ایک نہ ایک نقص ضرور رہ جاتا ہے یا تو کل سادہ آوازوں کے ادا کرنے کے لیے حروف نہیں ہوتے ہیں یا ایک ہی آواز کے لیے کئی حروف ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُردو زبان بھی اس سے خالی نہیں۔ چنانچہ یہ آخری نقص اُردو میں بھی پایا جاتا ہے۔''۱۷

''تاریخ زبان و ادب ہندکو'' کے مصنف مختار علی نیّر نے /ن/ اور /ڑ/ کی اس درمیانی آواز یعنی معکوسی نون /ن/ کے لیے بین الاقوامی رسم الخط کی روشنی میں ماہرین کی املائی ہوئی اور سرائیکی و میسوری اُردو میں مستعمل علامت /ن/ جو ہر لحاظ سے مناسب اور موزوں ہے کو اپنانے کے بجائے /ز/ پر /ط/ لگا کر ایک نئی اور بے نام

علامت /ز/[۱۸] وضع کر لی جس نے معکوسی نون /ن/ کو اپنی اصل یعنی نون /ن/ اور نون غنہ /ں/ اور اس کی دوسری شکل /ٗ/ سے بہت دور /ر/، /ڑ/، /ز/، /ژ/ کی قبیل میں دھکیل دیا ہے۔ نیّر صاحب معکوسی نون /ن/ اور ہائے خفی /~/ جو ہندکو اور پہاڑی کی مشترکہ آوازوں /کہ/، /بہ/ اور /پہہ/ وغیرہ میں مستعمل ہیں کی اپنے انداز سے وضعگی کا جواز یوں پیش کرتے ہیں:

> ''دوسری زبان سے مستعار حرف لے کر اپنی ماں کو شرمندہ کرنا ہمیں کوئی اچھا نہیں لگا۔ ہم اپنی آسانی کے لیے اپنی ماں کو ساری عمر کیوں قرضدار اور شرمسار کریں۔''[۱۹]

پہاڑی حروف تہجی یا علامات و اصوات کی تعداد ٦٦ تک پہنچ جاتی ہے جو اس طرح ہیں:

آ ، ا ، ب ، بہ ، پ ، پہ ، پھ ، ت ، تہ ، تھ ، تھہ ، ٹ ، ٹہ ، ٹھ ، ث ، ج ، جہ ، چ ، چہ ، چھ ، چھہ ، ح ، خ ، د ، دھ ، ڈ ، ڈھ ، ذ ، ر ، ر~ ، ڑ ، ڑھ ، ز ، ز~ ، ژ ، س ، سہ ، ش ، شہ ، ص ، ض ، ط ، ظ ، ع ، غ ، ف ، ق ، ک ، کہ ، کھ ، گ ، گھ ، ل ، لہ ، م ، مہ ، نٗ ، نہ ، ن ، ؤ ، و ، ھ ، ~ ، ء ، ی ، ے۔

پہاڑی کی ٦٦ اصوات و علامات پر مشتمل حروف تہجی کی اس تختی میں شامل ہائے خفی /~/ کے استعمال سے بننے والی ١٦ نئی آوازوں کو علم الاصوات (Phonology) کے قاعدے اور قانون کے مطابق اقلی جوڑوں کی کسوٹی پر پرکھنے سے پہلے نامور ماہر لسانیات ڈاکٹر عصمت جاوید ''نئی اُردو قواعد'' میں رقم طراز ہیں:

> ''کسی زبان کے صوتیے معلوم کرنے کے لیے اس زبان سے الفاظ کے ایسے جوڑے منتخب کیے جاتے ہیں جن میں کم سے کم ایک کلامی آواز مختلف ہوتی ہے اور دونوں الفاظ الگ الگ معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ کلامی آواز کا یہ اختلاف ابتدا، وسط یا آخر پر ہوتا ہے۔ الفاظ کے یہ جوڑے اصطلاح میں اقلی جوڑے کہلاتے ہیں کیوں کہ ان میں کم سے کم آوازیں ہوتی ہیں۔ مثلاً لفظوں کا یہ جوڑا دیکھیے بل – پل ان میں /ل/ کی آواز مشترک ہے لیکن ابتدائی آوازیں مختلف ہیں۔ ان الفاظ کے معنی بھی الگ الگ ہیں۔ ''بل'' کے وہ معنی نہیں جو ''پل'' کے ہیں...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''ب'' اور ''پ'' دو ایسی مختلف کلامی آوازیں ہیں جن کو کسی لفظ میں ایک

دوسرے کی جگہ استعمال کرنے سے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔''[۲۰]

ڈاکٹر اقتدار حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''لفظ کی تعریف یہ ہے کہ کم از کم اقلی آزاد روپ ہے۔یعنی آزاد طور سے استعمال ہوتا ہے۔اس کا استعمال دوسرے کسی روپ کا پابند نہیں ہے۔اس طرح لفظ میں تین خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:
>
> ا۔ یہ اقلی روپ رکھتا ہے۔اگر اس شکل سے زیادہ ہو تو یہ ایک لفظ سے زیادہ ہوگا۔اس سے کم ہو تو ایک لفظ سے کم ہوگا۔
>
> ۲۔ یہ آزاد روپ ہے۔اس کا استعمال کسی دوسرے لفظ' مارفیم یا روپ کا محتاج نہیں۔
>
> ۳۔ یہ بامعنی ہوتا ہے۔
>
> اگرچہ ہر زبان میں ایسی مثالیں مل جائیں گی جہاں ایک ہی لسانی روپ بیک وقت مارفیم بھی ہے اور لفظ بھی ہے مگر یہ ضروری نہیں۔''[۲۱]

صوتیات کے حوالے سے پہاڑی زبان میں کام نہیں ہوا ہے لیکن ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین کے بقول جس طرح ''لسانیات کے جدید اصولوں پر اُردو زبان کا مطالعہ بصیرت کے کئی چراغ جلانے میں بڑا ہی مددگار ثابت ہوا ہے۔بالکل اسی طرح پہاڑی زبان پر کام بھی لسانیاتی تحقیق کے میدان میں کئی نئے انکشافات کی بنیاد فراہم کرے گا[۲۲]۔ ماہرین لسانیات جس طرح اُردو حروف تہجی یا علامات واصوات کی تعداد کے تعین میں متفق نہیں ہیں اسی طرح لسانیات میں مستعمل اصطلاحات کے معاملہ میں بھی ایک دوسرے کے قریب تر ہونے کے باوجود اپنی اپنی انفرادیت کے اظہار سے اجتناب نہیں کر سکے۔

زبان ہمیشہ سے فلسفہ' منطق' مذہب' علم' فصاحت و بلاغت تدریس زبان اور ادبی تنقید سے وابستہ رہی ہے۔ان علوم کا شاید ہی کوئی ایسا مفکر ہو جس نے زبان اور اس کی قواعد پر اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔زبان سے متعلق پرانے خیالات وسیع سیاق وسباق میں ملتے ہیں۔انسان کی تہذیب اور روایات کی تاریخ شاہد ہے کہ انسان نے ہمیشہ زبان کی ابتدا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔Cultural Anthropology کی تحقیق نے

یہ ثابت کر دیا ہے کہ قدیم سے قدیم کلچر میں زبان کا تصور ابتداء سے ملتا ہے۔ جیسے آدمؑ، شیطان اور خدا کی گفتگو جس کا ذکر انجیل مقدس اور قرآن پاک دونوں میں آیا ہے۔ قدیم مصر کے عقائد کی تھوتھ (Thorth) نامی خدا بول چال اور تحریر کا بانی تھا۔ زبان کو محفوظ کرنے کے لیے قواعدیں لکھی گئیں۔ جیسے ویدک سنسکرت کی قواعد جو پاننی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی۔

اُردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں ہندی (زمانہ حال کی کھڑی بولی ہندی جو ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے) کے حوالے سے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ایسی تحریریں زیادہ تر انگریزی میں ہیں جن کے مصنفین میں جارج ابراہیم گریرسن، سنیتی کمار چیٹر جی اور امرت رائے قابل ذکر ہیں۔ اس موضوع پر فرنیک ای۔ کے، کرسٹوفر آر۔ کنگ اور روسودھا ڈالمیا کی انگریزی کتابیں بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ سنیتی کمار چیٹر جی نے "Indo-Aryan and Hindi (1942)" امرت رائے نے "A House Divided: The Origin and Development of Hindi-Urdu (1991)" اور گیان چند جین نے ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' ۲۰۰۵ء، اُردو کے ساتھ متعصّبانہ رویہ اختیار کیا، جس پر اہلِ اُردو نے اپنا فطری ردِعمل ظاہر کیا۔ البتہ نامور ماہرِ لسانات اور ممتاز محقق پروفیسر مسعود حسین خاں نے اُردو کے آغاز و ارتقاء کا قابل قبول نظریہ پیش کیا ہے۔ سیّد محی الدین قادری زور کی طرح مسعود حسین خاں نے بھی لسانیات کی باقاعدہ تعلیم لندن اور پیرس میں رہ کر حاصل کی ہے۔ وہ ۱۹۵۰ء میں انگلستان گیے اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، لندن کے شعبہ لسانیات میں داخلہ لیا، جہاں ان کی ملاقات ممتاز برطانوی ماہرِ لسانیات و صوتیات جے۔ آر۔ فرتھ (J. R. Firth) سے ہوئی۔ فرتھ کے لسانیاتی افکار و نظریات سے مسعود صاحب بے حد متاثر ہوئے اور اس کے نظریۂ عروضی صوتیات (Theory of Prosodic Phonology) کا اطلاق اُردو لفظ کے مطالعے اور تجزیے پر کیا۔ مسعود حسین خاں ۱۹۵۱ء میں لندن سے فرانس گئے اور وہاں لسانیات میں اپنے تحقیقی مقالے کی تیاری میں مصروف ہو گئے، ۱۹۵۳ء میں انھیں پیرس یونیورسٹی سے ''ڈکتر ڈیونیورستے'' (Doctorat d'University) یعنی ڈاکٹر آف یونیورسٹی جسے عام طور پر ڈی۔ لٹ کہا جاتا ہے۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ (A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

وہ اپنی تصنیف ''دکنی یا اُردوئے قدیم'' میں اُردو کے ماخذ کی تلاش توضیحی لسانیات کے نو تعمیری

اصولوں کی رو سے نواحِ دہلی کی بولیوں میں کی جانی چاہیے۔ دکنی اُردو کی لسانی خصوصیات جن میں صوتی ٗصرفی ٗ نحوی اور قواعدی خصوصیات شامل ہیں، معیاری اُردو سے بہت مختلف ہیں اور ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

اُردو رسمِ خط کی تشکیل کے بنیادی عناصر:

جس طرح زبان صوتی اکائیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اسی طرح رسمِ خط تحریری اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انھیں اکائیوں کو باہم ترتیب دینے سے لفظ بنتے ہیں اور لفظوں سے جملے تشکیل پاتے ہیں۔ کسی زبان کے رسمِ خط سے کلی واقفیت کے لیے اس کے تشکیلی یا ترکیبی عناصر سے واقفیت ضروری ہے۔ اُردو رسمِ خط کی تشکیل تین طرح کے تحریری عناصر سے مل کر ہوئی ہے۔ جو مفرد حروف، حروف کی ترکیبی شکلوں اور اعراب و علامات پر مشتمل ہیں۔

مفرد حروف:

اُردو کے مفرد حروف یا حروفِ تہجی عربی و فارسی زبانوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔ چند مفرد حروف خود اُردو والوں کے وضع کردہ ہیں۔ انشاءاللہ خان انشاؔ نے ۱۸۰۷ء میں اُردو حروفِ تہجی کی تعداد ۸۵ بتائی ہے[۲۳]۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے ۱۹۵۵ء کے نزدیک اُردو حروفِ تہجی کی تعداد ۴۷ بتائی ہے[۲۴]۔ شیخ چاند، اسمٰعیل میرٹھی، حیات اللہ انصاری رشید حسن خان[۲۵] اور بعض دوسرے عالموں کی طرح اردو کے قاعدہ نویسوں کے نزدیک بھی اُردو حروفِ تہجی کی تعداد جُدا جُدا ہے۔

عہدِ حاضر میں جدید لسانیاتی اصولوں اور سائنسی انداز پر اُردو کے جو قاعدے (Primers) ترتیب دیئے گئے ہیں، ان میں حروفِ تہجی کی کل تعداد ۳۶ متعین کی گئی ہے جن میں عربی و فارسی کے وہ ہم صوت حروف بھی شامل ہیں جو بقولِ مسعود حسین خاں ''مردہ لاشیں ہیں، جسے اُردو رسمِ خط اٹھائے ہوئے ہے۔ صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔''[۲۶]

اسی طرح ہائیہ آوازوں والی تحریری شکلوں، مثلاً پھ، بھ، تھ، دھ، کھ، گھ وغیرہ کو مفرد حروف کا درجہ نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ حرف کی تعریف پر پوری نہیں اُترتیں۔ لسانیات کی رُو سے ''حرف'' سب سے چھوٹی تحریری اکائی ہوتی ہے جس کے مزید ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے۔ اس تحریری اکائی کو لسانیاتی اصطلاح میں ''ترسیمیہ'' کہتے ہیں۔ مثلاً ب، پ، ت، د، ج، گ وغیرہ مخلوط حروف مثلاً پھ، بھ، تھ، جھ، دھ، کھ وغیرہ

کو حروف یا سب سے چھوٹی تحریری اکائی (ترسیمیہ) کا درجہ اس لیے نہیں دیا جاسکتا کہ ان کی تشکیل دو تحریری عناصر پ + ھ (= پھ) یا د + ھ (= دھ) کی ترکیب عمل میں آئی ہے۔ اسی لیے انھیں اُردو کے حروف تہجی میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ جو اہلِ علم مخلوط حروف مثلاً پھ بھ جھ دھ کھ گھ وغیرہ کو اُردو کے حروف تہجی میں شامل کرتے ہیں، وہ اہلِ ہندی کا اتباع کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہندی رسمِ خط یا ناگری لپی میں پھ، بھ، تھ، دھ، کھ، گھ وغیرہ مخلوط حروف کا درجہ نہیں رکھتے۔ بالفاظِ دیگر ان کی تشکیل دو تحریری عناصر سے مل کر نہیں ہوئی ہے۔ یہ سب سے چھوٹی تحریری اکائیاں ہیں، اسی لیے انھیں مفرد حروف یا ''ترسیمیہ'' کہتے ہیں۔ اہلِ ہندی کا انھیں حروفِ تہجی میں شامل کرنا بالکل بجا ہے۔

اسی طرح ہمزہ (ء) بھی اُردو میں حرف نہیں۔ بلکہ محض ایک تحریری علامت ہے جس کا استعمال مصوتی تسلسل (Vowel Sequence) کے لیے کیا جاتا ہے، مثلاً بھائی [bha:+i:] فائدہ [fa: + ida] 'سوئی [Su: + i:] وغیرہ۔ ان الفاظ میں [a: i:] '[a : i] اور [u: i:] کی حیثیت مصوتی تسلسل کی ہے۔ جسکی تحریری نمائندگی کے لیے ہمزہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بہ استثنائے ہمزہ اُردو کے حروفِ تہجی کی کل تعداد ۳۶ ہے جو یہ ہیں[۲۷]:

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے۔

ان میں سے ۲۸ حروف اصلاً عربی کے ہیں جو ''ترتیبِ ابجد'' کے لحاظ سے اس طرح ہیں:

ا ب ج د ابجد	ہ و ز ہوز
ح ط ی حطی	ک ل م ن کلمن
س ع ف ص سعفص	ق ر ش ت قرشت
ث خ ذ ثخذ	ض ظ غ ضظغ

جب عربی رسمِ خط ایران پہنچا اور فارسی زبان کے لیے اختیار کیا گیا تو وہاں چار نئے حروف وضع کیے گئے جو یہ ہیں:

پ چ ژ گ

یہ حروف عربی میں موجود نہ تھے۔ کیونکہ انکی اصوات کا وجود عربی میں نہ تھا۔

یہ حروف عربی کے چار موجودہ حروف ب ح ر ک کی بنیاد پر نقطوں اور مرکز کے اضافے سے وضع کیے گئے۔ یعنی ب سے پ، ح سے چ، ر سے ژ اور ک سے گ بنالیے گئے۔ اسطرح فارسی حروفِ تہجی کی کل تعداد ۳۲ ہوگئی۔ یہی عربی فارسی رَسمِ خط جب ہندوستان پہنچا اور اُردو کے لیے اختیار کیا گیا تو بعض حروف کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کیونکہ اُردو میں تکلمی آوازیں (صوتی اکائیاں) عربی فارسی سے زیادہ تھیں اور ان کی نمائندگی کرنے والے حروف کم تھے یعنی صرف ۳۲ تھے۔ چنانچہ جہاں مزید چار نئے حروف وضع کیے گئے جو یہ ہیں:

ٹ ڈ ڑ ے

اس طرح حروف تہجی کی تعداد کل ۳۶ ہوگئی۔

عربی میں پہلے کل ۲۲ حروف تھے اور ترتیب ابجد کے لحاظ سے یہ اسطرح تھے: ا ب ج د ہ و ز ح ط ی ک ل م ن س ع ف ص ق ر ش ت یعنی ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت۔ بعد ازاں ۶ نئے حروف: ث خ ذ ض ظ غ یعنی ثخذ ضظغ کا اس میں اضافہ کیا گیا۔ ہمزہ [ء] کا اضافہ بھی بعد میں ہوا ہے۔ عربی لام الف [لا، لا] کی ایجاد بھی بعد کی چیز ہے۔

صرف نقطوں اور بعض حروف میں چھوٹی طوے اور مرکز کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً ب پ ت ٹ ث / د ڈ ذ / س ش / ک گ / وغیرہ۔

خالص صوری یا ہیئتی ترتیب کے لحاظ سے اُردو کے ۳۶ حروف کو ذیل کے ۱۸ زمروں یا گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱)	ا ا آ	(۲)	ب ب پ ت ٹ ث
(۳)	ج ج چ ح خ	(۴)	د د ڈ ذ
(۵)	ر ر ڑ ز ژ	(۶)	س س ش

(۷)	ص ص ض	(۸)	ط ط ظ
(۹)	ع ع غ	(۱۰)	ف ف
(۱۱)	ق ق	(۱۲)	ک ک گ
(۱۳)	ل ل	(۱۴)	ن ن
(۱۵)	و و	(۱۶)	ہ ہ
(۱۷)	ی ی	(۱۸)	ے ے

ان میں سے ہر گروپ کی نمائندگی اسی گروپ کے ایک حرف سے ہوتی ہے۔ جیسے بنیادی حروف یا ”بنیادی ترسیمہ“ کہہ سکتے ہیں۔ اسطرح اُردو کے بنیادی حروف یا بنیادی ترسیموں کی تعداد ۱۸ قرار پائی ہے۔ ان کی تدریسی نقطہ سے بے حد اہمیت ہے، کیوں کہ مبتدیوں کو اگر یہ ۱۸ بنیادی حروف پہلے سکھا دیئے جائیں تو ان کے لیے باقی ۱۸ حروف کے سکھانے کا عمل بے حد آسان ہو جائے گا۔ اسطرح اُردو حروف تہجی کی تعداد ۳۶ ہے۔ انکا طرزِ تحریر ”نستعلیق“ کہلاتا ہے۔

خطِ نستعلیق کا ارتقاً ایران میں ہوا۔ یہ دو رسمِ خط ”نسخ“ اور ”تعلیق“ کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ خواجہ میر علی تبریزی اسکے موجد ہیں۔ عربی رسمِ خط کا اندازِ تحریر اور طرزِ کتابت ”نسخ“ کہلاتا ہے۔ یہ ”نبطی“ رسم خط سے اَخذ کیا گیا ہے۔ قدیم زمانے میں عرب میں ایک خط رائج تھا جسے خطِ کوفی کہتے تھے۔ خطِ ”نسخ“ کی طرح یہ بھی ”نبطی“ رسمِ خط سے ماخوذ ہے۔ خطِ کوفی کوفہ اور بصرہ میں، اور خطِ نسخ مکہ اور مدینہ میں ارتقاء پذیر ہوا۔ اس کی تشریح رشید حسن خاں کی کتاب سے دیکھی جا سکتی ہے[۲۸]۔ انجم رحمانی اُردو رسم الخط کے بارے میں لکھتے ہیں:

> برصغیر میں عربوں کی با قاعدہ آمد سے عربی زبان اور خط بھی انکے ہمراہ یہاں وارد ہوا جو اُس وقت خطِ کوفی اور خطِ نسخ کی صورت میں رائج تھا۔ سلطان محمود غزنوی کی فتح لاہور (۴۱۳ھ) سے لے کر بابر کی فتح (۹۳۲ھ) تک ہندوستان میں مقامی زبان کے علاوہ عام طور پر عربی اور فارسی بھی بولی جاتی تھی اور انکے لیے عربی خط یعنی خطِ نسخ

> اور اس سے متعلق دوسرے تزئینی خطوط استعمال ہوتے تھے۔ بابر خطِ نستعلیق کو اپنے ہمراہ ہندوستان لایا اور یہاں اسے پہلی بار متعارف کرایا۔ بابر سے لے کر اورنگ زیب ۱۷۰۷ء تک خطِ نستعلیق کو شاہی سرپرستی میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ اس دوران میں خطِ نسخ بھی مستعمل رہا۔[۲۹]

اس طرح اُردو املاء کے قواعد و ضوابط منضبط کرنے والوں نے بالعموم انشاء اللہ خان انشاؔ کا سہولت اور قبولِ عام کا وہ راہنما اصول پیشِ نظر رکھا ہے جو انہوں نے ''دریائے لطافت'' میں بیان کیا ہے:

> ''جو لفظ اُردو میں آیا وہ اُردو ہو گیا خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا یورپی، اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح، اسکی صحت یا غلطی اسکے اُردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے کیوں کہ جو چیز اُردو کے خلاف ہے وہ غلط ہے گو اصل میں صحیح ہو اور جو اُردو کے موافق ہے وہی صحیح ہے۔ خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔''[۳۰]

اُردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں ہندی (زمانہ حال کی کھڑی بولی ہندی جو ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے) کے حوالے سے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس حوالے سے یہ امر ملحوظ رہے کہ دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان کے لسانی مسائل کئی حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں جن میں اردو زبان کے آغاز و پیدائش کے نظریات، اردو زبان کی تاریخ، اردو زبان کے قواعد، اردو لسانیات کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اردو لسانیات پر دیگر زبانوں کے اثرات کے حوالے بھی شامل ہیں۔ چنانچہ اس تقسیم کے حوالے سے جب ہم ''اردو لسانیات'' پر تحریر شدہ کتب کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ نہ صرف اُردو زبان سے متعلق اہلِ زبان نے کوشش کی ہے بلکہ بہت سے مستشرقین نے بھی اس میدان میں اپنے جوہر دکھانے کی سعی کی ہے۔

جہاں تک مجموعی طور پر علمائے لسانیات کی کاوشوں کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ہمیں اردو زبان کی پیدائش کے نظریات، اردو زبان اور اردو ادب کی تواریخ، اردو قواعد و انشا، علمِ لسانیات اور اردو لسانیات جیسے مباحث مل جاتے ہیں۔

حصہ دوم:

اردو میں لسانی مباحث کا آغاز

مستشرقین کی خدمات:

اردو میں لسانی مباحث کی تاریخ کی طرف نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح اردو زبان کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے، اسی طرح لسانی مباحث کی تاریخ بھی دو صدی سے زیادہ دور تک ظہور پذیر ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ اس ضمن میں اولیت کا سہرا انشاء اللہ خان انشا کے سر باندھا جاتا ہے جنہوں نے ۱۸۰۷ء میں ”دریائے لطافت“ کی مدد سے اردو میں پہلی بار قواعد و انشا پر بحث کی۔ تاہم انشا کی یہ اولیت محض اس حوالے سے ہے کہ وہ اردو دان طبقے میں اردو کے قواعد پر بحث کرنے والے پہلے فرد تھے، ورنہ ان سے قبل یہ کام جزوی طور پر بعض مستشرقین کر چکے تھے۔ ان ابتدائی نوعیت کی کتب کا اجمالی ذکر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

مشہور مستشرق جارج گریرسن ”لنگوسٹک سروے آف انڈیا“ کی جلد نہم میں ہندوستانی زبان کے لغات اور قواعد کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلی لغت کے متعلق مسٹر کورچ (Qauritch) کی اورینٹل کیٹلاگ کا حوالہ دیتے ہیں اور کہتے کہ اُن کے پاس ایک قلمی مسودہ تھا جو فارسی، ہندوستانی، انگریزی اور پرتگالی الفاظ کے لغات کو محتوی تھا، اس کی تالیف ۱۶۳۰ء میں بہ مقام سورت ہوئی تھی [۱]۔

فرانس کس تیورونینسس (Franciscus Turonensis) کی ایک تالیف ہے جس کا نام Lexicon Linguae Indostanicaa ہے۔ یہ کتاب ۱۷۰۴ء میں بہ مقام سورت تیار ہوئی جس کی دو جلدیں تھیں اور ہر جلد تقریبا پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل تھی۔

ہندوستانی زبان کے قواعد کے متعلق سب سے پہلی کتاب جان جوشوا کیٹلر (John Joshua Ketelaer) کی تحریر کردہ ہے جو ۱۸۱۵ء میں تصنیف ہوئی۔ کیٹلر ہالینڈ کا باشندہ اور لوتھر کا پیرو تھا۔ ۱۷۴۳ء میں ڈیوڈ مل (David Mill) نے ہندوستانی زبان کے قواعد و لغت کو لاطینی زبان میں مرتب کیا تھا۔ اس ضمن میں

مولوی عبدالحق کا قیاس ہے کہ یہ تصنیف ۱۷۱۵ء میں منظر عام پر آئی[۳۲]۔ اسی طرح ''ہندوستانی گرامر'' (Grammatica Indostanica) کے نام سے بنجمن شلز کا رسالہ بھی لاطینی زبان کی تحریر تھی جو بقول مولوی عبدالحق ۱۷۴۴ء میں شائع ہوا تھا[۳۳]۔

بنجمن شلزی (Benjamin Shulzino) کی ''ہندوستانی گرامر'' کے ۱۶۲ صفحات میں اردو میں ۱۱۸ صفحات انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ستمبر ۱۹۷۷ء میں مرتب کر کے اس کا ترجمہ کرنے ساتھ ساتھ حواشی و تعلیقات بھی تحریر کیے اور اس کا سن اشاعت ۱۷۴۱ء بتایا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں اردو میں قواعد نویسی کے بارے میں بنجمن شلزی لکھتے ہیں:

> ''اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں بعض اور مغربی مصنفین اردو کی قواعد نویسی کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں اور سر جارج گریرسن کی مشہور تالیف جائزہ لسانیہ ہند (Linguistic Servey of India) میں اردو سے متعلق جلد کے شروع میں ان کی کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں ایک مصنف نے پرتگال میں (Portugues Grammatica Indostana) لکھی جو لزبن سے ۱۷۷۸ء میں شائع ہوئی۔ انگریزی زبان میں اردو کے قواعد نویسوں میں ایک قدیم مصنف گلڈسن ہے جو گورنر ونسٹی نارٹ کا سیکرٹری تھا۔ اس کا ذکر جان گل کرسٹ نے کیا ہے۔ ہیڈلے کی گرامر ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی۔''[۳۴]

یہ بیان ''ہندوستانی گرامر'' کی سن اشاعت کے درج بالا تمام دعووں کو باطل ثابت کرتا ہے کیونکہ اگر یہ تصنیف مولوی عبدالحق کے مطابق ۱۷۴۴ء میں بھی تحریر کی گئی تو اس میں ۱۷۷۲ء اور ۱۷۷۸ء میں تحریر ہونے والی کتب کا تذکرہ کیونکر ہوا۔ اس طرح اس کا سن اشاعت ۱۷۷۸ء کے بعد ہونا چاہیے۔ بہرحال اس بحث سے قطع نظر ''ہندوستانی گرامر'' مستشرقین کی اردو قواعد کے ضمن میں کی گئی کاوشوں میں ایک مقام کی حامل ہے۔

۱۷۹۱ء میں ایک انگریز مصنف ہنری ہیرس نے "Analysis, Grammer & Dictionary of Hindustani Language" کے عنوان سے تحریر کی۔ اس کا تذکرہ گلکرسٹ نے بھی اپنی تصنیف میں کیا ہے۔

”ہندوستانی زبان کے قواعد“ ڈاکٹر گل کرسٹ کے سلسلۂ لسانیاتِ ہندی کی جلد اول کا تیسرا حصہ ہے۔ اس کا پہلا حصہ انگریزی ہندوستانی لغت تھا جس کی جلد اول ۱۷۸۶ء میں اور جلد دوم ۱۷۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف کا دوسرا حصہ ”قواعد ولغت کا ضمیمہ“ کے عنوان سے ۱۷۹۸ء میں شائع ہوا جبکہ اس کا تیسرا حصہ ”ہندوستانی گرامر“ کے نام سے موسوم ہے۔ اس تصنیف کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۱۰ء میں ایڈنبرا، تیسرا ۱۸۲۵ء اور چوتھا ۱۸۵۰ء میں لندن سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی ہندوستانی (اردو) لسانیات سے متعلق خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق بیان کرتے ہیں:

> ”خود گل کرسٹ صاحب نے متعدد کتابیں اردو زبان اور اس کی لغت وقواعد پر لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب ”قواعدِ اُردو“ ۱۸۰۹ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔“[۳۵]

”قواعد زبانِ اردو“ مشہور بہ ”رسالہ گل کرسٹ“ متضمن قوانین صرف ونحو ہندی گل کرسٹ کی اس ضخیم کتاب کی اردو زبان میں تلخیص کا کام میر بہادر علی حسینی نے ”ہندوستانی زبان کے قواعد“ کے نام سے کیا جس کی پہلی اشاعت کے متعلق مولوی سید محمد ”اربابِ نثرِ اُردو“ میں بیان کرتے ہیں کہ یہ ۱۸۱۶ء میں شائع ہوئی[۳۶]۔ رام بابو سکسینہ بھی سید محمد کے ہم نوا ہیں[۳۷] جبکہ حامد حسن قادری بھی ”داستانِ تاریخِ اردو“ میں اس کا سن اشاعت کلکتہ ۱۸۱۶ء بیان کرتے ہیں[۳۸]۔ البتہ گریرسن نے ”لنگوسٹک سروے آف انڈیا“ کی جلد نہم کے حصہ اول میں اس کی اشاعت ۱۸۲۰ء تحریر کیا ہے[۳۹]۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن داؤدی لکھتے ہیں:

> ”اس رسالے کی تصحیح میں میرے پیشِ نظر دو نسخے رہے ہیں:
>
> ۱۔ رسالہ گل کرسٹ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۰ء
>
> ۲۔ رسالہ گل کرسٹ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۴ء
>
> یہ دونوں نسخے پنجاب پبلک لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ اور کہیں سے یہ نسخہ نہیں ملا۔“[۴۰]

اس بحث سے قطع نظر کہ اس تصنیف کی اولین اشاعت کی حقیقت کیا ہے، یہ امر زیادہ قابلِ ذکر ہے کہ یہ اردو میں ابتدائی طور پر لسانیات کے ”حصہ قواعد“ کے حوالے سے اہم اور معیاری تصنیف خیال کی جاتی ہے جس نے اردو قواعد کے سلسلہ تصنیف کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ معاونت بھی فراہم کی۔

جان شیکسپیئر کی تصنیف ''اردو گریمر''، اردو لسانیات کے حصہ قواعد کی ذیل میں تحریر کی گئی جو پہلی بار ۱۸۱۳ء میں منظر عام پر آئی۔ بعد ازاں اس کی اشاعت متعدد بار عمل میں آئی جن میں ۱۸۱۸ء، ۱۸۲۶ء، ۱۸۴۳ء اور ۱۸۵۸ء کے ایڈیشن کا سراغ مل جاتا ہے۔

درج بالا تصانیف مستشرقین کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس تفصیل میں مزید اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے علاوہ بھی کچھ ایسی تصانیف مل جاتی ہیں جو اردو کے لسانیاتی عمل کو پیش کرتی دکھائی دیتی ہیں تاہم ان میں سے بعض کی اہمیت ثانوی اور بعض اس سے بھی کم تر درجہ کی حامل ہیں۔ اس حوالے سے درج ذیل فہرست ملاحظہ کی جا سکتی ہے جن کا ماخذ مولوی عبدالحق کی تصنیف ''قواعد اردو'' ہے[۱۴]۔

۱۔ ولیم ٹیٹ، ''مقدمہ زبانِ ہندوستانی''، طبع اول ۱۸۱۷ء، طبع دوم ۱۸۲۴ء، طبع سوم ۱۸۳۳ء

۲۔ گارساں دتاسی، ''مقالہ قواعد اردو''، ۱۸۳۸ء

ایس۔ ڈبلیو۔ برٹن، ''رسالہ قواعد ہندوستانی'' ۱۸۴۰ء

اسٹیفورڈ ارناٹ، ''جدید خود آموز قواعد زبانِ اردو''، طبع اول ۱۸۳۱ء، طبع دوم ۱۸۴۴ء

ایس۔ اوناٹ، ''رسالہ قواعدِ اردو'' تشریح و اضافہ از ڈنکن فاربس، ۱۸۴۴ء

جیمس آر بالن ٹائن، ''ہندوستانی گریمر''، ۱۸۴۴ء، طبع دوم ۱۸۶۸ء

ریورنڈ جی۔ سمال، ''ہندوستانی گریمر''، ۱۸۴۷ء، طبع دوم ۱۸۵۸ء

کاٹن ماتھر، ''ہندوستانی قواعد''، ۱۸۶۲ء

جان ڈاسن، ''ہندوستانی گریمر''، ۱۸۷۲ء

جان پلیٹ، ''قواعدِ اردو''، ۱۸۷۴ء

پامر، ''ہندوستانی، فارسی و عربی قواعد''، ۱۸۸۲ء

ڈبلیو، کیگر، ''قواعد ہندوستانی''، ۱۸۸۳ء

فان کیون، ''قواعد ہندوستانی''، ۱۸۸۳ء

جے۔ ولسن، ''اردو گریمر''، ۱۸۸۲ء

اے۔ سی۔ ڈل، ''ہندوستانی گریمر''، ۱۸۹۳ء

شلر، ''ہندوستانی گریمر''، ۱۸۹۴ء

درج بالا تصانیف کے عنوانات ظاہر کرتے ہیں، ۱۸۹۴ء تک آتے آتے بھی غیر ملکی محققین کی اکثریت ''اُردو'' زبان کے نام سے زیادہ نا آشنا تھے اور ہندوستان کی زبان ہونے کے ناطے اسے ''ہندوستانی'' کے نام سے ہی جانتے اور بیان کرتے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود بعض مستشرقین اسے ''اردو'' کے نام سے جانتے اور بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۱۸ء میں جان شیکسپیئر نے، ۱۸۳۱ء میں اسٹیفورڈ ارناٹ، ۱۸۷۴ء میں جان پلیٹ اور ۱۸۸۲ء میں جے۔ ولسن نے اپنی تصانیف کے عنوانات ''اردو'' کی بنیاد پر ہی قائم کیے ہیں۔

اگرچہ مستشرقین کی خدمات بیسویں صدی کے آغاز تک آتے آتے کافی ماند پڑ چکی تھیں، تاہم مستشرقین کی لسانی خدمات کے بارے میں ایک اور تصنیف بھی شاملِ تحقیق کیے جانے کے قابل ہے جو آٹو یسپرسن (Otto Jesperson) نے ۱۹۲۲ء میں تحریر کی۔ یہ تصنیف اگرچہ اردو زبان سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتی، تاہم اس میں جہاں دیگر زبانوں کے ماخذ اور ترقی کے بارے میں بیان ملتا ہے، وہاں ہندوستانی زبانوں کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔ اس تصنیف کا نام "Language: It's Nature, Development & Origin" ہے، جس میں یسپرسن بیان کرتے ہیں:

> "First, as regards the purely phonetic side of language, we observe everywhere the tendency to make pronuciation more easy, so as to lesson the muscular efforts; difficult combinations of sounds are discarded, those only being retained which are pronounced with ease. Modern research has shown that the Proto-Aryan sound system was much more complicated than was imagined in reconstruction."[۲۳]

یعنی سب سے پہلے زبان کو خاص طور پر صوتیات کے حوالے سے تلفظ کو زیادہ آسان بنانا چاہیے۔ اعضائے صوت کی کوششوں سے مختلف آوازوں کو ملا کر ادا کیا جائے تا کہ تلفظ آسان ہو سکے۔ جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ پروٹو آرین زبانوں کا صوتی نظام زیادہ پیچیدہ ہے جب ان کی تشکیل تصور کی جاتی ہے۔

اس بیان کے حوالے سے مزید تشریح کرتے ہوئے جب مستشرقین کی لسانی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کا

علم ہوتا ہے کہ مستشرقین کی زیادہ تر خدمات ہندوستانی یا اردو کے قواعد اور گرامر سے متعلق ہیں جن کا بنیادی مقصد غیر ملکیوں خاص طور پر اپنے ملک کے باشندوں یعنی حاکم قوم کے افراد کو برصغیر کے ہر گوشے میں سمجھے جانی والی زبان یعنی ''اردو'' سے آشنائی دلا کر یہاں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مدد ملے۔ اس لیے یسپرسن لسانی حوالے سے خاص طور پر صوتیاتی سطح پر زبان کو آسان بنانے کی بات کرتے ہیں اور ساتھ ہی آریائی یعنی برصغیر کی زبانوں کی تشکیل کو مشکل تر قرار دیتے ہیں۔ اگر اردو کو برصغیر کی مقامی زبان تسلیم کر لیا جائے تو یہ طے ہے کہ ''اُردو'' مشکل ترین زبان ہے کیونکہ اس کے قواعد و انشا کے ہر حصے کو جاننے اور اظہار کا جامہ پہنانے کے لیے علیحدہ علیحدہ قواعد ہیں چنانچہ اسماء کی تشکیل، واحد جمع، تذکیر و تانیث اور دیگر ہر حوالے سے یہ اپنی بنیادی زبانوں یعنی عربی، فارسی، ترکی سے زیادہ دقیق اور پیچیدہ طریق پر ڈھلتی ہے۔

اردو قواعد پر سب سے پہلے مستشرقین نے اس لیے کام کا آغاز کیا کیونکہ غیر ملکیوں کو دوسری زبان سمجھنے کے لیے قواعد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اہلِ زبان کو اس کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اردو لغات پر کام بھی سب سے پہلے مستشرقین نے ہی کیا تھا کیونکہ یہ ان کی ضرورت تھی۔ انگریز اس قوم پر حکومت کرنا چاہتے تھے، اسی لیے اردو زبان کو سمجھنا چاہتے تھے۔ تاریخ کا مطالعہ اسی بات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

ہندوستانی ماہرینِ لسانیات کی خدمات:

ہندوستان کے مقامی ماہرینِ لسانیات کے کارناموں کا جائزہ لیں تو سب سے پہلا نام انشاء اللہ خان انشا کا دکھائی دیتا ہے جنھوں نے ۱۸۰۷ء میں ''دریائے لطافت'' تحریر کر کے اردو میں لسانی مباحث کا آغاز کیا۔ اگرچہ اس سے قبل میر امن نے ''باغ و بہار'' (۱۸۰۲ء) کے دیباچے میں اردو زبان کی پیدائش اور وجہ تسمیہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا:

> ''حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سُنی ہے کہ دِلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انہیں کے راجا پرجا قدیم سے رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔۔۔۔ لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار ''اردو'' کہلایا۔''[۳۴]

تاہم نہ تو ''باغ و بہار'' کی حیثیت لسانی مباحث کی ذیل میں آتی ہے اور نہ ہی اس میں پیش کردہ نظریات لسانیاتی تحقیق کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اس لیے تقدیم ''دریائے لطافت'' کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

دریائے لطافت (۱۸۰۷ء):

اہلِ زبانِ اُردو میں اردو کے لسانی مباحث کا باقاعدہ آغاز سید انشاء اللہ خاں انشا سے کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے ۱۸۰۷ء میں ''دریائے لطافت'' کے نام سے اردو میں لسانی مباحث کا آغاز کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ کتاب فارسی زبان میں وضاحتیں پیش کرتی ہے لیکن اس میں اردو لسانیات کے متعلق مباحث موجود ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق بیان کرتے ہیں:

> سید انشاء اللہ خان انشا پہلے شخص ہیں جنھوں نے عربی و فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اردو زبان کی ہیئت واصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد وضع کیے اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے تو وہاں زبان کی حیثیت کو نہیں بھولے۔''[۳۵]

درحقیقت انشا نے ایک لسانی دور کا اختتام اور ایک نئے دور کا آغاز دیکھا ہے اور اسے بڑی صحت کے ساتھ آنے والی نسلوں کو محفوظ کر دیا ہے۔ اہلِ زبان میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کی ہیئت اور اصلیت پر غور کیا ہے۔ سیّد قدرت نقوی فرماتے ہیں:

> ''سیّد انشاء اللہ خان انشا زبان کے بڑے پارکھ اور متعدد زبانوں اور بولیوں کے ماہر

> تھے۔ جس کا ثبوت ان کی متعدد تصنیفات سے ملتا ہے۔ کلیات میں تقریباً ہر زبان اور ہر بولی کے اشعار موجود ہیں۔ 'دریائے لطافت' میں اُردو کے مختلف روپ' علاقے اور لہجے کے امتیاز کے ساتھ انھوں نے پیش کیے ہیں۔ دریائے لطافت میں وہ اُردو کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں: ''بالجملہ زبان اُردو مشتمل است بر چند زبان، یعنی عربی و فارسی و ترکی و پنجابی و پوربی و برجی وغیر آں مثال مُدلّل۔'' ۵؎

میر انشاء اللہ خان انشا نے ''دریائے لطافت'' میں اردو صرف ونحو کے حوالے سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ مرزا قتیل نے علمِ عروض کے حوالے سے تحریر کیا۔ مجموعی طور پر اپنے خصائص کی بنا پر ''دریائے لطافت'' اردو لسانیات کی پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

آبِ حیات (۱۸۸۰ء):

مولانا محمد حسین آزاد کا شمار اردو زبان کے حوالے سے کسی ایک نقطۂ نظر سے اہمیت کا حامل نہیں ہے بلکہ اس کی کئی جہات ہیں۔ ان تمام جہات پر قلم اٹھانا اس مقالے اور موضوع کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ لسانی حوالے سے ان کے کام کو یہاں موضوعِ بحث بنانا ضروری ہے اور آزاد کے اس میدان میں کارہائے نمایاں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ''آبِ حیات'' آزاد کا ایسا کارنامہ ہے جس میں محض ادب کی تاریخ ہی بیان نہیں کی گئی بلکہ اردو زبان کی پیدائش اور آغاز کے متعلق مباحث اور نظریات بھی ملتے ہیں۔ ''آبِ حیات'' کی پہلی اشاعت ۱۸۸۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔ ۱۹۷۰ء میں تبسم کاشمیری نے ''آبِ حیات'' کو مرتب کر کے سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے دوبارہ اشاعت سے ہم کنار کیا۔ ''آبِ حیات'' کے ابتدائی دو ابواب جن مباحث پر مشتمل ہیں ان میں سے تاریخ زبان اردو سے بحث کرتا ہے جبکہ دوسرا باب جس کا عنوان 'برج بھاشا کا فارسی پر اثر'' ہے، اردو زبان کی تشکیل کے مباحث کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ اردو زبان کے متعلق آزاد فرماتے ہیں:

> ''ہماری زبان زبانِ الٰہی ہے اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی آئی۔ چنانچہ اس کے قواعد اور اصول باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے جن میں نقطہ کا فرق نہیں آ سکتا۔ اس کی پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبہ سمجھا اور سوا برہمن کے دوسرے کی زبان بلکہ کان تک گزرنا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے بڑا فائدہ

> یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار کا خالص نمونہ نمایاں کرتی
> رہے گی۔ برخلاف ایرانی بھائیوں کے، ان کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی۔“[۶]

مجموعی طور پر ”آبِ حیات“ تاریخ کی کتاب ہے نہ کہ لسانیات کی۔ اس میں موجود جہاں تاریخی حوالوں سے کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں، وہیں لسانی مباحث اور خاص طور پر اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے بھی بعض نقائص موجود ہیں۔ اس کے باوجود یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انشا کے بعد آزاد ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے لسانیات کے میدان میں خاطر خواہ کام کیا۔ اس حوالے سے آئندہ صفحات میں ”سخندانِ فارس“ کا مطالعہ بھی اہمیت کا حامل ہوگا۔

بحر الفصاحت (۱۸۸۵ء):

”بحر الفصاحت“ اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو ادب میں واحد مثال کا درجہ رکھتی ہے جس میں بنیادی طور پر علم بدیع و بیان کے حوالے سے مباحث شامل کیے گئے ہیں۔ حکیم نجم الغنی خاں نجمی رامپوری کی اس تالیف کا حصہ اول ۱۸۸۵ء میں منظر عام پر آیا۔ ابتدائی طور پر اس کے محض ۳۲۸ صفحات تھے جو ۱۹۱۷ء میں ۱۱۱۹ صفحات کی صورت میں دوبارہ اشاعت سے ہم کنار ہوئے۔ مارچ ۲۰۰۶ء میں ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اسے مرتب کیا تو قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی نے اسے اشاعت سے ہمکنار کیا۔ ڈاکٹر کمال صدیقی ”بحر الفصاحت“ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> ”یہ کتاب یعنی بحر الفصاحت پہلی بار رامپور کے مطبع سرورِ قیصری سے ۱۸۸۵ء میں
> شائع ہوئی تھی۔ اس وقت ۲۳۸ صفحات پر مشتمل تھی۔ دوسری بار ۱۹۱۷ء میں مطبع
> نول کشور سے شائع ہوئی تو صفحات کی تعداد ۱۱۱۹ ہوگئی۔“[۷]

”بحر الفصاحت“ کا ابتدائی مطبوعہ نسخہ میسر نہیں تاہم یہ بات طے ہے کہ علم عروض اور علم بلاغت کے حوالے سے پہلی جلد میں خاطر خواہ کام ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ”بحر الفصاحت“ میں علم المعانی اور جدید شاعری کے حوالے سے مفصل بحث ملتی ہے۔ نجم الغنی رامپوری نے نئے ادب اور نئی شاعری کے حوالے سے لطافت، بلاغت اور فصاحت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ تاہم اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ”بحر الفصاحت“ میں فنِ شاعری اور اس کے لوازم پر ہی

بحث کی ہے بلکہ انہوں نے اردو زبان اور اس کے نام کے حوالے سے بھی اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ اردو کے نام کے حوالے سے وہ رقم طراز ہیں:

> ''جب ۱۰۵۵ء، میں نسل تیموریہ کے پانچویں تاجدارِ ہند شاہجہان نے نیا شہر شاہجہان آباد، آباد کیا، قلعہ معلّیٰ، جامع مسجد اور شہر پناہ کو تعمیر کرایا۔ نواب علی مردان خاں نہر لایا، بادشاہ نے جشن فرمایا، شہر کو دار الخلافت قرار دیا۔۔۔۔ چند روز کے بعد ایک نئی زبان جس کو اب اردو کہتے ہیں ہو گئی۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں اور یہ زبان اردوئے شاہی سے نکلی ہے۔ پس کثرتِ استعمال سے خود زبان کو بھی اردو کہنے لگے۔ اور اردو روزمرہ شہر دہلی کا نام ہو گیا۔ یہ صرف شاہجہان کا اقبال ہے کہ یہ زبان اس کی اردو کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔''[۴۸]

''بحر الفصاحت'' کی ضرورت و اہمیت کے پیشِ نظر اسے مجلس ترقی ادب، لاہور نے بھی ۱۹۹۹ء میں شائع کرنا شروع کیا اور ۲۰۰۷ء میں اس کی تمام جلدوں کی اشاعت تکمیل کو پہنچی۔ اس کا پہلا حصہ سید قدرت نقوی نے مرتب کیا جو خود بھی لسانیات کے میدان میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> ''مولوی نجم الغنی رام پوری کی یہ تصنیف تمام مباحث پر محیط ہے۔ اردو قدیم زبان ہے جسے ہندی، ہندوی و زبانِ ہندوستان کہا جاتا تھا۔ دراصل کھڑی بولی ہے۔ ابتدا اسی بولی سے ہوتی ہے۔ بعد میں عربی فارسی کی پیوندکاری ہوئی۔''[۴۹]

اگرچہ یہ بیان سید قدرت نقوی کا ہے، لیکن ''بحر الفصاحت'' کے دیباچے میں شامل ہونے کی وجہ سے اسی کا حصہ بن گیا ہے۔ یوں ''بحر الفصاحت'' کی پہلی جلد کی ہر اشاعت اپنے اندر کچھ لسانی مباحث کو سموئے ہوئے ہیں۔ دوسری جلد میں علم بیان اور علم بدیع پر مضامین شامل ہیں۔ جلد سوم میں علم قافیہ، ردیف، بیان، قیدا ور قافیہ و ردیف کی اقسام، جلد چہارم میں علم فصاحت و بلاغت کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح دیگر جلدیں بھی علم بدیع و بیان کے مختلف گوشوں اور زاویوں پر بحث کرتی دکھائی دیتی ہے۔ گویا ''بحر الفصاحت'' اگرچہ بلاواسطہ لسانیات سے تعلق نہیں رکھتی تاہم، اس کے تمام اجزاء زبان بالخصوص اردو زبان کے حوالے سے اس لیے اہم ہیں کیونکہ ان کی مدد سے زبان کو صاف، شستہ، فصیح اور بلیغ بنا کر بہتر الفاظ و محاورات کا استعمال کیا جاتا ہے۔

سخندانِ فارس (۱۸۸۷ء):

مولانا محمد حسین آزاد کی شہرہ آفاق تصنیف ''سخندانِ فارس'' ۱۸۸۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ دراصل مولانا محمد حسین آزاد کے گیارہ لیکچروں کا مجموعہ ہے اور اردو زبان و ادب خاص طور پر لسانیات کے طالب علموں کے لیے ایک مفید کتاب ہے۔ اس ضمن میں وہ بیان کرتے ہیں:

> ''اس میں اردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر یعنی لسانی رشتے، ایک زبان، ہندی اور ایران، ایک خاندان، دو فلسفی لغت، سر ولیم جونس وغیرہ موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔''[۵۰]

''سخندانِ فارس'' کا پہلا لیکچر ''فیلالوجیا'' لغات اور زبانوں کی فلسفی تحقیقات کے اصول کے بارے میں ہے جو لسانیات کے طالب علم کے لیے انتہائی اہم ہے۔ اردو زبان پر بحث کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

> ''ہماری زبان زبانِ الٰہی ہے اور الٰہی عہد سے اس طرح چلی آئی ہے۔ چنانچہ اس کے قواعد اور اصول باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے جن میں نقطہ کا فرق نہیں آ سکتا۔ اس کی پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبہ سمجھا اور سوا براہمن کے دوسرے کی زبان بلکہ کان تک گزرنا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے بڑا فائدہ یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہے گی۔ برخلاف ایرانی بھائیوں کے ان کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی۔''[۵۱]

اب بھی کہا جاتا ہے کہ لسانیات علمِ جدید ہے تو محمد حسین آزاد نے جیسے اردو نظم اور شاعری کو جدید بنایا تھا، اس طرح انہوں نے لسانیات کے حوالے سے بحثیں بھی کی ہیں۔ انہوں نے اس وقت کے مطابق زبانوں کے مطالعے کے لیے ''فلولوجی'' کا لفظ استعمال کیا جو زبان کی تاریخ اور خاص طور پر علمِ زبان کا علم ہے جبکہ لسانیات نے اب اور بھی ترقی کر لی ہے۔ اس میں تاریخی، توضیحی، تقابلی لسانیات اور اس کی بہت سی شاخیں جن میں صوتیات، فونیمیات یا فونولوجی اور علمِ نحو و صرف وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے۔ نوم چومسکی (Syntictic Structure) نے علمِ نحو اور صرف کو ریاضیات کی طرح تکنیکی مضمون بنا دیا ہے۔ لسانیات پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں اس زبان کے فلسفہ کو مد نظر رکھتے ہوئے بات کرنی ہوتی ہے۔ اس طرح لسانیات کا فلسفہ اور نفسیات سے بھی رشتہ مربوط ہے۔ چنانچہ

آزاد نے ۱۸۸۷ء میں ہی لسانیات یعنی زبان کی بناوٹ کے حوالے سے لیکچر دیا تھا۔ ’’فلسفۃ اللسان‘‘ پر بحث کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

> ’’یہ ایک قدیمی فن فلاسفۂ یونان کا ہے۔ اس سے مختلف زبانوں کی اصلیں اور ان کا تعلق ایک دوسرے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ عرب اور فارس جہاں سے پہلے ہمیں علوم کے ذخیرے ملے، ان میں اس کے اصول وفروغ کا پھیلاؤ بہت نہیں ہوا اور جس قدر رہوا، گم ہوگیا۔ اب جو کچھ ہے انگریزی میں ہے۔ وہ اسے ’’فلولوجی‘‘ کہتے ہیں لیکن اگر کوئی رسالہ اس کا ترجمہ ہو تو امید نہیں کہ ہم وطن بھائیوں کا دل روشن کر سکے کیونکہ انگریزی کے مصنف کئی کئی زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ ہر زبان کی طاقت اس میں خرچ کر دیتے ہیں اور انگریزی، یونانی، لاطینی، عبرانی وغیرہ پر بنیاد رکھتے ہیں۔‘‘ [۵۲]

مجموعی طور ’’سخندانِ فارس‘‘ اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے ابتدائی عہد کی اہم کتاب بن جاتی ہے جس کی مدد سے اردو دان طبقہ مغربی لسانی مباحث ونظریات سے روشناس ہوا۔ اس حوالے سے سید اعجاز حسین کا بیان ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق:

> ’’تیسرا نیا میدان جو آزاد نے اردو والوں کو دکھایا، وہ علم السنہ یا فیلالوجی کا تھا جس میں علاوہ اور باتوں کے الفاظ کی پیداوار، ترقی، تغیر کا ڈھنگ بتایا ہے۔ اس کتاب کا نام ’’سخندانِ فارس‘‘ ہے۔‘‘ [۵۳]

دکن میں اُردو (۱۹۲۳ء):

مولوی نصیر الدین ہاشمی حیدر آباد کے ایک ممتاز ادیب، محقق اور ماہر دکنیات تھے۔ ان کی گرانقدر تحقیقات، تالیفات اور تصنیفات کو اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں اور اہم مقام حاصل ہے۔ دکن اور دکنیات ان کی زندگی کا اہم موضوع تھا۔ انہوں نے تاریخ وتنقید ادب، قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستیں، تاریخ وسوانح، نسوانیات اور دیگر فنون پر بہت کام کیا۔ اس حوالے سے ان کی علمی، ادبی، لسانی، تاریخی، مذہبی اور تحقیقی خدمات اردو ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔ تاہم ان کی شہرت کا اصل مدار اُن کی پہلی تصنیف ’’دکن میں اُردو‘‘ پر ہے جو

۱۹۲۳ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس تصنیف میں جنوبی ہند یعنی دکن کے تمام علاقوں کی اُردو کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے متعدد ایڈیشن ۱۹۲۶ء (مکتبہ ابراہیمیہ: حیدر آباد)، ۱۹۳۶ء (مکتبہ ابراہیمیہ: حیدر آباد)، ۱۹۵۲ء (مکتبہ معین الادب: لاہور)، ۱۹۶۰ء (اردو مرکز: لاہور) میں منظر عام پر آئے۔ ''دکن میں اُردو'' کا چھٹا ایڈیشن نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا جس میں ''آندھرا میں اُردو'' کا اضافہ بھی شامل تھا۔ بعد ازاں بھی اس کے متعدد ایڈیشن میں اشاعت پذیر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

''دکن میں اُردو'' کا آغاز جنوبی ہند میں اُردو کی ابتدا اور اس کی ترقی کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اگر اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کی پہلی کتاب کہلائے جانے کی حقدار ہے۔ اس میں خاص طور پر دکن میں اردو کے آغاز و ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی۔ اس کا اولین ایڈیشن انتہائی مختصر یعنی ۱۸۰ صفحات پر مشتمل تھا جو آٹھویں ایڈیشن تک پہنچتے ہوئے ۹۴۵ صفحات تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آبِ حیات'' سے قطع نظر کیا جائے تو یہ اردو ادب کی پہلی باقاعدہ کتاب مانی جاتی ہے۔ لسانی حوالے سے اس میں خاص طور پر دکن میں اردو کی ابتدا کا تذکرہ مدلل انداز میں ملتا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اردو زبان کے متعلق گزشتہ بیان کردہ دلائل و براہین کے برعکس اردو کا اولین مسکن دکن کو قرار دیا۔ ان کے مطابق دکن ہی وہ ابتدائی مقام ہے جہاں سے اردو زبان کی پیدائش کا سراغ ملتا ہے جو بعد ازاں نشوونما پاتے پاتے اور ترقی کے مراحل طے کرتے کرتے جنوبی پنجاب چلی گئی۔ یہیں پر اردو کی جدید ترین صورت واضح ہو کر سامنے آئی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شمال کے فاتحین نے جب ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کر لی تو یہ نئی زبان بھی اپنے ساتھ لائے۔ اس سرزمین برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی ریختہ ہونے نہیں پائی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رخ کیا۔''[۵۴]

اردو کے اسالیبِ بیان (۱۹۲۷ء):

سید محی الدین قادری زور نے ''اردو کے اسالیبِ بیان'' ۱۹۲۷ء میں پہلی دفعہ کتابی صورت میں شائع کی۔ اس وقت آپ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر اردو اور پرنسپل دار العلوم کالج و معتمد اعزازی ادارہ ادبیات اردو حیدر

آباد (دکن) میں تھے۔ پروفیسر زور نے اس تصنیف میں اردو زبان میں نثر کے ابتدائی کارنامے، دکن میں اردو نثر کی نشوونما، شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی مراحل اور فورٹ ولیم کالج کی نثری کوششوں کے حوالے سے تفاصیل بیان کی ہیں۔ اس کے بعد سرسید اور ان کے ہم عصر نثر نگار، انشا پردازی کے کارنامے اور اردو نثر کا مستقبل جیسے مضامین پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ محی الدین زور نے ہر دور کے اسلوب پر بحث کرتے ہوئے امثال سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ”نواب آصف الدولہ ۱۷۹۸ء کے دور میں اردو کے دو اہم کارنامے قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا ”ترجمہ قرآن مجید“ اور دوسرا انشاء اللہ خان انشا کی کتاب ”دریائے لطافت“ ہے اس میں نثرِ اردو کے اسالیبِ بیان کی ارتقائی تاریخ نہایت اہم ہے۔ شمالی ہند میں نثر اس وقت تک جس حالت کو پہنچ چکی تھی، اس کا کماحقہٗ اندازہ ”دریائے لطافت“ کی ان عبارتوں سے ہوسکتا ہے جو بطور مثال پیش کی گئی ہیں۔“[۵۵]

مجموعی طور ”اردو کے اسالیبِ بیان“ اردو نثر کی تاریخ پر مشتمل کتاب ہے جس میں اردو نثر کے آغاز اور ارتقا کے ساتھ ساتھ اہم نثر نگاروں کی خدمات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

پنجاب میں اُردو (۱۹۲۸ء):

حافظ محمود شیرانی کا شمار اردو کے محققین کی فہرست میں سب سے پہلے رکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کی تحقیقی، تدوینی، تنقیدی خدمات کے ساتھ ساتھ لسانیات کے حوالے سے خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اس حوالے سے ان کا بڑا کارنامہ ”پنجاب میں اُردو“ ہے۔ یہ کتاب انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل علامہ عبداللہ یوسف علی کے ایما پر ایک گروہ کے ساتھ مل کر تحریر کی تھی۔ اُن دنوں وہ اسلامیہ کالج لاہور میں بطور لیکچرار اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس کتاب کی اولین اشاعت ۱۹۲۸ء میں اسلامیہ کالج کی انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کی گئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق:

> ”حافظ صاحب اس کی اولین اشاعت سے مطمئن نہ تھے اور اسے ازسرِ نو لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پہلے ایڈیشن کے بعد بھی وہ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کام کرتے

> رہے۔ بعض مباحث پر انہوں نے الگ الگ مقالات کی صورت میں تفصیل سے لکھا بھی اور اپنی کتاب کے بعض بیانات میں ترمیم و تنسیخ کر دی۔''۵۶

اس بیان کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حافظ محمود شیرانی کی یہ تصنیف اُن کے نظریہ کے سلسلے میں حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ انہوں نے اس کے بعد اس موضوع پر لکھتے ہوئے اپنے نظریات میں ترمیم و تنسیخ کی۔ علاوہ ازیں ان کے بعد اردو زبان کے نظریات کے سلسلے میں جو کتب تحریر کی گئیں، ان میں بھی حافظ محمود شیرانی کے نظریہ کی اپنے اپنے انداز میں تشریح و توضیح یا تردید و تنسیخ کی گئی ہے۔ حافظ محمود شیرانی اپنی تصنیف میں پنجابی اور اُردو کا تعلق ماں بیٹی کا لکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ماں کبھی ڈاین نہیں ہو سکتی کہ بیٹی کو کھا جائے۔ اس طرح اُردو اور پنجابی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

''پنجاب میں اُردو'' بھی نصیر الدین ہاشمی کی ''دکن میں اُردو'' کی طرح اردو زبان و ادب کی تاریخ ہی ہے، تاہم اس میں دکن کے برعکس پنجاب کو اردو زبان کا مقامِ پیدائش ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا تعلق پنجابی کے ساتھ جوڑا گیا ہے اور پنجابی کو اردو کی ماں قرار دیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اردو کی پیدائش کے بعد اس زبان پر پنجاب کے ہونے والے اثرات کا تذکرہ اور برج بھاشا سے اردو کے تعلق کی حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق اس نظریہ کو باطل قرار دیا گیا ہے کہ ''اردو برج بھاشا کی بیٹی ہے۔'' چنانچہ پنجاب کے حوالے سے وہ بیان کرتے ہیں:

> ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔''۵۷

وضعِ اصطلاحات (۱۹۲۹ء):

مولانا وحید الدین سلیم کی تصنیف ''وضعِ اصطلاحات'' پہلی بار ۱۹۲۹ء میں اشاعت سے ہم کنار ہوئی۔ ''وضعِ اصطلاحات'' اردو زبان کے لسانی مسائل اور ان مسائل کے حل کے حوالے سے ایک اہم کاوش ہے۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے اس تصنیف میں اردو میں اصطلاح سازی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اصطلاح سازی کی ضرورت و اہمیت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا تذکرہ بھی بخوبی کیا ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے مضامین کا تعلق ہے تو اس میں محض اصطلاح سازی پر ہی قلم نہیں اٹھایا گیا بلکہ لسانی مباحث کے حوالے سے اردو زبان کے خاندانِ لسنہ اور آریائی زبانوں پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں دیگر مضامین میں انگریزی زبان کے سابقے، اردو سابقے، لاحقے، مصادر، فارسی زبان کے مصادر، اردو کے جدید مصادر، نیم سابقے، نیم لاحقے اور مرکب اصطلاحیں شامل ہیں۔ اردو، عربی، فارسی زبانوں میں مصادر کی اہمیت لفظ کی بناوٹ اور استعمال کے حوالے سے بہت زیادہ ہے۔ ۳۲۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اردو مصادر کے حوالے سے مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی بیان کرتے ہیں:

> ”اردو میں مصادر کی دو بڑی قسمیں ہیں:
>
> اول وہ مصادر جو آواز سے بنائے گئے ہیں۔
>
> دوم وہ مصادر جو عام الفاظ سے بنائے گئے ہیں۔
>
> پہلی بڑی قسم کے مصادر تین چھوٹی قسموں میں منقسم ہوتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:
>
> (ا) وہ مصادر جن میں آواز مکرر رہے جیسے بلبلانا۔
>
> (ب) وہ مصادر جن میں دوسری آواز پہلی آواز سے کسی قدر مختلف ہے جیسے کلبلانا۔
>
> (ج) وہ مصادر جن میں آواز مکرر نہیں جیسے چھینکنا۔“[۵۸]

اسی طرح مزید بحث کرتے ہوئے مولانا وحید الدین نے اس تصنیف میں آوازوں کے حوالے سے مصادر کی تشکیل، ترتیب اور تقسیم کے حوالے سے اہم مباحث پیش کرتے ہوئے اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔

مولانا وحید الدین سلیم کی لسانی خدمات محض اس ایک کتاب میں مضمر نہیں ہیں۔ ”افاداتِ سلیم“ بھی اس حوالے سے قابلِ ذکر ہے جس میں انہوں نے اردو زبان و لسانیات کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے لسانی مباحث میں قابلِ قدر اضافہ کیا تھا۔ اس میں انہوں نے اردو کی اہمیت جتاتے ہوئے اسے ہندی کے مقابلے میں ہندوستان کی عام زبان قرار دیا تھا۔ اسی طرح قواعد کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے سابقوں، لاحقوں پر بحث بھی کی ہے جبکہ لسانیات کے میدان سے نکلتے ہوئے اردو ادب کی طرف بھی توجہ کی ہے اور عہدِ میر کی زبان، دکن میں ایک رباعی گو شاعر، تلمیحات، عرب کی شاعری اور اردو شاعری کا مطالعہ جیسے مضامین پیش کیے ہیں۔ تاہم اس

مضامین کا مطالعہ بھی یہی باور کراتا ہے کہ ادب کی آڑ میں لسانیات پر ہی بحث کی گئی ہے۔ ''افاداتِ سلیم'' کی اہمیت اس حوالے سے مزید بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہندوستان کے تمام لوگوں یعنی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی زبان تجویز کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ہماری آنے والی قوم کا نام ''ہندلمان'' ہوگا۔ ہندلمانیت کی تحریک کو سرسبز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر قوم رفتہ رفتہ اپنی اخلاقی باتوں سے قدم ہٹاتی جائے اور مشترکہ باتوں کو اختیار کرتی جائے۔ دونوں قوموں کے راہنماؤں نے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لی ہے کہ آئندہ زمانے میں ان ملکی قوموں سے کوئی قوم تنہا ہندوستان کی مالک نہیں ہوسکتی۔ تمام ہندوستان کی نجات بلحاظ سیاسی محور کے نہ ہندویت میں ہے نہ مسلمانیت میں۔ اب اسی ہندلمانیت کی روشنی میں عام زبان کے مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔''[۵۹]

گویا یہ نظریات بنیادی طور پر ہند مسلم اتحاد کی عکاسی کرتے ہیں جس کی رو میں ان کے عصری سیاستدان بھی بہہ رہے تھے۔ اگرچہ مولانا کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا اور ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم ہو جانا پڑا، تاہم اس کتاب کی لسانی اہمیت آج بھی برقرار دکھائی دیتی ہے۔

تاریخِ ادبِ اُردو (۱۹۲۹ء):

رام بابو سکسینہ کی تصنیف ''تاریخِ ادبِ اُردو'' درحقیقت انگریزی میں تحریر کی گئی اور ۱۵ فروری ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی جس کا ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا۔ ۷۳۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا آغاز اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ہے۔ گویا یہ اردو زبان و ادب کی تاریخوں کا خاصا ہے کہ ہر تاریخ کی ابتدا زبان کی اصلیت اور پیدائش کے مباحث سے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے تواریخ کو لسانیات کے زمرے میں رکھا اور شامل کیا جاتا ہے۔ رام بابو سکسینہ کی ''تاریخِ ادبِ اردو'' اگرچہ تاریخِ اردو میں ایک حوالے کی کتاب مانی جاتی ہے تاہم اس کی اصل انگریزی ہے جس میں انہوں نے ''آبِ حیات'' کے متعلق بیان کیا ہے کہ آزاد نے اس تصنیف میں جانبداری سے کام لیا ہے۔ اس تصنیف کی اہمیت لسانی حوالے سے محض اس قدر ہے کہ اس میں اردو زبان کی پیدائش کے متعلق کچھ مواد مل جاتا ہے۔ چنانچہ ''اردو زبان'' کے متعلق وہ بیان کرتے ہیں:

> ''قدیم انگریزی مورخ جنہوں نے ہندوستان کے حالات لکھے ہیں، اردو کو لفظ ''اندوستان'' سے تعبیر کرتے تھے۔ شروع اٹھارویں صدی کے مصنفوں نے زبان لاطینی میں اس کو ''لنگو اندوستانیکا'' لکھا ہے۔ اس سے بھی پہلے کے انگریز مورخین اس کو ''مورز'' کہتے تھے۔ جان گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں سب سے پہلے لفظ ''ہندوستانی'' زبانِ اردو کے واسطے استعمال کیا اور جبھی سے یہ لفظ مروج ہوگیا۔''[۲۰]

ہندوستانی صوتیات (۱۹۳۰ء):

ہندوستان کی زبانوں کا مطالعہ کسی بھی خطے میں بولی جانے والی زبانوں سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہاں نہ صرف ہر علاقے سے ایک خاص زبان مخصوص ہے بلکہ زبانوں کی کئی بنیادی اقسام سے وابستہ زبانیں بھی پائی جاتی ہیں۔ تاہم ہندوستان کی ان صوتی خصوصیات کے حوالے سے کچھ خاص کام دکھائی نہیں دیتا۔ اس طرح اگر ہندوستان میں ماہرین لسانیات کی فہرست تیار کی جائے تو اہم نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور انہی ناموں میں سے ایک ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا ہے۔ انہوں نے یورپ میں چار تعلیمی برسوں کے دوران ۱۹۲۷ء میں اردو کے آغاز و ارتقا کے حوالے مقالہ قلمبند کیا۔ اس مقالے کے تصنیف کے دوران انہیں پروفیسر آر۔ ایل ٹرنر کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر گراہم بیلی جیسے ماہرِ اردو زبان کی ہدایات بھی ملتی رہیں۔ صرف یہی نہیں انہوں نے فرانس کے تحقیقی و علمی اداروں سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جیولس بلوک (رکن ادارۂ تحقیقات عالیہ پیروس یونیورسٹی) کے لیکچرز کی مدد سے ''اردو کی گجراتی شکل'' پر ڈی۔ لٹ کا کام شروع کیا جو ادھورا رہ گیا۔ بعد ازاں مشہور ماہرِ لسانیات پروفیسر واندریس اور فارسی، عربی، سنسکرت جیسی زبانوں کے ماہر پروفیسر بن وے نست (رکن ادارۂ تحقیقات عالیہ پیروس یونیورسٹی)، پروفیسر مسی بون (پروفیسر عربی قومی مدرسہ السنہ مشرقیہ) اور پروفیسر سلون لیوی (پروفیسر سنسکرت، کالج دے فرانس) کے لیکچرز اور مشوروں سے استفادہ کرتے ہوئے اردو کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کے لسانی عناصر کے تجربے سے علمی بصیرت حاصل کی۔ انہی تمام افراد کی زیرنگرانی اپنی تالیف Hindustani Phonetics کا خاکہ تیار کیا جسے اردو میں ''ہندوستانی صوتیات'' کہا جاتا ہے۔ تاہم اس کا اردو ترجمہ دستیاب نہیں ہوسکا البتہ اس کے ایک اقتباس کا عکس پروفیسر مغنی تبسم کے مقالے ''ڈاکٹر سید محی

الدین قادری زور: حیات، شخصیت اور کارنامے“ سے حاصل ہوا ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف ”پنجاب میں اردو“ (مطبوعہ ۱۹۲۸ء) میں لفظی اور صوتی تغیرات کے لحاظ سے اردو اور جدید پنجابی میں گہرا ربط ثابت کیا تھا تاہم ڈاکٹر زور نے شیرانی سے بھی آگے بڑھ کر نواحِ دہلی اور دوآبہ گنگا جمنا میں بولی جانے والی زبان کا اثر بھی اردو پر ثابت کیا۔ ”ہندوستانی صوتیات“ میں وہ بیان کرتے ہیں:

> ”اردو کی بنیاد بارہویں صدی عیسوی میں بولی جانے والی زبان پر ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اردو نواحِ دہلی اور دوآبہ گنگا جمنا میں بولی جانے والی زبان پر مبنی نہیں ہے۔ کیوں کہ ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔“[۶۱]

اس حوالے سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے جدید ترین آلات اور بہترین ماہرینِ لسانیات کی مدد سے اردو میں اہم لسانی مباحث کا اضافہ کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم بیان کرتے ہیں:

> ”ڈاکٹر زور کے بعد تقابلی اور تاریخی لسانیات میں ہم نے بہت کچھ ترقی کر لی۔ صوتیات میں پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر گیان چند جین نے اپنے اپنے طور پر کام کیا ہے مبسوط انداز میں۔ تاہم (Hindustani Phoenetics) سے بہتر کتاب اب تک پیش نہیں کی جا سکی۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کتاب سے حوالہ جاتی کا کام لیا جاتا ہے۔ سنیتی کمار چیٹر جی جیسے ماہر لسانیات نے بھی اس سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے۔“[۶۲]

سرگذشتِ الفاظ (۱۹۳۲ء):

احمد دین بی۔ اے نامی وکیل نے ۱۹۳۲ء میں ”سرگذشتِ الفاظ“ کے عنوان سے ایک کتاب شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور کے زیر اہتمام شائع کی۔ اس کتاب کا آغاز مولانا محمد حسین آزاد کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ ”سرگذشتِ الفاظ“ باقاعدہ طور پر لسانی مباحث کی ذیل میں نہیں آتی، لیکن اس کا تعلق لسانیات

سے ضرور ہے جس کا اظہار اس کے عنوان سے ہوتا ہے کہ اس میں الفاظ کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ لفظ سے ہی زبان کا پتہ چلتا ہے اور اسی زبان کی بدولت انسان اپنے مطالب کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح صرف و نحو زبان کی منطق ہے۔ ایک زبان میں دوسری زبان کے الفاظ کے داخلہ کے متعلق مولوی احمد دین بی۔ اے بیان کرتے ہیں:

> ”جب کسی زبان کا علم ادب تیار ہوتا ہے، مصنفین جو مختلف غیر زبانوں سے واقف ہوتے ہیں، ان زبانوں کے الفاظ لے لیتے ہیں۔ اگرچہ ان الفاظ کی ایسی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ استعمال بسا اوقات شوکت و شان یا اپنی علمیت دکھانے کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اظہار خیالات کے واسطے۔ بعض دفعہ اپنی زبان میں کافی لفظ ہوتے ہوئے بھی نئے لفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔“[۴۳]

یہ بحث خالصتاً لسانیات کا موضوع ہے جس پر احمد دین نے خوب بحث کی ہے۔ اس طرح اپنے چند مباحث کی بنیاد پر ”سرگذشتِ الفاظ“ کو لسانی مباحث کی ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستانی لسانیات (۱۹۳۲ء):

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نام ماہرینِ لسانیات کی صفِ اول میں لیا جاتا ہے۔ انہوں نے ”ہندوستانی لسانیات“ کے عنوان سے ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۲ء میں کتاب شائع کر کے اردو میں لسانی مباحث میں نہ صرف گرانقدر اضافہ کیا۔ ”ہندوستانی لسانیات“ کا دیباچہ عبدالستار صدیقی نے ۴ر ستمبر ۱۹۳۲ء میں الہ آباد سے تحریر کیا تھا۔ اس تصنیف میں مختصر مگر جامع انداز میں لسانیات کی تعریف، زبان کی پیدائش، ارتقا، ہندوستانی زبانوں اور اردو کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

”ہندوستانی لسانیات“ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جو لسانیات، زبان، فطری ارتقا، ارادی تشکیل، دنیا کی زبانیں، ہند آریائی ارتقا، جدید ہند آریائی زبانیں، ہند کی غیر آریائی زبانیں کے عنوانات سے قائم ہیں۔ دوسرا حصہ پانچ ابواب یعنی ہندوستانی کا آغاز، ہندوستانی کا ارتقا، ادبی بولیاں، ہندوستان کی ہمہ گیری، عہدِ حاضر پر مشتمل ہے۔ کتاب کے اختتام پر مآخذ اور اشاریہ بھی شامل ہے۔

درج بالا ابواب بندی کے علاوہ ”ہندوستانی لسانیات“ کے آغاز میں تمہید کے عنوان سے ڈاکٹر

محی الدین قادری زور کا تحریر کردہ تعارف بھی شامل ہے جس میں حافظ محمود شیرانی کی تصنیف ’’پنجاب میں اُردو‘‘ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اردو زبان کے آغاز و ارتقا سے متعلق نظریات بیان کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر زور کا نظریہ یہ ہے کہ اردو نہ برج بھاشا سے نکلی ہے اور نہ برج بھاشا کا نام ہندی ہے۔ اُن کے مطابق ہندی اردو کی جدید ترین شاخ ہے جو فورٹ ولیم کالج کے قیام (انیسویں صدی کے آغاز) کے بعد دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے لگی اور اس پر عربی فارسی کی نسبت برج بھاشا اور سنسکرت کا اثر زیادہ ہے۔ گویا ڈاکٹر زور نے حافظ محمود شیرانی کے طویل و مدلل نظریے کے مقابل اردو زبان کے آغاز و ارتقا سے متعلق اپنا مختصر نظریہ پیش کیا۔ بعد ازاں اسی نظریے کے تتبع میں ’’ہندوستانی لسانیات‘‘ کے دونوں حصے تحریر کرتے ہوئے تاریخی اور لسانی مآخذ بیان کیے ہیں۔ تاہم اس سے قبل وہ ’’لسانیات‘‘ کے موضوع سے بحث کرتے ہوئے اس کے مقاصد، فوائد اور تاریخ بھی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لسانیات کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی مدد سے ’’زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقا، زندگی اور وفات کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ جان پیل کا حوالہ دیتے ڈاکٹر زور بیان کرتے ہیں:

> ’’جان پیل نے ۱۸۷۷ء میں لکھا تھا کہ جس طرح کوئی ماہر نباتات پھولوں کا تجزیہ کرتا ہے، اس طرح ماہر لسانیات لفظوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ کن اجزا سے مرکب ہیں۔‘‘[۱۴]

آگے چل کر ڈاکٹر زور بیان کرتے ہیں:

> ’’لسانیات ایک جدید علم سمجھا جاتا ہے جو انیسویں صدی کی پیداوار ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ نہایت قدیم علم ہے۔ جس پر یونان قدیم روما اور اسکندریہ میں کامیاب غور و خوض کیا جا چکا ہے۔‘‘[۱۵]

گویا ڈاکٹر زور نے اس ضمن میں لسانیات کی تاریخی اہمیت بھی باور کر دی ہے۔ دراصل بیسویں صدی کے آغاز میں جہاں دیگر علوم یورپ اور برطانیہ کے راستے اور انگریزی زبان کی وساطت سے برصغیر تک پہنچے، ان میں علم لسانیات بھی شامل ہے۔ برصغیر میں چونکہ کسی علم کی مکمل تاریخ نہیں پہنچتی تھی، اس لیے قارئین کی نظر بہت پیچھے تک نہیں جاتی تھی اور ہر علم کے متعلق یہی کہا جاتا تھا کہ اس کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ چنانچہ لسانیات کے متعلق بھی یہی سمجھا گیا کہ یہ علم انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ ڈاکٹر زور نے ماضی کی پرتیں کھولتے ہوئے اس کی

حقیقت کو بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ مزید بیان کرتے ہیں:

> ''تقابلی لسانیات کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب سے یونانی اور لاطینی زبانوں کا ایک مشترک ماخذ قرار دینے کے خیالات یورپ کے علما میں بار بار پیدا ہوئے اور اس اکثر یہ بات ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں کہ ان کا ماخذ عربی زبان ہے۔ آخر کار ایک انگریز فاضل جونس نے ۱۷۸۶ء میں اپنی لسانی تحقیقات کے نتیجے شائع کیے جن سے لاطینی، یونانی، گوتھک، سنسکرت اور کیلٹک زبانوں کے اشتراک ماخذ پر روشنی پڑتی ہے۔''[۲۶]

ڈاکٹر زور نے اپنی اس تصنیف میں آٹو یسپرسن کی کتب "Language: It's Nature, Development and Origin" اور "Philosophy of Grammer" کے حوالوں سے علم لسانیات کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں جے۔ واندریس کی تصنیف "Le Langue" یعنی ''لسانیاتی مقدمہ تاریخ'' اور ایڈورڈ سپیر کی کتاب "Language, An Introduction to the study of Speech" یعنی ''زبان دیباچۂ مطالعہ گفتگو'' کا ذکر بھی کیا ہے۔

لسانی حوالے سے مزید قدامت کا سفر کرتے ہوئے انہوں نے ''زبان'' کی پیدائش و ارتقا کے نظریے کو بھی بیان کیا ہے اور دنیا کی زبانوں اور ہندوستان کی زبانوں کی تفاصیل بھی بیان کی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ بعد ازاں اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے اردو زبان کی طرف رخ کیا اور محض اس کی ابتدا، پیدائش اور کچھ تاریخ بیان کر کے خاتمہ نہیں کر دیا بلکہ اس کی مزید تقسیم کرتے ہوئے ادبی بولیوں کا تذکرہ بھی بہت سلیس اور واضح انداز میں کیا ہے اور جیسا کہ اس تصنیف کے آخری باب ''عہد حاضر'' سے ظاہر ہوتا ہے، اس میں اپنے عصری مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی ''ہندوستانی لسانیات'' جو بہ سبب اختیار تشنہ ہے، زبان کا نقش ماضی عام طور سے اس کے مستقبل کے لیے نشان راہ کا کام دیتا ہے۔ ہماری زبان کے اکثر نئے رجحانات اور مسائل کا حل اس کی پچھلی سرگزشت میں مل جائے گا۔ شمالی ہند میں اُردو زبان کے ارتقاً کی داستان عہد اپ بھرنش سے شروع

کی گئی ہے اور اس عہد کے ادب میں نئی بولیوں کے بیچ جہاں کہیں بھی نظر آئے ہیں ان کا بہ نظرِ تنقید جائزہ لیا گیا ہے۔

تاریخ نظم ونثرِ اُردو (۱۹۳۳ء):

آغا محمد باقر، مولانا محمد حسین آزاد کے سپوت اور صاحب علم و ادب شخص تھے۔ انہوں نے مولانا آزاد کی یاد میں آزاد بک ڈپو کی بنیاد بھی رکھی اور ان کے کاموں کو مزید ترقی بھی دی۔ ''تاریخ نظم ونثرِ اُردو'' اس ذیل کی ایک سعی ہے جو پہلی بار ۱۹۳۳ء میں اشاعت سے ہم کنار ہوئی۔ یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل رہی۔ اس میں مولانا آزاد کی ''آبِ حیات'' اور رام بابو سکسینہ کی "History of Urdu Literature" کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ تاہم یہ بھی محض تاریخ کی ایک کتاب ہے جس کے ابتدائی صفحات میں اردو زبان کی پیدائش اور اس کی اصلیت کے بارے میں کچھ بیانات ملتے ہیں۔ کتاب کے مقدمے میں آغا باقر بیان کرتے ہیں:

> ''نظم ونثر کی ابتدا بجائے دکن کے پنجاب میں ہوئی (سکسینہ صاحب مولانا آزاد کے ہم خیال تھے)۔ خمخانہ جاوید، گلِ رعنا، شعر الہند اور سیر المصنفین قابل ذکر ہیں۔۔۔۔ پروفیسر شیرانی صاحب کی ''پنجاب میں اُردو'' میں ۱۰۰ھ تک کی تصانیف دریافت کی ہیں اور اردو کا اصل مرکز پنجاب بتایا ہے۔''[۶۷]

اسی طرح اردو کی اصل کے بارے میں بیان کرتے ہوئے آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''زبان اردو کی صرف ونحو، محاورات اور بکثرت ہندی الفاظ اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ یہ زبان ہندی سے بنی ہے۔ میر امن اور قدیم اردو شاروں کی طرح یہ سمجھنا کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے، صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے دارالسلطنت اور اردو یا لشکر سے زبان اردو کے نشو نما کو اسی قدر تعلق تھا کہ اس کا نام اُردو ہو گیا۔''[۶۸]

اردو اور اس کی اصل کے بارے میں آغا باقر نے ''اردو''، ''ہندوستانی'' اور ''ہندی'' کا تعلق، زبان و ادب اردو پر فارسی کا احسان، اردو میں فارسی الفاظ، فارسی الفاظ کی کثرت کے اسباب، یورپ کی زبانوں کا اردو پر اثر، نثر اور نظم کی زبان، ادبی اردو، زبان اردو کے قدیم نام، اردو کا رسم الخط، نظم اردو، نظم کی قسمیں، نثر کی قسمیں وغیرہ کو تفصیل بیان کرتے ہوئے لسانیاتی مباحث میں اپنا حصہ ڈالنے کی سعی کی ہے۔

مختصر تاریخ ادب اردو (۱۹۳۴ء):

سید اعجاز الحسن کی تحریر کردہ ”مختصر تاریخ ادب اردو“ پہلی دفعہ ۱۴ر نومبر ۱۹۳۴ء میں الہ آباد سے منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب بھی اردو ادب کی تاریخ کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے اور اس کی اہمیت اپنے عہد کے لحاظ سے یہ ہے کہ اس میں اختصار اور جامعیت سے کام لیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ بھی محض اردو ادب کی تاریخ پر تحریر کی گئی ہے، تاہم اس میں بھی اردو زبان کی پیدائش اور کسی حد تک لسانی مباحث کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ زبانوں کے میل جول سے نئی زبان کا وجود میں آنا قدرتی امر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”ہندوستان میں آریہ قوم تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح آئی۔ یہاں ڈراویڈی قوم کا غلبہ تھا جو اُن سے بہت پہلے ہندوستان آ چکے تھے۔ آریاؤں نے ڈراویڈوں کو دھکیل کر پیچھے کر دیا اور ان کو مغلوب کر کے ۱۰۰۰ قبل مسیح تا ۶۰۰ قبل مسیح شمالی ہندوستان میں پنجاب سے بنگال تک پھیل گئے۔ ہندوستان میں پہلے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں تھیں۔ آریہ قوم کا علاقہ محدود تھا۔ ان کی زبان اپنی جگہ پر قائم رہی لیکن جیسے ہی وہ پھیلتے گئے، زبان میں فرق آتا گیا اور اس طرح دوسری زبانوں کے میل جول سے تلفظ اور الفاظ میں ردوبدل ہو گیا۔“[۹۶]

”مختصر تاریخ اردو ادب“ کو کافی پذیرائی ملی اور اس کی اشاعت متعدد بار عمل میں آئی۔ اس کا پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں اردو اکیڈمی سندھ کی طرف شائع ہوا، دوسرا ۱۹۶۸ء اور تیسرا ۱۹۷۱ء میں اشاعت سے ہمکنار ہوا۔

داستانِ تاریخ اُردو (۱۹۳۸ء):

”داستانِ تاریخ اردو“ حامد حسن قادری کی تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو ۱۹۳۸ء میں پہلی بار اشاعت سے ہم کنار ہوئی۔ یہ بنیادی طور پر اردو ادب کی تاریخ پر مشتمل ہے اور اس میں دیگر ادبی تاریخوں کی مانند لسانی نقطۂ نظر سے کچھ خاطر خواہ مباحث نہیں ملتے۔ اگر چہ زبان کی پیدائش اور ارتقا کے بارے میں بعض باتیں بیان کی گئی ہیں لیکن ان میں کوئی نئی بات یا نیا نظریہ پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ البتہ اس کے دیباچے میں

تذکرہ نگاری کے عہد سے لے کر تاریخ نگاری کے آغاز و ارتقا تک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے جو ادبی تاریخ نگاری کی مختصر ترین تاریخ شمار کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ''داستانِ تاریخ اردو'' میں لفظ اردو کے متعلق حامد حسن قادری کا بیان ہے:

> ''یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اس زبان کے لیے اردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا۔ یہ قیاس درست نظر آتا ہے کہ مغلوں کے زمانے سے ہندوستان میں اردو کا لفظ لشکر و لشکر گاہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ بابر، اکبر، جہانگیر کے فرمانوں اور سکّوں میں اردو کا لفظ لشکر کے معنی میں درج ہے۔''۷۰

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ حامد حسن قادری نے اپنا ذاتی نظریہ پیش نہیں کیا۔ یہی صورتِ حال ہمیں لسانی مباحث کے حوالے سے دکھائی دیتی ہے کہ نہ صرف اختصار پایا جاتا ہے بلکہ حامد حسن قادری تحقیقی و تنقیدی حوالے سے کوئی خاص نقطۂ نظر اپنانے یا کسی خاص نقطۂ نظر سے اتفاق کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

جائزہ زبانِ اُردو (۱۹۴۰ء):

اس کتاب کے بارے میں مولوی عبدالحق بیان کرتے ہیں:

> ''۱۹۳۵ء میں مَیں نے جائزہ زبانِ اُردو کی ایک تجویز انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک مجلس منعقدہ علی گڑھ میں پیش کی تھی۔ اس مجلس کے صدر سر سید راس مسعود مرحوم تھے اور اس میں سر شیخ عبدالقادر، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، سید محفوظ علی صاحب، سید ہاشمی صاحب بھی شریک تھے۔ دیر تک اس کے متعلق گفتگو رہی۔ تجویز کو سب نے پسند کیا۔ اس طرح اس کتاب کو شائع کر دیا گیا۔''۷۱

اس کتاب میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زبان اردو کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس دور کے حوالے سے بڑی اہم کتاب ہے۔

بوطیقا (مترجمہ: ۱۹۴۱ء)

''بوطیقا'' یونانی عہد کے مشہور فلسفی ''ارسطو'' کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و ضرورت کے پیشِ نظر عزیز احمد نے اردو میں ترجمہ کر کے ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اردو کراچی کی وساطت سے اشاعت سے ہمکنار

کیا۔ ''بوطیقا'' اگر چہ بذاتِ خود اردو لسانیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، تاہم انہوں نے لسانیات اور قواعد کے حوالے سے جو بحث کی ہے، اس کی اہمیت ضرور ہے۔ زبان اور لسانیات کی اہمیت کے حوالے سے عزیز احمد بیان کرتے ہیں:

> ''افلاطون اور ارسطو کے زمانے میں لسانیات کی ابتدا ہو رہی تھی اور علمِ قواعد زبان سے دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ الفاظ کی ابتدا تخلیق اور ان کی تقسیم کے متعلق افلاطون اور ارسطو دونوں کے نظریے محض تاریخی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اب علمِ زبان غیر معمولی ترقی کر چکا ہے۔ افلاطون کا یہ مکالمہ زیادہ تر علم زبان کے متعلق ہے۔ افلاطون اس خیال کا موید ہے کہ الفاظ اشیا کی آوازوں کی نقل پر بنے گی کیونکہ سوائے چند جانوروں یا چند قدرتی مظاہر کے ناموں کے بہت کم نام حیوانات یا اشیا کی آواز یا شور کی نقل کرتے ہیں لیکن افلاطون بھی اس کو تسلیم کرتا ہے کہ محض خارجی آوازوں کی نقلوں سے زبان نہیں بن سکتی اور اسی لیے رسوم و آئین کو بھی زبان کی ابتدا اور ارتقا میں جگہ حاصل ہے اور انسان آواز کے ذریعے صرف آوازوں ہی کی نقل نہیں بلکہ خیالات کی بھی نقل کر سکتا ہے۔''[۲۷]

''بوطیقا'' جس کا ترجمہ عزیز احمد نے ''فن شاعری'' کے نام سے کیا ہے، اس میں دیگر مضامین کے علاوہ زبان، الفاظ اور علم المعانی پر بھی مفصل بحث کی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لسانیات کا علم کئی صدیاں قبل شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس ضمن یہ خیال باطل ثابت ہوتا ہے کہ لسانیات کی ابتدا انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر اس تصنیف کی حیثیت ثانوی ہے کیونکہ یہ براہِ راست اردو میں لکھی گئی ہے کہ نہ اردو زبان سے متعلق ہے۔

آریائی زبانیں (۱۹۴۲ء):

ڈاکٹر سدھیشور ورما نے ۱۹۴۲ء میں ''آریائی زبانیں'' کے عنوان سے بعض لسانیاتی مباحث پیش کیے اور اعظم سٹیم پریس، حیدر آباد (دکن) سے شائع کیا۔ مذکورہ تصنیف میں مصنف نے اردو کو ہندی زبان قرار دیتے ہوئے اس کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی ہندی زبان کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ جوڑتے ہوئے اسے ہندوی قرار دیا ہے۔ ''آریائی زبانیں'' میں ڈاکٹر سدھیشور ورما نے برصغیر کی اس زبان کو جسے ہندی، ہندوی،

ہندوستانی، اردو اور دیگر کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے، ان تمام ناموں کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ''ہندی، اردو، ہندوستانی'' کے عنوان سے باب قائم کرتے ہوئے ان کا آپس میں تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر سدھیشور ورما نے ''آریائی زبانیں'' میں ہندوستان کی زبانوں کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا ہے اور دونوں پر علیحدہ علیحدہ ابواب قائم کرتے ہوئے ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ دو حصے یا ابواب ''آریائی زبانیں'' اور ''ہند آریائی زبانیں'' ہیں۔ ہند آریائی زبانوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سدھیشور ورما بیان کرتے ہیں:

> ''ہند آریائی میں ہند یورپی مصیت دم کشیدہ بندشی حروف (گھ، بھ، دھ) اب تک برقرار ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے ہند یورپی خاندان کی یہ ایک ہی زبان ہے جس میں یہ حروف اب تک محفوظ ہیں۔''۳؎

ایران کا تعلق چونکہ براہِ راست برِصغیر پر رہا اور بالخصوص مسلمانوں کی آمد کے بعد یہ اثر زیادہ واضح دکھائی دیتا ہے۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر سدھیشور ورما نے ''ایرانی زبانیں'' کے عنوان سے آخری باب قائم کرتے ہوئے ان زبانوں کا خاندان اور اقسام کو بیان کیا ہے۔

مجموعی طور پر ''آریائی زبانیں'' اپنے موضوع کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے کہ اس قبیل کی بہت کم کتابیں ملتی ہیں۔ نہ صرف قیامِ پاکستان سے قبل بلکہ بعد میں ایسے موضوعات پر اردو میں بہت کم کام ہوا ہے۔ اگرچہ مذکورہ تصنیف میں بعض مقامات پر تعصب کی جھلک دکھائی دیتی ہے تاہم ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس کے مصنف ڈاکٹر سدھیشور ورما کے متعلق بیان کرتے ہیں:

> ''اردو میں لسانیاتی کتابوں کی بے حد کمی ہے۔۔۔۔ ہندوستان میں ماہرینِ لسانیات بہت کم ہیں۔ ڈاکٹر سدھیشور ورما ان چند ماہرین میں سے ایک ہیں۔ ان کی کتابیں اور مقالے ہندوستانی زبانوں کی لسانیاتی و صوتیاتی کتب میں خاص وقعت رکھتی ہیں۔''۴؎

ہندآریائی اور ہندی (۱۹۴۲ء):

''ہند آریائی اور ہندی'' کے عنوان سے ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی نے ۱۹۴۲ء میں تصنیف پیش کی جو اردو کے لسانی مباحث میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ''ہند آریائی اور ہندی' چونکہ انگریزی میں تحریر کی گئی تھی، اس لیے دوسری بار عتیق احمد صدیقی کے ترجمے کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی اور اس کا پیش لفظ ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے تحریر کیا۔ اس پیش لفظ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

> ''ابتدا میں لفظ تھا اور لفظ ہی خدا تھا۔''۵۷

عتیق صدیقی نے اس کتاب کا مکمل ترجمہ نہیں کیا بلکہ محض ۲۸۰ صفحات کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ سنیتی کمار چٹر جی نے اپنی اس تصنیف میں جن مباحث کو پیش کیا ہے، ان میں ہندوستان کی قدیم زبانوں سے لے کر اردو زبان کی پیدائش اور اس کی عہد جدید میں ضرورت و اہمیت کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ البتہ اس بات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو بطور اردو زبان تسلیم نہیں کیا، بلکہ اسے ہندی زبان کہا ہے اور اسے ہی جدید ہندوستان کی نمائندہ زبان قرار دیا ہے۔ گویا اس کے پیچھے اس لسانی جھگڑے کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں جن کی بنیاد پر ہند مسلم اتحاد میں پہلی دراڑ پڑی۔ اس حوالے سے واضح ہوتا ہے کہ سنیتی کمار چیٹر جی کی یہ تصنیف تعصب کا شکار ضرور ہے مگر اپنی لسانی اہمیت نہیں کھوتی۔

مجموعی طور پر سنیتی کمار چیٹر جی اپنی مذکورہ تصنیف میں ہندوستان میں آریائی زبان کا ارتقا، ہند یورپی، ہند ایرانی، ہند آریائی، ہند آریائی کی ابتدائی تاریخ، سنسکرت اور وسطی ہند آریائی کا ارتقا، اصوات، حرف اور فرہنگ میں جدید ہند آریائی کا ارتقا جیسے مضامین پیش کیے ہیں جن میں لسانی مباحث و مسائل پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ تاہم یہ کتاب کا ایک حصہ ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں نئی مشترک ہند آریائی زبان، ہندی کا ارتقا، جدید ہندوستان کی نمائندہ بولی ہندی، ہندی (ہندوستانی) کی نشو ونما، ہندوستانی کے مسائل، قبل ہند یوروپی، ہند آریائی میں کثیر اللسانیت، ہند رومی حروف تہجی اور فرہنگ جیسے مضامین کا بیان ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی بیان کرتے ہیں:

> ''ہندوستان میں آریائی زبان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ہندوستان میں ہی اس کا ارتقا مسلسل تین ہزار پانچ سو سال سے جاری ہے اور اس کی قبل ہندوستان کی مزید ایک ہزار سال کی مبہم تاریخ ایران، عراق اور ایشیائے کوچک میں ملتی ہے اور موجودہ مسالہ سے اس سے بھی بیشتر کے پانچ سو یا ہزار سال کے بارے میں نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ۲۰۰۰ یا ۳۵۰۰ ق م سے آج تک ہندوستان کی آریائی زبان کے ارتقا کے واضح خطوط کا تعین ہند یورپی، ہند ایرانی اور ہند آریائی کی مختلف منازل پر کہا جا سکتا ہے جسے سنسکرت، پراکرت اور بھاشا کہتے ہیں۔''۲؎

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی نے اردو ہندی تنازع کے پس منظر کو ذہن میں رکھا اور اس تنازع کی بنیاد پر ہندی کو ہندوستان کی نمائندہ زبان بتا کر تعصب و جانبداری سے کام لیا ہے، تاہم ہندوستان کی اس عوامی بولی کے حوالے سے انہوں نے لسانی مسائل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب ''ہند آریائی اور ہندی'' اپنی قدر و قیمت نہیں کھوتی۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی نے اس تصنیف میں ہندوستان کی عوامی بولی ہندی کے جھگڑے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اردو اور ہندی کے تنازع کے علاوہ بول چال کی ہندوستانی میں قواعد کا بھی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں مختلف قوموں اور علاقوں کے لوگ بستے ہیں۔ ان کی عوامی بولی مختلف ہے۔ اس میں صوتیات اور فونیمیات کے زاویے سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اتر پردیش اور مشرقی پنجاب کے لوگوں کی بولی میں قواعدی مسائل اور ہیں کیونکہ ہر علاقے کا لہجہ بدل جاتا ہے۔ سڑکوں اور بازاروں کی بولی الگ ہے جس کی وجہ سے قواعد کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ یہی وہ مباحث ہیں جن کی بدولت سنیتی کمار چیٹر جی کی تصنیف تعصب اور جانبداری کے باوجود لسانی حوالے سے اپنی حیثیت نہیں کھوتی۔

مصباح القواعد (۱۹۴۵ء):

مولوی فتح محمد جالندھری کی تصنیف ''مصباح القواعد'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصہ جو ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے، علمِ صرف کے مباحث کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس حوالے سے حروفِ تہجی کی تعریف کرتے ہوئے مولوی فتح محمد جالندھری بیان کرتے ہیں:

> ''انسان کی زبان سے جو مختلف آوازیں نکلتی ہیں، ان کو لفظ کہتے ہیں اور زبان و دہان

> کے اختلافِ جنبش سے آوازوں میں جو فرق پیدا ہوتے ہیں، ان کا نام حرف ہے۔ انہیں حرفوں کو جو منہ اور زبان اور گلے میں ذرا ذرا فرق سے نئے نئے پیدا ہو جاتے ہیں، حروفِ تہجی یا حروفِ ہجا کہتے ہیں۔ اردو میں حروفِ تہجی اکاون ہیں۔“ ۷؎

حروف و حرکات کے تغیر و تبدل سے مختلف الفاظ اور مختلف قسم کے جو معنی پیدا ہوتے ہیں، اس علم کو صرف یا مارفولوجی کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی جب ہم آپس میں بول چال یا سوال و جواب کرتے ہیں تو مختلف قسم کے الفاظ اور ان کے معنی استعمال کرتے ہیں۔ مولوی فتح محمد جالندھری نے اس حصے میں علمِ صرف کے حوالے سے مختصر بحث کرنے کے بعد علمِ صرف کے حوالے سے قواعد کا ذکر کیا ہے۔

”مصباح القواعد“ کا دوسرا حصہ علمِ نحو سے متعلق ہے جو ۱۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ علمِ نحو کی تعریف کرتے ہوئے مولوی فتح محمد جالندھری بیان کرتے ہیں:

> ”نحو وہ علم ہے جس سے اجزائے کلام کو ترکیب دینے اور جدا جدا کرنے کا ڈھنگ آتا اور کلمات کے ربط اور با معنی تعلق کا حال معلوم ہوتا ہے اور جس غلطی سے مطلب میں خلل واقع ہو، اس سے کلام کو بچاتا ہے۔“ ۸؎

اگرچہ ”مصباح القواعد“ دیکھنے میں محض گرامر یا قواعد کی کتاب محسوس ہوتی ہے، تاہم اس کا عمیق مطالعہ اس بات کا غماز ہے کہ اس میں اردو لسانیات کے حوالے سے لسانیات کی دو اہم شاخوں علمِ صرف اور علمِ نحو پر سیر حاصل بحث بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”مصباح القواعد“ کو محض گرامر کی کتاب نہیں سمجھا جاتا بلکہ لسانی حوالے سے بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

اردو میں لسانی مباحث کے آغاز کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو میں قواعد کے حوالے سے بحث کا آغاز غیر ملکیوں یعنی مستشرقین نے کیا۔ ان کی تحریر شدہ کتب محض اردو زبان کو جاننے اور اردو زبان میں بات چیت کرنے میں معاونت حاصل کرنے کے لیے تھیں۔ ان کتب میں انگریزی، فرانسیسی اور دیگر یورپی زبانوں میں تحریر شدہ کتب شامل ہیں۔ فی زمانہ ان کی حیثیت محض تاریخی ہے۔ یہ کتب لسانیات کے محض ایک پہلو کو زیرِ بحث لاتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی اہمیت کافی کم رہ جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ کتب محض غیر زبان والوں نے اپنے تجارتی، سیاسی اور کسی حد تک معاشرتی و سماجی تعلقات کی خاطر اردو زبان کو جاننے کے لیے تحریر کیں۔ ان کے مقاصد ان کتب کے حوالے سے پورے بھی ہوئے جن سے بحث کا یہ مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا۔

مجموعی طور پر اردو میں اُردو کے لسانی مسائل پر اظہارِ خیال کا سہرا انشاء اللہ خان انشاؔ اور محمد حسین آزادؔ کے سر ہے۔ اگر چہ ان کے ہاں تحقیقی آلات کچھ زیادہ کارگر نہ تھے، تاہم انہوں نے اپنی علمیت اور خلوص کی بنا پر ایسا آغاز فراہم کیا جس کی بنیاد پر آنے والے وقتوں میں عمارت قائم کرنے میں آسانی ہوگئی۔ اس حوالے سے اگر یہ کہا جائے کہ اس موضوع پر تحقیقی نقطۂ نظر سے سب سے پہلے حافظ محمود خان شیرانی نے قلم اٹھایا اور اُردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کا نظریہ پیش کیا۔ اگر چہ شیرانی کا نظریہ اب کچھ زیادہ معتبر نہیں رہا، تاہم انھوں نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' (۱۹۲۸ء) میں جو تحقیقی مواد فراہم کیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی زمانے میں سیّد محی الدین قادری زورؔ بھی جدید لسانیاتی نقطۂ نظر سے اُردو زبان کے مطالعے میں مصروف تھے۔ اس ضمن میں ان کے علمی و تحقیقی کارنامے ''ہندوستانی صوتیات'' (۱۹۳۰ء) اور ''ہندوستانی لسانیات'' (۱۹۳۲ء) خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر چہ اس کے بعد اردو زبان و ادب کی تواریخ لکھنے کا رجحان بھی عام ہوا اور رام بابو سکسینہ، سید اعجاز الحسن اور حامد حسن قادری نے اپنے عصری تقاضوں کے مطابق بہترین کاوشیں کیں۔ تاریخ کی یہ کتب بلاواسطہ لسانی مباحث سے متعلق نہ تھیں بلکہ ان کے تقاضوں کے مطابق ان میں مختصراً اردو زبان کے چند لسانی مباحث وہ بھی جو اردو زبان کی پیدائش سے متعلق تھے، بیان کیے گئے۔

اردو میں لسانی مباحث کے آغاز کے حوالے سے ابتدائی طور پر ہمیں محض محی الدین قادری زور کی تصانیف ''ہندوستانی صوتیات'' اور ''ہندوستانی لسانیات'' اور کسی حد تک ڈاکٹر سدھیشور ورما کی تصنیف ''آریائی

زبانیں'' قابل قدر مقام رکھتی ہیں۔ دراصل اس عہد کے بارے میں جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ یہ سیاسی، معاشرتی، معاشی سطح پر برصغیر کا انتہائی نازک عہد تھا، اس لیے اس عہد میں جس قدر کام ہوا، وہ بھی کافی ہے کہ اس کام نے بعد کے آنے والے کسی حد تک پُرامن عہد میں لسانی مباحث پر قلم اٹھانے والے اہلِ علم کے لیے راہیں ضرور ہموار کیں۔ اس حوالے سے تواریخ ادب بھی اہمیت کی حامل ٹھہر جاتی ہیں جنھوں نے اردو زبان کی پیدائش اور اس کی اصل کے بارے میں مباحث کا آغاز کیا۔

اردو میں لسانی مباحث کے آغاز کے حوالے سے گزشتہ صفحات میں بیان کردہ کتب کے علاوہ بھی کچھ کتب ملتی ہیں جن میں مولوی کریم الدین پانی پتی ''قواعد الہندی'' (لاہور: ۱۸۶۰ء)، حیدر بہادر جنگ کی تصنیف ''قواعدِ ہندوستانی'' (لندن: ۱۸۶۱ء)، محمد علی کی ''ہندوستانی ٹیچر'' (بنگلور: ۱۸۷۰ء)، شیو پرشاد کی ''رسالہ صرف و نحوِ اردو'' (لکھنؤ: ۱۸۸۱ء)، رائے درگا پرشاد کی ''زبدۃ القواعد'' (لکھنؤ: ۱۸۸۳ء)، راجہ شیو پرشاد کی ''اردو صرف و نحو'' (الٰہ آباد: ۱۸۸۷ء)، منشی صاحب کی تصنیف ''قواعدِ اُردو'' (۱۹۰۱ء)، مولوی محمد احسن کی تصنیف ''قواعدِ اُردو'' (الٰہ آباد: ۱۹۰۴ء)، شیخ برکت علی کی ''ہندوستانی گرامر'' (الٰہ آباد: ۱۹۰۵ء) اور مولوی فتح محمد جالندھری کی تصنیف ''مصباح القواعد'' (رام پور: ۱۹۵۴ء) جیسی تصانیف بھی شامل ہیں۔ ان کتب کے ناموں سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ سب کتب محض قواعد سے تعلق رکھتی ہیں اور لسانی مباحث پر کوئی تفصیلات مہیا نہیں کرتیں، اس لیے ان پر بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا کیونکہ قواعد پر جس قدر کتب ہیں، وہ سب محض ایک ہی موضوع کا احاطہ کرتی ہیں، ان میں نہ موضوعات کا تنوع ہوتا ہے اور نہ ہی اکا دکا اختلافات کے سوا کچھ قابلِ قدر مواد ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک بھی ''اردو'' کو ''ہندوستانی'' کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے اور اس نام سے پکارنے والے غیر ملکی نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے ہی باشندے ہیں۔

بحیثیتِ مجموعی اردو میں لسانی مباحث کا آغاز شاندار نہ سہی لیکن اس نے آنے والے وقتوں میں اس میدان میں کام کرنے کے در ضرور وا کر دیے۔ اس دور میں اردو کے لسانیاتی مسائل کی طرف کم توجہ دی گئی اور تواریخ کی طرف توجہ نسبتاً زیادہ دی گئی۔ تاہم ان تواریخ اور دیگر نظریاتی لسانی کتب (دکن میں اُردو، پنجاب میں اردو وغیرہ) نے اردو زبان کی پیدائش اور اس کے ہندوستانی ہونے کے مباحث کا آغاز ضرور کیا جس سے آنے والے وقتوں میں لسانی مباحث پر خاطر خواہ اور مفید کام ہوا۔

حواشی

۱۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا، ''اردو کی لسانی تشکیل''، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۸ء، ص ۱۸

۲۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ''عام لسانیات''، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء، ص۸۴۲

۳۔ بلوم فیلڈ، لینارڈ، ''لینگوایج''، مترجم: موتی لال بنارسی داس، دہلی: دی پرنٹ، پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء، ص۱۱

۴۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا، ''اردو کی لسانی تشکیل''، ص ۲۱

۵۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، ''اردو کی لسانی تشکیل''، ۲۸

۶۔ ایضاً، ص۱۳۳

۷۔ چیٹر جی، سنیتی کمار، ''انڈو ایرین اینڈ ہندی''، کلکتہ: فرما کے۔ ایل مکھوپادھیائے، ۱۹۶۰ء، ص۱۰۴

۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ''اردو کی زبان''، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۷ء، ص۶۰۔۶۱

۹۔ ایضاً، ص۶۲

۱۰۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، مقالہ: حروف کا تبادل، مشمولہ: اردو نامہ، کراچی، شمارہ دوازدہم، اپریل تا جون ۱۹۶۳ء،

۱۱۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ''اردو زبان کا ارتقا''، ڈھاکہ: سٹی پریس، ۱۹۵۶ء، ص۸۷

۱۲۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ''اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء، ص۱۹۲

۱۳۔ چیٹر جی، سنیتی کمار، ''ہند آریائی اور ہندی''، مترجم: عتیق احمد صدیقی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۱ء، ص۹۴۔۹۵

۱۴۔ Grierson, G.A., "Linguistic Survey of India", vol: ix, part: iv, Delhi: Motial Banarsidass, pg.1

۱۵۔ گیان چند، ڈاکٹر، ’’لسانی مطالعے‘‘، نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء، ص ۱۳

۱۶۔ سدھیشور ورما، ڈاکٹر، ’’آریائی زبانیں‘‘، حیدرآباد (دکن): اعظم سٹیم پریس، ۱۹۴۲ء، ص ۵۷

۱۷۔ عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، ’’قواعدِ اردو‘‘، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۶ء، ص ۲۹

۱۸۔ نیئر، مختار علی، ’’تاریخ زبان و ادب ہندکو‘‘، پشاور: سلیمان پرنٹرز، ۱۹۹۵ء، ص ۳۰۷

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ عصمت جاوید، ڈاکٹر، ’’نئی اردو قواعد‘‘، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء، ص ۳۰

۲۱۔ اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، ’’اردو صرف و نحو‘‘، پہلا ایڈیشن، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، جنوری مارچ ۱۹۸۵ء، ص ۱۷

۲۲۔ شاہین، امیر اللہ خان، ڈاکٹر، ’’جدید اردو لسانیات‘‘، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۵

۲۳۔ کیفی، برجموہن دتاتریہ، پنڈت، ’’کیفیہ‘‘، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۷۵ء، ص ۳۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۷

۲۵۔ رشید حسن خاں، ’’اردو کیسے لکھیں‘‘، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء، ص ۱۹۔۳۳

۲۶۔ مسعود حسین خاں، ڈاکٹر، مقالہ: اردو صوتیات کا خاکہ، مشمولہ: ’’مقدمات شعر و زبان‘‘، حیدرآباد: شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۲

۲۷۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا، ’’اردو کی لسانی تشکیل‘‘، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۸ء، ص ۲۲۳۔۲۲۴

۲۸۔ رشید حسن خاں، ’’اردو املا‘‘، دہلی: نیشنل اکادمی، ۱۹۷۴ء، ص ۹۹

۲۹۔ انجم رحمانی، ’’برصغیر پاک و ہند میں خطاطی‘‘، لاہور: عجائب گھر، ۱۹۷۸ء، ص ۴۔۸

۳۰۔ انشا، انشاء اللہ خاں، ’’دریائے لطافت‘‘، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۲۵ء، ص ۲۵۳

۳۱۔ حسینی، میر بہادر علی، ’’قواعدِ زبان اردو‘‘، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء، ص ۷

۳۲۔ عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، ’’قواعدِ اردو‘‘، ص ۱۸

۳۳۔ صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، ''جامع القواعد (حصہ صرف)''، لاہور: اردو سائنس بورڈ، طبع دوم ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۲

۳۴۔ شلزی، بنجمن، ''ہندوستانی گرامر'' ترتیب و ترجمہ و تعلیقات: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۸

۳۵۔ عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، ''قواعدِ اردو''، ص ۱۳

۳۶۔ حسینی، میر بہادر علی، ''قواعدِ زبان اردو''، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، ص ۴۳

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ داؤدی، خلیل الرحمٰن، مرتبہ: ''قواعدِ اردو زبان''، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء، ص ۴۷

۴۱۔ عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، ''قواعدِ اردو''، ص ۱۹۔۲۵

۴۲۔ Jesperson, Otto, "Language: Its Nature, Development and Origin", London: Allen & Unwin Ltd., 1922, pg.418

۴۳۔ میر امن، ''باغ و بہار''، مرتبہ: ممتاز حسین، کراچی: اردو ٹرسٹ، ۱۹۵۸ء، ص ۱۳

۴۴۔ انشا، انشاء اللہ خاں، ''دریائے لطافت''، لکھنؤ: انجمن ترقی اردو ہند، طبع اول ۱۹۱۶ء، ص ۴

۴۵۔ قدرت نقوی، سید، مرتبہ: ''لسانی مقالات''، حصہ دوم، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول ۱۹۸۸ء، ص ۱۳

۴۶۔ آزاد، مولانا محمد حسین، ''آبِ حیات''، مرتبہ: ڈاکٹر تبسم کاشمیری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء، ص ۵

۴۷۔ نجمی، حکیم نجم الغنی خاں، ''بحر الفصاحت''، حصہ اول، مرتبہ: ڈاکٹر کمال صدیقی، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۳

۴۸۔ ایضاً، ص ۹۳

۴۹۔ نجمی، حکیم نجم الغنی خاں، ''بحر الفصاحت''، حصہ اول، مرتبہ: سید قدرت نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، مارچ ۱۹۹۹ء، ص ۵

۵۰۔ آزاد، مولانا محمد حسین، ''سخندانِ فارس''، لاہور: شیخ مبارک علی، طبع سوم ۱۹۵۶ء، ص ۵۲

۵۱۔ آزاد، محمد حسین، ''آبِ حیات''، مرتبہ: تبسم کاشمیری، ص ۵

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۴

۵۳۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید، ''مختصر تاریخ ادبِ اردو''، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۶ء، ص ۳۱۴

۵۴۔ ہاشمی، نصیر الدین، ''دکن میں اردو''، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، آٹھواں ایڈیشن ۱۹۸۵ء، ص ۳۶

۵۵۔ زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر سید، ''اردو کے اسالیب بیان''، لاہور: مکتبہ معین الادب، پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۲ء، ص ۱۷

۵۶۔ شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو''، حرفِ آغاز: ڈاکٹر وحید قریشی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم ۱۹۹۸ء، ص ۱

۵۷۔ ایضاً، ص ۸

۵۸۔ سلیم، مولانا وحید الدین، ''وضعِ اصطلاحات''، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، س۔ن، ص ۱۶۲

۵۹۔ سلیم، مولانا وحید الدین، ''افاداتِ سلیم''، لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، س۔ن، ص ۱

۶۰۔ سکسینہ، رام بابو، ''تاریخ ادبِ اردو''، مترجم: مرزا محمد عسکری، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۷ء، ص ۳۹

۶۱۔ مغنی تبسم، پروفیسر، ''ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور: حیات، شخصیت اور کارنامے''، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳۱

۶۲۔ ایضاً، ص ۳۳۲

۶۳۔ احمد دین، بی۔ اے، ''سرگذشتِ الفاظ''، لاہور: شیخ مبارک علی تاجر کتب، ۱۹۳۲ء، ص ۲۳۰

۶۴۔ زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر سید، ''ہندوستانی لسانیات''، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، مارچ ۱۹۶۰ء، ص ۱۸

۶۵۔ ایضاً، ص ۲۱

۶۶۔ ایضاً، ص ۲۲

۶۷۔ باقر، آغا محمد، ”تاریخ نظم ونثر اردو“، لاہور: آزاد بک ڈپو، بار دوم ۱۹۵۸ء، ص ۸

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۳

۶۹۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید، ”مختصر تاریخ ادب اردو“، ص ۱۷

۷۰۔ قادری، حامد حسن، ”داستان تاریخ اردو“، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۴۱ء، ص ۱۰

۷۱۔ عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، مشمولہ: ”جائزہ زبان اردو“، مرتبہ: انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۱

۷۲۔ ارسطو، ”بوطیقا“، مترجم: عزیز احمد، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء، ص ۱۱

۷۳۔ سدھیشور ورما، ڈاکٹر، ”آریائی زبانیں“، حیدرآباد (دکن): اعظم سٹیم پریس، ۱۹۴۲ء، ص ۵

۷۴۔ ایضاً

۷۵۔ چیٹر جی، سنیتی کمار، ”ہند آریائی اور ہندی“، مترجم: عتیق احمد صدیقی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۱ء، ص ۱

۷۶۔ ایضاً، ص ۹

۷۷۔ جالندھری، فتح محمد خاں، مولوی، ”مصباح القواعد“، حصہ اول، رامپور: اشاعت خانہ رامپور، ۱۹۴۵ء، ص ۵

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۷۰

باب چہارم

اُردو میں لسانی مباحث

(بعد از قیامِ پاکستان تا حال)

حصہ اوّل

پاکستانی زبانوں کے اُردو سے لسانی روابط

لسانیاتی تجزیہ کے مطابق پاکستانی زبانوں کے اردو کے لسانی روابط پر بحث اہمیت کی حامل ہے۔ اس مقصد کے لیے درج ذیل امور کا مطالعہ ضروری ہے:

زبانوں کے مابین رشتہ میں درج ذیل عناصر پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔

۱۔ زبان کی صوتی ساخت

۲۔ زبان کی صرفی ساخت

۳۔ زبان کی نحوی ساخت

۴۔ زبان کی ضروری اور بنیادی لغت

لسانیاتِ پاکستان کا تجزیہ اُردو زبان سے کیا جائے تو اس تجزیے کی مدد سے زبان کے نصاب کی تفصیل بھی زیادہ سائنٹیفک ڈھنگ سے دی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک غیر ملکی زبان سکھانے کے لیے مندرجہ ذیل عنوانات نصاب میں درج کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کسی بھی پاکستانی زبان کو سیکھنے کے لیے درج ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

تلفظ (Pronounciation):

(الف) مصمتے اور مصوتے (Vowels and Consonants)

(ب) مصمتی خوشے (Consonants Clusters)

(ج) صوت رکن (Syllable)

(د) فونیم (Phoneme)

قواعد (Grammar):

کسی بھی دو زبانوں کا تقابلی تجزیہ کرتے وقت درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا لازمی ہے:

۱۔ دونوں زبانوں میں کتنے اور کون کون سے فونیم ہیں۔ فونیم کی نہ صرف تعداد میں فرق ہو سکتا ہے بلکہ ایک میں موجود فونیم دوسرے میں ممکن ہے کہ موجود نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں زبان سیکھنے میں دقت ہوگی۔ ذیل میں انگریزی اور اُردو کے بندشیئے فونیم کی فہرست دی جا رہی ہے۔ آسانی کے لیے اُردو حروف سے ان کو دکھایا گیا ہے۔

انگریزی: پ ب ٹ ڈ ک گ

اُردو: پ پھ ب بھ ت تھ د دھ ٹ ٹھ ڈ ڈھ ک کھ گ گھ

۲۔ اُوپر کی فہرست سے ظاہر ہے فونیم کی تعداد مختلف ہے لیکن جو فونیم دونوں میں موجود ہیں وہ بھی اپنی صوتی بنیاد کی وجہ سے مختلف ہیں۔ اگرچہ انگریزی اور اُردو دونوں میں ٹ اور ڈ موجود ہیں لیکن ان کا تلفظ دراصل مختلف ہے۔ انگریزی میں یہ لثوی ہیں جب کہ اُردو میں یہ کوزی ہیں۔

۳۔ دونوں زبانوں کے فونیم میں کتنے ذیلی فونیم ہیں۔ انگریزی کے /پ/ فونیم میں تین ذیلی فونیم ہیں۔ جبکہ اُردو میں /پ/ فونیم صرف ایک ہی ذیلی فونیم رکھتا ہے۔

۴۔ فونیم اور ذیلی فونیم کو زبان میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ فونیم ایک سے بھی ہوں لیکن اگر ان کی تقسیم مختلف ہے تو یہ زبان کو سیکھنے میں دقت پیدا کر سکتی ہے۔ مثلاً انگریزی اور اُردو دونوں میں کھ موجود ہے لیکن یہ انگریزی میں ذیلی فونیم ہے اور صرف لفظ کے شروع میں استعمال ہوتا ہے جبکہ اُردو میں یہ مکمل فونیم ہے اور کسی بھی جگہ استعمال ہو سکتا ہے۔

پنجابی اور اردو کے لسانی روابط:

ڈاکٹر وحید قریشی اُردو اور پنجابی کے لسانی اشتراک کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ”اُردو پنجابی کے لسانی سانچے یکساں ہیں۔ ہند آریائی زبانوں کے خانوادے سے متعلق ہونے کی وجہ سے دونوں زبانوں کی صرف و نحو ایک ہے بلکہ بیشتر ذخیرۂ الفاظ

> بھی مشترک ہے۔ پاکستان کے باشندے آج بھی اُردو میں تذکیر و تانیث کے مسائل دلی و لکھنؤ کے حوالے سے نہیں مقامی زبانوں ہی کے حوالے سے طے کرتے ہیں۔''۱؎

جارج گریرسن، پروفیسر محمود شیرانی، عین الحق فرید کوٹی اور دیگر ماہرین لسانیات نے اُردو اور پنجابی زبان کے تعلق کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو اور پنجابی دراصل بنیادی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ ان زبانوں کے اس قدر قریب ہونے کی وجہ سے صرف و نحو کا اسلوب بڑی حد تک ایک ہوتا ہے۔ جس کا مختصر تذکرہ یوں کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے۔ یعنی علامت ''نا'' امر کے آخر میں بڑھا دی جاتی ہے۔

۲۔ اکثر ایسے الفاظ جو ''الف'' پر ختم ہوتے ہیں۔ تانیث کی حالت میں ''ی'' پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً لڑکا، لڑکی اور منڈا، کڑی۔

۳۔ اسما کے صفات دونوں زبانوں میں ''الف'' پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً اونچا اور اُچا، سیدھا اور سِدھا۔

۴۔ فعل ماضی، فعل حال اور فعل مستقبل کے اصول دونوں زبانوں میں تقریباً ایک جیسے ہیں۔ کہیں کہیں معمولی تصرف کرنا پڑتا ہے۔

۵۔ فعل امر کا قاعدہ اُردو اور پنجابی میں بالکل یکساں ہے۔

۶۔ پنجابی اور اُردو کے حروف تہجی اور رسم الخط میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

۷۔ پنجابی کے بامعنی الفاظ اور محاورات اُردو زبان میں بھی اپنے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

عین الحق فرید کوٹی نے اُردو اور پنجابی کا تعلق ظاہر کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا:

> ''جب ہم اُردو زبان کے لغوی سرمایے اور صرف و نحو کا موازنہ برصغیر کی موجودہ زبانوں سے کرتے ہیں تو جو زبان اس کے سب سے زیادہ نزدیک نظر آتی ہے وہ پنجابی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ صرف و نحو کے لحاظ سے پنجابی کے علاوہ کوئی دوسری زبان اُردو سے گہری مطابقت نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ اُردو زبان کی بنیادیں وادیٔ سندھ ہی میں استوار ہوئی ہیں اور اس کا سلسلہ نسب پنجابی، اپ بھرنش

> اور مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا قدیم ہڑپائی عہد کی زبان سے جاملتا ہے جو کہ آریاؤں کی آمد سے قبل وادیٔ سندھ میں مروج تھی۔''[۲]

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہوگیا کہ اُردو اور پنجابی کا تعلق بہت گہرا ہے۔ اس اشتراک کی مزید وضاحت کے لیے ان زبانوں کے چند مشترکہ الفاظ ذیل میں دیے جاتے ہیں:

اُردو	پنجابی
بھانڈ	بھنڈ
کھانڈ	کھنڈ
ڈوب	ڈُب
دھوپ	دُھپ
دُکھ	دُکھ
لیموں	لیمبو
ایک	اک
آٹھ	اَٹھ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق:

> ''زبان دراصل انسان کی سماجی و معاشرتی ضرورتوں کی ایجاد ہے اور آج بھی کوئی نئی زبان انہی ضرورتوں کے تحت وجود میں آتی ہے۔ سماجی زندگی ہی کے سہارے ہر زبان اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے اور اس کے زیر اثر اس کی صورت و معنی میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔''[۳]

پنجابی زبان کی ابتدائی شکل کے سلسلے میں ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' میں تحریر ہے:

> ''صدیوں سے اس زبان کی تین شکلیں مروج رہی ہیں اور تینوں شکلیں پنجاب کے تین حصوں میں عمودی تقسیم سے تعلق رکھتی ہیں۔ تقسیم سے پہلے کے پنجاب کے چوتھائی حصے یعنی انبالہ کی کمشنری میں ہریانوی زبان بولی اور لکھی جاتی تھی۔ درمیانی

> اور سب سے بڑے حصے میں جو کہ جالندھر، لاہور اور راولپنڈی ڈویژن پر مشتمل تھا۔ پنجابی رائج تھی۔ ملتان اور ڈیرہ جات میں ہندکی یا مغربی پنجابی بولی جاتی رہی ہے۔ (یہ پنجابی کی قدیم ترین شکل ہو سکتی ہے) ان تینوں علاقوں کی زبانوں میں اس قدر قرابت پائی جاتی ہے کہ ضلع ہزارہ کا رہنے والا لدھیانے یا فیروز پور یا ساہیوال اور ملتان کی زبان آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔''[۴]

پنجابی زبان اپنا سفر مسلمانوں کی آمد سے شروع کرتی ہے۔ ترکی، عربی اور فارسی زبانوں نے پنجابی زبان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ عربی و فارسی زبان کی ملاوٹ نے پنجابی زبان کی صوتیات میں بھی اضافہ کیا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو چار حروف (پ، چ، ژ، گ) خالص فارسی زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پنجابی زبان میں بھی یہی حروف اور رسم الخط کا استعمال ہوتا ہے۔

پنجابی زبان کی ابتدا اور ساخت کے بارے میں ''انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا'' میں محقق باوا بدھ سنگھ کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

> ''پنجابی کا جسم سنسکرتی ہے لیکن اس کا لباس بدلتا رہتا ہے۔ جب سنسکرت بگڑی تو پراکرت بنی اور پراکرت سے اپ بھرنش اور اس سے پنجابی۔''[۵]

پنجابی ایک وسیع خطے کی زبان ہے جس کے باعث متعدد ہمسایہ زبانوں سے اس کا تعلق ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر پاکستانی زبان کے الفاظ پنجابی نے قبول کیے اور ہر زبان کو ممکنہ حد تک متاثر بھی کیا۔ دیگر زبانوں کے علاوہ پنجابی اور اُردو کی لسانی ہم آہنگی بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ پنجابی زبان و ادب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ اس علاقے میں خود خطہ پنجاب۔ تاہم اس ضمن میں تحقیقی کاموں کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوا جبکہ قیام پاکستان کے بعد اور پھر پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے پنجابی کے اجرا کے بعد تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی کاموں میں بھی خاطر خواہ اضافے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اب تو ایم فل لیڈنگ ٹو پی ایچ۔ڈی کروائی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید لکھتے ہیں:

> ''پنجابی زبان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنا پنجاب میں خود انسان کا وجود۔ زبان کی تشکیل اور ارتقا میں ان تمام عناصر اور عوامل نے بھرپور حصہ لیا جن سے خود پنجاب

> کی تاریخ عبارت ہے اور یہ تاریخ نہایت ہی قدیم، مسلسل اور بوقلموں ہے۔ کئی ایک مقتدر محققین کا دعویٰ ہے کہ حقیقی انسان سب سے پہلے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں ہی ارتقا کی موجودہ منزل تک پہنچا۔''[۶]

مشہور تاریخ دان ڈاکٹر رادھا کمود مکر جی نے ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی مجلس تاریخ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں ایک ماہر طبقات الارض مسٹر بیرل کے حوالہ سے بیان کیا کہ تیسرے ارضیاتی دور کے اواخر میں (تقریباً ڈیڑھ کروڑ سال قبل) انسان اور ہمالیہ ایک ساتھ ہی اس خطے میں نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر شیرانی کی تحقیقات سے ھریانی زبان کے بعض قدیم مصنفین کے ادبی کارنامے ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ جن کی زبان کا تجزیہ اور پنجابی کے قدیم ترین نمونوں سے تقابلی مطالعہ اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیتا ہے کہ ھریانی زبان پرانی اُردو کی باقی ماندہ شکل نہیں بلکہ ایک علیحدہ اور مستقل زبان کی حیثیت سے عرصے سے مضافات دہلی میں رائج تھی۔ چنانچہ ہم نے اس مقالے میں قدیم دکنی (جس کی توجیہ پروفیسر شیرانی نے پنجابی سے کی ہے) کے اکثر کھوئے ہوئے لسانی سرشتوں کی کھوج نواح دہلی کی بولیوں ھریانی، کھڑی اور میواتی سے پیش کر کے اُردو کی ابتدا کے متعلق ایک نئے نظریے کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ھریانی اور پنجابی میں خط فاصل قائم کرنا دشوار تھا۔ قدیم اُردو اور دکنی کا ''پنجابی پن'' اس کا ''ھریانی پن'' بھی ہے۔''[۷]

اگرچہ زبان محض ذریعہ اظہار ہے، مگر فی الواقع یہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ زبان اظہار کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قوم کی روایات اخلاقی اقدار اور تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کسی قومی زبان کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوم کے تمام طبقوں کا مشترکہ ذریعہ اظہار ہونے کے علاوہ قوم کی روایت و ثقافت کی امانت دار بھی ہو۔ اگر کوئی زبان ان دونوں خصوصیات کی حامل نہیں ہے۔ تو وہ کسی طرح بھی قومی زبان کا درجہ حاصل کرنے کی اہل نہیں ہے۔ وارث سرہندی لکھتے ہیں:

> ”جب اس معیار پر ہم اُردو زبان کو پرکھتے ہیں تو یہ برِعظیم پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی قومی زبان کی جملہ خصوصیات کی حامل ثابت ہوتی ہے۔ عربی اور فارسی کو چھوڑ کر اسلامی علوم وافکار کا جتنا وافر ذخیرہ اُردو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، وہ دنیا کی کسی اوزبان میں نہیں پایا جاتا۔ اُردو کے ایک ایک لفظ سے اسلامی اقدار کا اظہار ہوتا ہے۔“[۸]

اس طرح اُردو میں تمام پاکستانی زبانوں کے لسانی روابط پائے جاتے ہیں۔ شیرانی صاحب اُردو اور پنجابی کے ربط کے بارے میں بیان کرتے ہوئے حضرت مراد شاہ لاہوری کی تصنیف نامۂ مراد کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں:

> ”ان (مراد شاہ) کی طبیعت غزل سے بہتر مثنوی پر جمتی ہے۔ ۱۱۹۶ھ میں ایک منظوم خط عزیزان وطن کو لکھتے ہیں۔ جو نامۂ مراد کے نام سے موسوم ہے اور ہمارے مخدوم جناب غلام دستگیر صاحب نامی کی سعی سے چھپ چکا ہے۔“[۹]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ”قدیم اُردو کی لغت“ میں پاکستان کی علاقائی زبانوں میں زندہ و مستعمل الفاظ کی فہرست دی ہے جو ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ ان بھولے بسرے یا ’خوابیدہ الفاظ‘ کو دوبارہ تحریر و تقریر میں استعمال کر کے اُردو کو علاقائی زبانوں کے اور علاقائی زبانوں کو اُردو کے قریب تر لایا جا سکتا ہے۔ الفاظ کی فہرست پیش کی جاتی ہے:

قدیم اُردو الفاظ	پنجابی زبان کے الفاظ	جدید اُردو
آپیں	تُسیں - آپے	آپ کو
آپن	اپنا	اپنا
آپی	آپے	خود
آت	اَت	بہت
آتمہ	آتما	خُدا
آتی ، کال	کل نوں ، پلھک نوں	آنے والا کل
آٹ	اَوکڑ	مشکل
آناٹ - آناوٹ	اوکڑ آوناں	دشواری - مصیبت

اب پنجابی زبان کے مختلف نام کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ میلوہاتی: میلوہا دیس کی زبان
۲۔ منڈاری: منڈا (قبیلوں) کی زبان
۳۔ دراوڑی: دراوڑ قبیلوں کی زبان
۴۔ ویدی (ویدک): ویداں کی زبان
۵۔ لوکک: سنسکرت کے مقابلے میں بول چال کی عوامی زبان
۶۔ پالی: ٹیکسلا کی راجدھانی زبان
۷۔ پشاچی: گوشت کھانے والے اُجڈ اور اکھڑ لوگوں کی زبان
۸۔ جٹکی: پنجاب کے جاٹوں کی زبان
۹۔ ملتانی: ملتان کی زبان
۱۰۔ ہندی، ہندکو، الہندیہ: غزنوی دور کی زبان
۱۱۔ لاہوری: لاہور کی زبان
۱۲۔ ہندوی: امیر خسرو کے زمانے کی زبان
۱۳۔ ماجھی: مرکز پنجاب کی زبان
۱۴۔ گورمکھی: گوردواروں کی زبان
۱۵۔ پنجابی: پنجاب کی زبان

پنجابی صوتیے کی درج ذیل مکمل فہرست ہے جو اُردو کے بہت قریب ہے۔ اس سے ہمیں اُردو لسانیات اور پنجابی زبان کے روابط کا پتہ چلتا ہے:

پنجابی صوتیے:

ا ب بھ پ پھ ت تھ ط ٹ ٹھ ج جھ چ چھ خ د دھ ڈ ڈھ
ر رھ ڑ ڑھ ز ژ ذ ض ظ س ث ص ش غ ف ک کھ ق
گ گھ ل لؕ لھ م مھ ن نؕ نھ و ہ ء ع ی ے

اس طرح پنجابی کے کل صوتیے ۵۳ ہیں۔

جبکہ پنجابی کے ابتدائی صوتیے کی فہرست درج ذیل ہے:

ابتدائی صوتیے:

ا ب بھ پ پھ ت تھ ٹ ٹھ ج جھ چ چھ خ د دھ ڈ ڈھ ر
رھ ڑ ڑھ ز س ش غ ف ک کھ گ گھ ل لؕ لھ م مھ ن
نْ نھ و ہ ء ی ے

پنجابی کے غیر مقامی صوتیے:

ث ، ج ، ذ ، ص
ض ، ط ، ظ ، ع
ق
ث ، ص ، س
ح ، ہ
ژ ، ز ، ض ، ظ = ز ، ج
ط ، ت
ع ، ا
ق ، ک

پنجابی کی اصل کے بارے میں دو نظریے پیش کیے جاتے ہیں:

(ا) پنجابی زبان آریائی خاندان کی زبان ہے۔

(ب) پنجابی زبان غیر آریائی یا دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

پنجابی کی علاقائی بولیاں:

(ا) مشرقی بولیاں: بھٹیانی، پوادھی، راٹھی، مالوی، دوآبی

(ب) مغربی بولیاں: پوٹھوہاری، دھنی، چھاچھی، شاہ پوری، ریاستی، ملتانی، جانگلو

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی لکھتے ہیں:

> ’’قدیم زمانے سے ایک طویل عرصے تک سندھ، پنجاب اور کشمیر حکومت سندھ میں شامل رہے۔ آریوں کی آمد سے قبل بھی ان علاقوں کے آپس میں لسانی، تہذیبی، تجارتی اور مذہبی تعلقات قائم تھے۔ جب آریہ آئے تو پہلے انہی علاقوں میں آباد ہوئے، پھر نقل مکانی کر کے دوسرے علاقوں میں جا بسے یہ سلسلہ طویل عرصے تک قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی قوموں، ذاتوں اور قبیلوں کے نام سندھ اور پنجاب میں مشترک ہیں۔‘‘ ۱۰

آج بھی ہم وادی سندھ کی زبانوں: سندھی، سرائیکی اور پنجابی کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی آپس میں کافی حد تک مماثلت ملتی ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی لسانی اور معنوی لحاظ سے ان زبانوں کی اُردو کے ساتھ بھی مطابقت و مشابہت ہے۔ زبان کی ساخت اور صرفی نحوی ترکیب میں مصدر کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح مصادر سندھی، سرائیکی، پنجابی اور اُردو میں مشترک ہیں۔ سندھی اور سرائیکی میں علامات مصدر بھی ایک جیسی ہیں یعنی (ݨ) البتہ پنجابی کی علامتِ مصدر ’’نا‘‘ اور اُردو کی ’نا‘ ایک ہیں۔ ان زبانوں میں بہت مشابہت ہے۔

اُردو	پنجابی	سرائیکی یا ملتانی	سندھی
اُبھرنا	اُبھرنا	اُبھرݨ	ابھرݨ
بگاڑنا	بگاڑنا	بگاڑݨ	بگاڑݨ
ترسنا	ترسھا	ترسݨ	ترسݨ
ترسانا	ترساݨا	ترساوݨ	ترساإݨ
ٹنگنا	ٹنگݨا	ٹنگݨ	ٹنگݨ
اکھڑنا	اکھڑݨا		اکھاڑݨ
الارنا	الارݨا	اکھڑݨ	اولارݨ
پڑھنا	پڑھݨ	الارݨ	پڑھݨ
		پڑھݨ	

سلیم خان گمی لکھتے ہیں:

> ”یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ سنسکرت پنجابی کی ماں ہے اور پنجابی سنسکرت کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے۔ پنجابی کا وجود سنسکرت کا مرہون منت ہے اگر سنسکرت نہ ہوتی تو پنجابی زبان بھی نہ ہوتی۔“[۱۱]

حافظ محمود شیرانی ”پنجاب میں اُردو“ میں پنجابی اور اُردو کا تعلق ماں بیٹی کا لکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ماں کبھی ڈاین نہیں ہوسکتی کہ بیٹی کو کھا جائے۔ اس طرح اُردو اور پنجابی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

سندھی اور اُردو کے لسانی روابط:

ماہرین لسانیات نے دنیا کی مختلف زبانوں کو مندرجہ ذیل بڑے خانوادوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ سامی ۲۔ ہند چینی ۳۔ دراوڑی ۴۔ مونڈا ۵۔ افریقہ کی بانتو
۶۔ قدیم امریکی ۷۔ ملایا ۸۔ ہند یورپی (آریائی)

ان میں سے ہند یورپی خاندان بہت بڑا اور اہم بھی ہے۔ اس میں ایشیا اور یورپ کی اکثر زبانیں شامل ہیں۔ اس خاندان کی زندہ زبانوں کو مندرجہ ذیل آٹھ شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ ہند ایرانی یا آریائی ۲۔ آرمینی ۳۔ بلقانی سلانی ۴۔ البانوی
۵۔ ہیلینی ۶۔ اطالوی ۷۔ کیلٹک (کلدانی) ۸۔ ٹیوٹونی

ہماری زبانوں کا تعلق بھی اسی ہند ایرانی خاندان سے ہے۔ ہند ایرانی آریائی کو مندرجہ ذیل تین شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ داردک ۲۔ ایرانی ۳۔ ہند آریائی

اُردو اور وادیٔ سندھ کی دیگر زبانیں: باہر کی زبانیں یہاں اپنی اصل صورت میں تو قائم نہ رہ سکیں البتہ اپنے اثرات اور باقیات ضرور چھوڑ گئیں۔ البتہ ان کا مختصر جائزہ اور وادیٔ سندھ کی زبانوں کے ساتھ ان کا تقابلی مطالعہ مختصراً پیش کیا جاسکتا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ بیرونی زبانوں نے یہاں کی زبانوں پر کیا اثرات قائم کیے اور وادیٔ سندھ کی زبانوں میں اس سے کیا کیا تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔

منڈا گروہ:

اس گروہ میں مندرجہ ذیل زبانیں آ جاتی ہیں۔ سنتالی/کھیواڑی، منڈاری، کوڑکو، کھاڑیہ، جوانگ، سورہ، کوابا وغیرہ۔ پنجابی، سرائیکی اور سندھی میں بہت سے الفاظ ایسے ملتے ہیں جو منڈاری زبان کے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً:

اُردو	منڈاری	پنجابی	سندھی
نسل / پیڑھی	پیڑھی	پیڑھی	پیڑھی
جسم	دیھ	دیھ	دیہی
سر	منڈی	منڈی	منڈھی
کمرا ڈھاک	ڈویا	ڈھوئی	ڈھاک
پاؤں	کھری	کھر	کھر
ران	جانگ	جنگھ	چنگھ
انتظار	تانگی	تاہنگ	تانگھ
قطار	لار	لار	لار
روڑا	روڑا	روڑا	روڑو[12]

اگر پنجابی اور سندھی کا جائزہ لیا جائے تو اور بھی بہت سے الفاظ مل جائیں گے جو منڈاری گروہ کی زبانوں سے مماثلت رکھتے ہوں گے۔ تاہم پنجابی، سندھی اور سرائیکی زبانوں کو منڈاری زبانوں کے گروہ میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ لسانی ساخت کے لحاظ سے منڈاری زبانیں مختلف ہیں۔ منڈاری/سنتالی زبانوں میں فعل آتا ہے اور اس کے ساتھ لاحقے شامل کر کے جملہ بنایا جاتا ہے۔

لفظ کے درمیان بھی دوسرا حرف ملا کر نیا لفظ بنا لیتے ہیں اور اس کے معنی لیے جاتے ہیں، مثلاً اسی لفظ ''دل'' کے درمیان میں ''پ'' کا حرف لگا کر نیا لفظ دپل بنایا جاتا ہے اور اس کے معنی ہوں گے ''ایک دوسرے کو مارنا۔''

اُردو، وادیٔ سندھ کی زبانیں اور دراوڑی زبانیں:

پنجابی، سندھی اور سرائیکی زبانوں میں دراوڑی کے الفاظ زیادہ ملتے ہیں، نمونے کے طور پر کچھ الفاظ لیے جاتے ہیں۔

اُردو	تامل	تلگو	ملیالم	کناری	دیگر	پنجابی	سندھی
پاؤں	پڈم	-	-	-	-	-	پڈم (خوبصورت پاؤں)
منھ	وایے	نور	واے	بایے	-	وات	وات
چوٹی	-	-	-	-	چوٹی	چوٹی	چوٹی (سر کے بال)
ہتھیلی	تلی	تل	تل	تل	ترے (تلوے زبان)	تلی (ہاتھ کی)	تری (ہاتھ کی)

''موہن جودڑو'' سے جو مہریں دستیاب ہوئی ہیں، ان کی تحریر کو پن ہیگن کے انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے ماہرین، ڈاکٹر پرپولا اور سیموئل پرپولا اور روسی ماہرین نے کمپیوٹر کے ذریعہ پڑھنے کی کوشش کی ہے، ان کی رائے ہے کہ موہن جودڑو کی زبان دراوڑی زبانوں کی ماں تھی۔ انھوں نے جو نتائج ظاہر کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ الفاظ نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں[۱۳]۔

''موہن جودڑو'' کی مہر کا لفظ	معنی	پنجابی	سندھی
پیٹنی	کنگی	کنگی	پھنی /پ/ نے /پھ/ کی صورت اختیار کر لی ہے
کڑائی	مجموعہ بالوں کا گچھ	کوڑی (بیں کا مجموعہ)	کوڑی (بیں کا مجموعہ)
چکرا	چکرہ	چکرا	چکرو

مُنڈا	مٹکا	مٹکا	مُٹُی
کوٹائی	قلعہ	کوٹ	کوٹ
کٹی-کٹئیل	چارپائی	کھٹ	کھٹ

وادیٔ سندھ کی زبانوں اور آریائی زبانوں میں الفاظ کے علاوہ صوتیات میں بھی مماثلت ہے اُردو اور پنجابی کے تمام صوتیے سنسکرت اور دوسری آریائی زبانوں میں بھی ہیں۔ مندرجہ ذیل صوتیے صرف سندھی اور سرائیکی میں ہیں:

''ٻ ، ڄ ، ڳ ، ڏ ننج ، ننگ ۔''

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی لکھتے ہیں:

> ''سندھی رسم الخط ۵۲ حروف پر مشتمل ہے۔ جس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصے میں ۳۲ حروف آتے ہیں، جو تلفظ اور شکل وصورت میں اُردو حروف کے مشابہ ہیں، مثلاً
>
> ا ب ت ث پ ج ح خ چ جھ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ
> ع غ ف ق گ گھ ل م ن و ھ ء ي
>
> سندھی میں ''ي'' کہیں بھی آئے، اس کے نیچے دو نقطے ضرور دیے جاتے ہیں۔ حروف 'ر' اور 'م' اس طرح بھی لکھے جاتے ہیں۔ ر ، ز ، م ، سندھی بولنے میں ''ی'' معروف بھی ہے اور مجہول بھی لیکن تحریر میں ان کی ایک ہی صورت لکھی جاتی ہے: ''اي'' جو معروف سے مشابہ ہے۔ سندھی ''ھ'' صرف ایک ہی طریقہ پر لکھی جاتی ہے۔ ہائے ملفوظی (ہرگز نہیں ہوتی)۔''۱۴

سندھی رسم الخط میں دوسرے ۱۲ حروف ہیں:

ٽ (ٹ) ، ٿ (تھ) ، ڌ (دھ) ، ڪ (ک) ، ک (کھ) ،
ڀ (بھ) ، ڦ (پھ) ، ڍ (ڈھ) ، ڇ (چھ) ، ٺ (ٹھ) ، ڙ
(ڑ) ، ڊ (ڈ) ۔

سندھی، پنجابی اور سرائیکی میں ''ن'' کے مشابہ ایک دوسری آواز بھی ہے جو سندھی میں اس طرح لکھنا شروع کیا ہے ''ڻ'' سندھی میں ۶ آوازیں ایسی ہیں جو سرائیکی کے علاوہ دوسری پاکستانی زبانوں میں نہیں ہیں، ان کو سندھی رسم الخط میں اس طرح لکھا جاتا ہے: ٻ (ب) کی طرح کی آواز۔ ڄ (ج) کی طرح کی آواز ، ڏ (ڈ کی طرح کی آواز) ، ڳ (گ کی طرح کی آواز)۔ ڃ (نون آمیختہ ج) ، ڱ (ن آمیختہ گ)۔

سندھی اور سرائیکی کے صوتیے:

ٻ ، ڄ ، ڃ (ڃ) ڳ (ڏ) ڎ ، ڱ (ڱ) پنجابی میں نہیں ہیں۔

پنجابی، سرائیکی اور سندھی آوازیں:

''بھ ، تھ ، ٹھ ، پھ ، چھ ، دھ ، ڈھ ، رھ ، ڑھ ، کھ ، گھ ، لھ ، مھ ، نھ ، ھ ۔''[۱۵]

اُردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی میں نہ صرف تاریخی نقطۂ نظر سے باہمی اشتراک ہے بلکہ ضرورت کے وہ الفاظ جو روزمرہ کے کاروبار میں شامل ہیں نہ صرف اُردو اور سندھی میں رائج ہیں بلکہ سرائیکی اور پنجابی کا بھی ان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ذیل میں ہم ان مروج الفاظ کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں: جو اُردو، پنجابی، سندھی اور سرائیکی میں مشترک ہیں۔

غذائی چیزیں:

آٹا ، چاول ، آچار ، چائے ، قہوہ ، گوشت ، مکھن ، انب ، گاجر، پلا ، دال، انگور ، میوہ ، بادام ، مٹر ، ادرک ، پان ، مچھلی ، کدو ، توری ، پالک ، حلوا ، گوبھی ، قیمہ ۔

مدرسے کی چیزیں:

مدرسہ ، اسکول ، مکتب ، کالج ، کمرہ ، عمارت ، کورس ، نصاب ، حساب، تاریخ ، امتحان، استاد ، سلیٹ ، قلم ، کاغذ ، کاپی ، میز ، کرسی ، بنچ ۔

جانوروں کے نام:

طوطا ، مچھر ، مکھی ، ہرن ، سؤر ، ناگ۔

گنتی کے مشترک الفاظ:

چار ، چھ ، سات ، آٹھ ، نو ، بارہ ، تیرہ ، چودہ ، پندرہ ، سولہ ، سترہ ، ساٹھ ، ستّر ۔

پشتو اور اُردو کے لسانی روابط:

پشتو صوبہ سرحد کی زبان ہے۔ اسے پختون یا پشتون باشندے بولتے ہیں جن کو عموماً افغان یا پٹھان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پشتو ایک بہت قدیم زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں کا ذکر اوستا، وید اور مہابھارت میں آتا ہے۔ پشتو زبان کی موجودہ عربی پشتو رسم الخط سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں قاضی سیف اللہ نے تیار کیا تھا۔ عربی اور فارسی حروف کے علاوہ ہندوستانی زبانوں کی آوازوں:

ٹ ، ڈ ، ڑ اور گ کو اس طرح لکھا:

ټ ، ډ ، ړ ، ک

پشتو زبان کی منفرد اور مخصوص اصوات:

غ (ز) ، ح (س-ث) ، ښ (خ-س) ، ږ (گہ) اور ن ڑا اور "ن" سے مل کر پیدا ہونے والی آواز۔

پشتو کے خاص حروف ژند اور سنسکرت میں بھی ہیں۔

پشتو زبان کا مکمل رسم الخط:

(س) ح ، خ ، د ، ډ (ڈ) ، ذ ، ړ (ڑ) ، ز ، ژ ، (ژ ، ږ) نبر (گ) ،
س ، ش ، ښ (خ ، س) ، ص ، ض ، ط ، ظ ، ع ، غ ، ف ، ق ، ک ، گ ، م ،
ن ، ل ، و ، ھ ، ء ، ی ، یے ز ۔

شاہ محمد عباسی لکھتے ہیں:

> "پشتو کا ایک خطہ وہ ہے جس میں شمال مغربی حصے بشمول وادئ سوات اور وادئ کا

> غان کے علاوہ افغانستان کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں رہائش پذیر ہیں۔ پشتو کا دوسرا علاقہ وادئ پشاور ہے، جس میں مردان کا ضلع بھی شامل ہے۔ تیسرا حصہ وادئ کرم اور شمالی وزیرستان ہے، چوتھا حصہ ڈیرہ اسماعیل خان کا علاقہ ہے، جس میں جنوبی وزیرستان بھی شامل ہے۔"[۱۶]

اس کے علاوہ پشتو بلوچستان کے شمال مشرقی حصوں (بالخصوص کوئٹہ پشین اور لورالائی) میں بھی بولی جاتی ہے۔ پنجاب کے اضلاع مثلاً اٹک اور میانوالی کے پٹھان بھی بولتے ہیں۔ پشتو زبان کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ جملے پشتو زبان کے ہیں اور اس کتبے کے متعلق ماہرین کا خیال ہے کہ وہ تین سے ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ یہ تین جملے نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ نہ اڑیک ہم (نہ میں ضدی یا اڑیل ہوں)

۲۔ نہ دروزن یم (نہ میں جھوٹا ہوں)

۳۔ نہ روزکڑے یم (نہ میں جابر ہوں)

ذیل میں پشتو، اُردو، بلوچی، پنجابی، سندھی اور کشمیری کا لسانی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

پشتو	اُردو	بلوچی	پنجابی	سندھی	کشمیری
پوڑئی	پڑیا	پُڑی	پُڑی	پُڑی	پوڑی
اُبہ	آب	آپ	پانی	آب (پانی)	آب
آتھ	آٹھ	ہشت	اٹھ	اٹھ	آٹھ
آرہ	آرا	کھڈگ	آرا	اَرو	تتر
آسرہ	آسرا	اومیت	اسرا	آسرو	توقع
آسودہ	آسودہ	آسودگ	اسودہ	آسودو	آسودہ
اشنا	آشنا	آشناگ	اشنا	آشنا	آشناو[۱۷]

اسی طرح بہت سے الفاظ میں پشتو، اُردو اور پاکستانی زبانوں میں یکسانی ہے مغلوں میں بھی مطابقت ملتی ہے۔ یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ لسانیاتِ پاکستان اُردو زبان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو ہماری لنگوا فرینکا ہے۔

بلوچی اور اردو کے لسانی روابط :

بلوچی زبان فارسی زبان سے اثر پذیر ہوتی رہی ہے۔ اس لیے بعض حضرات کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ بلوچی فارسی کی مسخ شدہ صورت ہے۔ ہیروڈوٹس نے بلوچی زبان کو مکوٹی (Mykoti) اور مکرانی کو میکنس (Mykans) کہا ہے۔

یہاں بلوچی سے مراد مشرقی بلوچی اور مکرانی سے مراد مغربی بلوچی ہے۔ عرب سیاحوں کے بیانات سے ظاہر ہے کہ وہ مکرانی (بلوچی) کو فارسی سے الگ زبان شمار کرتے تھے۔ اصطخری لکھتا ہے: مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔ فارسی زبان تاجر لوگ بولتے ہوں گے، جن کے ایران کے ساتھ تعلقات تھے۔ شریف الادریسی (۱۰۹۹ء تا ۱۱۶۴ء) نے بھی لکھا ہے: مکران کی زبان مکرانی اور فارسی ہے۔ حوقل کا بھی یہی بیان ہے۔ اس کی تصدیق ''مارکو پولو'' بھی کرتا ہے۔ مارکو پولو چین جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تھا۔ اس کا بیان یہ ہے کہ مکران میں ایک خاص قسم کی زبان بولی جاتی ہے۔

بلوچی صوتیات اور صرف و نحو کی اپنی انفرادی خصوصیات ہیں۔ اس لیے بلوچی قدیم اور الگ زبان مانی جاتی ہے۔ گریرسن اس سلسلے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ یہ (بلوچی) فارسی سے قرابت رکھتی ہے۔ فارسی کی شاخ سمجھنا غلط ہے۔ ایرانی زبان سے الگ انفرادی حیثیت کی مالک ہے۔ پروفیسر گائیگر (Geiger) کا حوالہ ضروری ہے۔ جو بلوچستان کی دوسری تمام بولیوں میں سے بلوچی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ اس کی اصوات نمایاں طور سے عہد قدیم سے متعلق ہیں۔ کچھ حروف صحیح بھی مخصوص ہیں۔ صحیح حروف کے نظام کے اعتبار سے بلوچی زبان بلحاظ لسانی ارتقاً ایک ایسے مرحلے کی نشاندہی کرتی ہے، جہاں فارسی زبان نے اسے کوئی پندرہ سو سال ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ محمد سردار خان لکھتے ہیں:

> ''بلوچی زبان کے گرد بنا ہوا فارسی و سندھی الفاظ کا سارا تار و پود اگر الگ کر دیا جائے تو یہ ایک ایسی زبان کی برہنہ شاخ کی صورت اختیار کر جاتی ہے جو اصل اور صوتیات کے لحاظ سے قدیم سامی خاندان کی عظیم یادگار ہے۔''[۱۸]

پنجابی، سندھی، سرائیکی اور ہندکو زبانوں کے اثرات کی وجہ سے بلوچی زبان میں ''ٹ'' ''ڈ'' اور ''ڑ''

کے اصوات شامل ہو گئے۔ سندھ میں جو بلوچی زبان بولی جاتی ہے اس میں سندھی الفاظ بھی داخل ہوئے۔ اس کی وجہ سے سندھ کی بلوچی زبان میں ''پ''، ''گ''، ''ڈ''، ''بھ''، ''ڈھ''، ''چھ'' وغیرہ خالص سندھی اصوات بھی رائج ہیں۔ تاہم معیاری اور تحریری بلوچی زبان میں یہ نہیں ہیں۔ تحریری زبان کی رسم الخط مندرجہ ذیل حروف پر ہے:

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض
ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن ں ء ی ے ۔

بلوچی زبان میں فعل تذکیر و تانیث کے فرق کے بغیر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف پاکستان کی دوسری زبانوں میں تذکیر و تانیث کا ایک مکمل نظام موجود ہے۔ مثلاً اُردو میں ''کھانے'' کے لیے مصدر ''کھانا'' استعمال ہوتا ہے اور پینے کے لیے ''پینا'' رائج ہے۔ لیکن بلوچی میں پینے اور کھانے کے لیے ایک ہی مصدر ''ورگ'' استعمال ہوتا ہے۔

بلوچی کے لہجے:

مری بلوچی، رخشانی بلوچی، مکرانی بلوچی اور رخاوری بلوچی لہجے مشہور ہیں، لیکن اصل میں اس کے تین بڑے گروہ ہیں:

(۱) مشرقی بلوچی (۲) مغربی بلوچی (۳) رخشانی

مشرقی بلوچی میں سندھی اور ''لہندا'' کے الفاظ شامل ہیں۔ اور مغربی بلوچی میں فارسی کے الفاظ کی کثرت ہے۔ مشرقی اور مغربی بلوچی میں لسانی تفاوت پائی جاتی ہے۔ مشرقی بلوچی میں کہیں ''گ'' کی جگہ خالص سندھی اور سرائیکی صوتیہ ''گ'' استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی بلوچی میں ''ن - ط'' کا صوتیہ بھی مستعمل ہے۔ جو سندھی زبان سے آیا ہے، سندھی ہی کے زیر اثر مشرقی بلوچی میں ''ک'' اور ''ب'' کی جگہ ''کھ'' اور ''بھ'' بھی مستعمل ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر لکھتے ہیں:

> ''کجل: کاجل، بلوچی، سندھی اور جٹکی میں بھی ''کجل'' یہ اصلاً سنسکرت لفظ کاجلہ ہے جس سے اُردو'' کاجل'' بنا ہے۔ پنجابی میں کجل۔
>
> کپوت: براہوئی بمعنی، کبوتر، بلوچی ''کپوت'' اور ''کبودر'' اُردو؛ سندھی اور جٹکی سرائیکی میں ''کبوتر'' ہے۔

> کڑی: براہوئی، سندھی، جٹکی، سرائیکی اور بلوچی میں بمعنی زنجیر، چھلا استعمال ہوتا ہے۔
> اُردو میں ''کڑا'' مذکر کے لیے اور مؤنث کے لیے ''کڑی'' بمعنی لوہے کا حلقہ، چھلا آتا ہے۔ مماثلت واضح ہے، پنجابی کڑی۔
>
> گھڑی: براہوئی اور اُردو میں بمعنی وقت کا ایک حصہ، ساعت پنجابی گھڑی بمعنی حصۂ وقت نیز گھڑے کی مؤنث۔
>
> لٹ: براہوئی بمعنی لٹھ، ڈنڈا، چھڑی، سونٹا۔ اُردو، بلوچی، جٹکی اور سندھی میں ''لٹھ'' بولا جاتا ہے۔
>
> لڑ: بمعنی صف، قطار، طرف، جمعیت۔ براہوئی کے علاوہ بلوچی، پشتو، جٹکی، سرائیکی اور سندھی میں ''لڑ'' بولا جاتا ہے۔ اُردو میں لڑ بمعنی لڑی، ڈوری، رسی کا بل، قطار، لائن، وسیلہ، زنجیر، ٹولی اور جماعت آتا ہے۔
>
> ھڈ: براہوئی بمعنی ہڈی۔ اُردو میں بھی ہڈی ہی بولتے ہیں، پنجابی ہڈ ہے۔''[۱۹]

الفاظ کے اس لسانی جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوچی زبان اور اُردو میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس طرح اُردو زبان کی تشکیل میں لسانیاتِ پاکستان کا اہم کردار ہے۔

براہوی اور اُردو کے لسانی روابط:

بلوچستان کے قلات ڈویژن اور بعض دوسرے حصوں میں بولی جاتی ہے۔ یہ علاقہ بے قاعدہ مستطیل ہے۔ جو شمال میں قدرے لمبی اور جنوب میں قدرے چھوٹی ہے۔ بلوچی زبان مشرقی لہجے کو مغربی لہجے سے علیحدہ کرتی ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جو کوہ سلیمان سے کوہ کیرتھر کے مغرب میں واقع ہے۔ اور سطح سمندر سے ۵۰۰ فٹ سے ۸۰۰۰ فٹ سے بھی زیادہ بلند ہے۔

براہوی زبان کے بولنے والے یہاں آنے سے پہلے ''کوہ البرز'' میں رہتے تھے۔ اس لیے بُرز کوہی کہلائے جو بعد میں تبدیل ہو کر بروئی یا بُراہوئی بن گیا۔ دوسری رائے یہ بھی ہے کہ براہوئی قدیم فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں پہاڑی آدمی۔ تیسری رائے یہ ہے کہ قدیم زمانے سے براہوئی قبائل کا سندھ سے تعلق رہا ہے اور روزگار حاصل کرنے کے لیے سندھ میں آتے رہے ہیں۔ براہوئی کا لفظ سندھی زبان کے لفظ ''رو'' سے نکلا ہے

جس کے معنی پہاڑ اور ''با'' کی براہوئی زبان میں معنی ''سر'' ہے۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی لکھتے ہیں:

> ''ماہرین کا خیال ہے کہ براہوئی زبان نہ تو آریائی زبان ہے اور نہ چینی یا تبتی کی طرح یک لفظی یا یک رکنی ہی ہے۔ یہ زبان سامی زبانوں کے خاندان سے بھی تعلق نہیں رکھتی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دراوڑی زبان ہے جس میں بعد میں دوسری زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہوگئے۔ اس زبان کی اساسی ساخت اور بنیادی الفاظ مثلاً منہ، کان، آنکھ، سر، خون، نیند وغیرہ دراوڑی خاندان کے ہیں۔''[۲۰]

براہوئی زبان میں لاحقے ''ک''، ''ٹ'' اور ''سنک'' جمع کی صورت ظاہر کرتے ہیں، مثلاً براہوئی میں بیٹی کو ''مسڑ'' کہتے ہیں۔ اس کی جمع ہوگی ''مسنک'' ذیل میں مختلف دراوڑی زبانوں کی واحد جمع کی صورتیں پیش کی جاتی ہیں۔

اُردو		براہوئی		تامل		تلگو		کناری	
واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
گھوڑا	گھوڑے	ہُلی	ناڑیاک	ہڑیری	ہڈیری گال	گُروام	مامگڑامولو	کدوڑ	ڈڈرگال
گاؤ	گائیں	ڈُگی	ڈُگیک	پائی	پائکال	اوُ	اوولو	اکالو	اکالوگالو
کتا	کتے	کوچک	کوچکاک	نایے	نایے گال	مکسکوک	مکسکو کلو	نای	نای گال
بکری	بکریاں	کیٹ	کیٹک	آڈو	آڈوگال	میک	میک لو	میک	میکلو

آدمی، بندہ، بندک (یہ لفظ دراوڑی نہیں ہے لیکن جمع کی صورت دراوڑی ہے)۔ ''ڑ''، ''تا''، ''ای''، ''اں''، ''لو''، ''کی'' لاحقے جنس کی نسبت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ایڑ = لڑکی، مسڑ = بیٹی، ڈگی = گائے، منڈ = کتیہ، مٹ = بکری، ہیٹر = بہن، ہلفڑ = ساس یعنی ''ڑ'' اور ''ای'' تانیث کی نسبت ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری دراوڑی زبانوں میں بھی مؤنث کے لیے ''ٹی''، ''ڈی''، ''ٹ''، ''ڑ''، ''لو''، ''یو'' لاحقے آتے ہیں۔

براہوی میں مصدر کے لیے ''نگ'' کا لاحقہ آتا ہے۔ مثلاً ''تو ننگ'' = رکھنا، ''پلنگ'' = چھیننا، ''مٹرنگ'' = لڑنا، ''بننگ'' = سننا۔

بلوچی زبان میں مصدر کے لیے ''اگ''، اُردو کے لیے ''نا'' پنجابی کے لیے ''ݨ''، سرائیکی کے لیے ''ݨ'' لاحقے آتے ہیں۔ اس لاحقے کے لحاظ سے براہوئی زبان سندھی اور کشمیری کے قریب ہے۔ کیونکہ سندھی زبان میں دراوڑی باقیات بکثرت موجود ہیں۔

براہوی زبان اور پاکستان کی دوسری زبانیں: لسانی ساخت اور صرف ونحو کے لحاظ سے براہوئی زبان دراوڑی ہے۔ اس میں آریائی زبانوں کے عناصر اور عربی، فارسی، بلوچی، سندھی اور ہندی کے الفاظ بھی بکثرت ہیں۔ عددوں کو دیکھا جائے تو صرف پہلے تین عدد دراوڑی زبانوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ باقی عدد آریائی زبانوں سے لیے گئے ہیں۔ مثلاً

اُردو	براہوی	پنجابی	سندھی	پارسی	پشتو	بلوچی
چار پانچ چھ	چار پنچ شش	چار پنج چھ	چار پنج چھ	چہار پنج شش	سلور پنثر شپن	چار پنچ شش

براہوئی زبان نے اپنی ہمسایہ بلوچی سے بھی الفاظ کا تبادلہ کیا ہے۔ کئی اسم دونوں زبانوں میں ایک جیسے ہیں، کچھ افعال باہم ملتے ہیں۔ مثالیں:

اُردو	بلوچی	براہوی
چور چور ہونا، منہدم ہونا	پڑگ	پُرنگ
بیچنا	بہچنگ	بہچنگ
ڈوبنا	ٹبڈنک	بڈنگ
پچانا	برگ	برنگ
بھولنا	بُھلنگ	بُھلنگ

براہوئی زبان دوسری پاکستانی زبانوں سے الگ تھلگ نہیں رہی بلکہ ہم وطن زبانوں کے ساتھ اس گہرے تاریخی، لسانی اور ثقافتی روابط رہے ہیں۔ براہوئی زبان کے کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ قدیم زمانے میں براہوئی زبان خروشتی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ ایک فرانسیسی عالم ''موسیو فوشہ'' نے اُن حروف کا ترجمہ کیا ہے جو ایک قدیم سکے پر لکھے ہوئے ہیں۔ ترجمہ ہے: ''پہاڑوں کا مالک۔'' سکے پر ''مہش والا'' لکھا ہے۔ تو ''مہش'' یا ''مش'' براہوئی میں ''پہاڑ'' کو کہتے ہیں۔ ''وارا'' سندھی لفظ ہے جس کی پنجابی اور اُردو شکل ''والا'' ہے۔ براہوئی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، عربی اور فارسی حروف کے علاوہ ''ٹ، ڈ، ڑ'' اُردو رسم الخط کی طرح لکھے جاتے ہیں۔

دوسری پاکستانی زبانوں کی طرح ''ہائیہ اصوات'' بھی ہیں۔ اُردو رسم الخط ہی کی طرح لکھی جاتی

ہیں۔ مثلاً ’’بھ ، پھ ، تھ ، ٹھ ، جھ ، چھ ، دھ ، ڈھ ، رھ ، کھ ، گھ‘‘۔ براہوئی کامخصوص ’’ل‘‘ بھی ہے۔ جسے براہوئی کے سوا دوسرا شخص ادا نہیں کرسکتا۔ ’’سرڈینس برے‘‘ نے اس کو رومن لپی میں "Lh" کرکے لکھا ہے۔ یہ آواز ہائے مخلوط کی تند آواز ہے۔ ڈاکٹر بارکر نے لکھا ہے کہ یہ آواز ریڈ انڈین کے لہجے میں موجود ہے۔

براہوئی زبان کامخصوص ’’ل‘‘ کسی لفظ کے شروع میں نہیں آتا۔ صرف آخر میں یا درمیان میں آتا ہے۔ مثلاً: تیاڷ = بچھو ، سبڷ = موسم سرما ، نڷ = درد ، پاڷ = دودھ ، ثپلنگ = دھانا۔

عربی براہوی رسم الخط:

ا ، ب ، بھ ، پ ، پھ ، ت ، تھ ، ث ، ٹ ، ٹھ ، ج، جھ ، چ ، چھ ،
ح ، خ ، د ، دھ ، ڈ ، ڈھ ، ذ ، ر ، رھ ، ڑ ، ز ، ژ ، س ، ش ، ص ، ض ، ط ، ظ،
ع ، غ ، ف ، ق ، ک ، کھ ، گ ، گھ ، ل-ڷ ، م، ن ، و ، ھ ، ء ، ی ، ے۔

براہوی زبان کے بڑے بڑے مصنفین درج ذیل ہیں:

محمد عبداللہ درخانی دوسرا نام مولانا حاجی نبو خان، حاجی عبدالمجید چوتوئی، علامہ عمر دین پوری وغیرہ۔

موجودہ دور میں ادیب اور شاعر براہوی زبان میں طبع آزمائی کررہے ہیں اور جدید اسلوب اور مختلف اصناف سخن میں اشعار، افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھ رہے ہیں۔

سرائیکی اور اردو کے لسانی روابط:

سرائیکی زبان کا علاقہ سندھی زبان اور پنجابی زبان کے حلقوں کے درمیان میں ہے۔ موجودہ بہاولپور، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان اور ملتان پر مشتمل ہے۔ قدیم زمانے میں یہ علاقہ حکومت سندھ کی حدود میں شامل تھا۔ عربوں کے وقت بھی سندھ، ملتان ایک حکومت کے زیر اثر رہے ہیں جن کا دارالحکومت اروڑا تھا۔ جو روہڑی سے چھ میل کے فاصلے پر ایک قدیم شہر تھا۔

سرائیکی علاقہ قدیم زمانے میں حدودِ سندھ میں شامل تھا۔ اس نسبت سے اس علاقہ کی زبان کو سرائیکی

یعنی ''سرے'' کی زبان کہا گیا ہے۔ اس زبان کو یہ نام ملتان اور سندھ کے ایک سرحدی شہر ''سرادا'' کی نسبت سے ملا ہے۔ اس کی ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ جب زمامِ حکومت ملتان والوں کے ہاتھ میں رہی۔ ان کی محل سراؤں میں جو زبان مستعمل تھی، اسے اسی نسبت سے ''سرائیکی'' کہا جانے لگا۔ سرائیکی زبان ہندوؤں کے دورِ اقتدار میں دیوناگری لپی میں لکھی جاتی تھی۔ لسانی لحاظ سے سندھی کی سگی بہن معلوم ہوتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کسی قدیم زبان سے نکلی ہیں۔ یہ زبان قدیم زمانہ سے وادیٔ سندھ کی بول چال کی زبان رہی۔

سرائیکی کے لہجے:

۱۔ سرائیکی: صوبہ سندھ کی شمالی سرحد کی زبان
۲۔ بہاولپوری: بہاولپور کے علاقہ کی زبان
۳۔ ڈیرہ والی: ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کی زبان
۴۔ مظفرگڑھی: ضلع مظفرگڑھ کی زبان
۵۔ ہندکو: پشاور کے علاقہ کی زبان
۶۔ ملتانی: ملتان کے علاقے کی زبان
۷۔ اوچی: اوچ کی زبان
۸۔ جھنگ: میانوالی کی زبان، ضلع جھنگ
۹۔ شاہپوری: ضلع شاہ پور کی زبان

گریرسن کی مشہور تصنیف ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا'' میں دو مقامات پر سرائیکی کے متعلق مفصل بحث کی گئی ہے[۱۲]۔ اُن کے مطابق سندھ کو تین حصوں (یعنی لاڑ، وچولہ، سرا) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جبکہ پنجاب کے تعلق کی وجہ سے اس زبان کو دو حصوں (سندھی سرئیکی اور لہندا سرائیکی) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ گریرسن نے سرائیکی کو سندھی سرائیکی اور لہندا سرائیکی میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ سندھ کے جنوبی حصے کی سرائیکی پر سندھی زبان کے الفاظ و محاورات کی بہت آمیزش ہے، جو شمالی سندھ اور مغربی پنجاب کی ''لہندا سرائیکی'' میں نہیں۔

سندھ کی سرحد سے متعلقہ شمالی حصہ خصوصاً سابق ریاست بہاولپور، جنوب کی طرف چولستان، ضلع رحیم یار خان اور ضلع ڈیرہ غازی خان کی تحصیل راجن پور کی زبان کو قدیم زمانے سے سندھ والوں نے سرائیکی کا نام دیا ہے۔ ''لہندا'' یا ''ہندوی'' کا مخصوص سرائیکی محاورہ جنوب کی طرف اور ضلع سکھر اور جیکب آباد میں بولا جاتا ہے۔ سندھی اور ہندوی کا آپس میں گہرا امتزاج پایا جاتا ہے۔ خود لفظ ''سرائیکی'' اسی محاورہ (Dialect) کا نام ہے جس میں سندھی اور ہندوی کے اجزا بالکل مشترکہ طور پر موجود ہیں۔

سعید احمد نے تاریخ ضلع رحیم یار خان میں لکھا ہے: ''سندھ سے ملحقہ علاقوں میں سندھی بولی جاتی ہے۔''[۲۲] البتہ پنجابی زبان والے سرائیکی کو الگ زبان تسلیم نہیں کرتے ان کا خیال ہے کہ سرائیکی پنجابی زبان ہی کا ایک لہجہ ہے۔ ڈاکٹر کے ایس بیدی اس کو پنجابی زبان کی ایک بولی مانتا ہے، یہ بولی ملتان، منٹگمری، مظفر گڑھ اور میانوالی اضلاع میں بولی جاتی ہے۔

پنجابی اور سرائیکی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ البتہ سرائیکی کے مندرجہ ذیل صوتیے پنجابی زبان میں نہیں پائے جاتے۔

ٻ ، ڄ ، ڳ ، ڏ (ڎ) ، ڃ (ڃ) ، ڱ (نگ)۔

یہ صوتیے صرف سندھی زبان میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سرائیکی کو پنجابی زبان کی شاخ نہیں مانتے بلکہ اس کو ایک الگ مستقل زبان قرار دیتے ہیں۔ اُردو لسانیات کے ساتھ پنجابی، سرائیکی اور سندھی کا گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ پنجابی، اُردو میں ''ڈ'' استعمال ہوتا ہے تو سرائیکی اور سندھی میں ''ڏ'' آتا ہے۔

سرائیکی اور سندھی میں ''ڳ'' اور مشرقی پنجابی میں ''گ'' آتا ہے۔ سندھی، سرائیکی اور مشرقی پنجابی کے بہت سے الفاظ میں صوتیات کا فرق ضرور ہے۔ لیکن الفاظ کی ساخت اور صورت بالکل ایک سی ہے۔ صوتیات کے علاوہ صرفیات اور نحویات میں بھی اصولی طور پر سندھی اور سرائیکی میں بڑی حد تک یکساں ہے۔ سندھی اور سرائیکی میں مصدر کی نشانی بالکل ایک جیسی ہے۔ سندھی اور سرائیکی میں نشان مصدر ''اڻ'' ہے پنجابی میں ''اڻ'' یا ''نا'' اور اُردو میں ''نا'' ہے۔

ہندکو اور اردو کے لسانی روابط:

حسین احمد قریشی لکھتے ہیں:

> ''ہندکو' صوبہ سرحد میں پشتو کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ ضلع ہزارہ سے جنوب مغرب میں ڈیرہ اسماعیل خان تک موجود ہے۔ ہندکو اور پنجابی میں گہری مماثلت ہے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ہندکو کو پنجابی زبان کی شاخ یا بولی کہا جاتا ہے۔''[۲۳]

لیکن ہندکو زبان کے محقق اسے ایک الگ زبان اور قدیم زبان قرار دیتے ہیں۔ لسانی نقطۂ نظر سے ''ہندکو' سرائیکی ملتانی سے بھی ملتی ہے، بلکہ پنجابی سے زیادہ سرائیکی کے قریب ہے۔ اسی وجہ سے سرائیکی زبان کے محقق اس کو سرائیکی زبان کی ایک بولی تصور کرتے ہیں۔ پنجابی زبان کے بعض محققین بھی ملتانی سرائیکی اور ہندکو کو ایک ہی بولی تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بیدی نے پنجابی زبان کی بولیوں کے تحت ملتانی اور لہندا کو پنجاب کی بولی شمار کیا ہے۔

''ہندکو'' کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف نظریے ہیں، ایک نظریہ یہ ہے کہ پہاڑی علاقوں کے رہنے والوں نے شہری اور نشیبی علاقوں میں رہنے والوں کو ''ہندکی'' کہنے لگے۔ اور ان لوگوں کی زبان ''ہندکی'' کی نسبت سے ''ہندکو'' کہلائی جانے لگی۔ پہلے یہ لفظ ''ہندکوہ'' تھا بعد میں ''ہندکو'' ہوگیا۔ یہ ایک آریائی زبان ہے اور ہند آریائی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔

سندھی، سرائیکی اور ہندکو کا لسانی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کئی الفاظ ایک جیسے ہیں۔ مثلاً: ھک (ایک)، ھتھ (ہاتھ)، پیر (پاؤں)، پنج (پانچ)، آٹھ (آٹھ)، نوں (نو)، پنجاہ (پچاس)، سٹھ (ساٹھ)، ستر، اسی، نوے، سو۔

سندھی: ''آرس'' سرائیکی اور ہندکو ''آس''

سندھی: ''ہوریاں'' سرائیکی اور ہندکو ''ہولے''

ہندکو بھی پنجابی، سرائیکی کی طرح اُردو کے بہت قریب ہے۔ اس طرح حافظ محمود شیرانی کا نظریہ درست ثابت ہوتا ہے۔ ''ہندکو' پر پالی اور پشاچی (داردی) زبانوں کا بھی گہرا اثر ہے بلکہ پشاچی اور ہندکو میں گہری مماثلت ہے۔

ہندکو زبان کا علاقہ کئی حملہ آوروں کی آماج گاہ رہا۔ ترک نسل کے ہن، یونانی، ایرانی یہاں آئے اسی لیے اس میں یونانی ترکی اور قدیم پارسی اور عربی کے الفاظ بھی ہیں۔ ہندکو بولنے والوں نے بھی اپنے علاقہ سے نقل مکانی کی۔ لیکن سیاسی' ثقافتی' مذہبی تغیرات کے باوجود اس زبان کی بنیادی ساخت، لسانی خصوصیات اور صوتیاتی نظام میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ مسلمانوں کے دور میں اس زبان میں پارسی اور عربی الفاظ زیادہ داخل ہوئے۔ عربی اور پارسی زبانوں نے اس زبان کے ادبی سرمایہ پر بھی اثر ڈالا۔ زبان کے کچھ محققین کا خیال ہے کہ اُردو زبان نے اسی زبان کی کوکھ سے جنم لیا۔ سیّد فارغ بخاری لکھتے ہیں:

> ''ہندکو بہت پرانی زبان ہے۔ بعض لوگ غلطی سے اس کو پنجابی اور پنجابی کی شاخ سمجھتے ہیں، حالانکہ پنجابی اور اس میں بڑا فرق ہے۔ میں اپنی کتاب ''ادبیات سرحد'' کے دیباچے میں پوری تفصیل بتا چکا ہوں کہ ''ہندکو'' اُردو ہی کی ایک ابتدائی شکل ہے۔ یہی علاقہ اُردو کی اصل جنم بھومی ہے۔ ہندوستان پر شروع سے آخر تک سب حملے ادھر ہی سے ہوئے۔ ان حملوں میں افغانوں کے لشکر ہوتے تھے جن کا پہلا پڑاؤ پشاور میں ہوتا تھا۔ ان لشکروں میں ہی ایک نئی زبان کا ریختہ تیار ہوا۔ جو لشکر کی رعایت سے بعد میں اُردو کے نام سے معروف ہوگئی۔ یہیں سے اٹھ کر یہ لوگ ہندوستان میں جہاں بھی گئے وہاں اس زبان کو رواج دیا، چنانچہ ہندوستان میں دلی، آگرہ، رام پور، بریلی، لکھنؤ اور حیدرآباد میں غرض جہاں جہاں بھی جا کر افغان آباد ہوئے، وہیں اُردو زبان کے مرکز بن گئے۔''[۲۲]

''ہندکو'' زبان اگرچہ قدیم ہے لیکن اس کا قدیم ادبی سرمایہ نہیں ملتا۔ اس زبان میں نظم کے پہلے شاعر ''غلام محمد مائیو'' ہیں۔

اُردو لسانیات اور کشمیری زبان:

یہ زبان صوبہ کشمیر کے باشندوں کی زبان ہے۔ تاہم یہ جموں' گلگت بلتستان کے بعض صوبوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ کشمیر کے باشندے اپنے علاقہ کو ''کشمیر'' کہتے ہیں اور اپنی زبان کو ''کاشر'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سیاحوں' حکمرانوں اور شعرا نے اس علاقے کے قدرتی حسن کی وجہ سے اس کو ''ایران صغیر'' ''مشرق کا یونان'' ''ایشیا کا سوئٹزرلینڈ'' ''کشمیر جنت نظیر'' وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے۔

لفظ کشمیر کی وجہ تسمیہ سے متعلق مستشرقین اور پاک و ہند کے محققین کی رائیں مختلف ہیں۔ ایک یہ رائے ہے کہ پراکرت لفظ کس = نالہ اور میر = پہاڑ کے امتزاج سے کشمیر وجود میں آیا ہے۔

کشمیری زبان کو ہڈیوں کا ڈھانچہ ’’درد‘‘ زبان نے مہیا کیا۔ سنسکرت نے اسے گوشت پوست عطا کیا اور اسلام نے اسے روح بخشی۔ کشمیری حروف تہجی کی تعداد پینسٹھ کے قریب ہے۔ پروفیسر سدھیشو رورما نے لکھا ہے: کشمیری زبان کی خصوصیت اس کا نہایت ہی پیچیدہ اور لطیف نظام حروفِ علت ہے۔ اس میں ایسے باریک حروف علت ہیں، جن کے وجود کو صرف بولنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔ سننے والے کو بہت ہی کوشش اور توجہ کے بعد کہیں ان کا پتہ چلتا ہے۔ مصادر کے لحاظ سے کشمیری، سندھی، سرائیکی، پنجابی اور کسی حد تک اُردو میں گہری مطابقت ہے۔ جس طرح اُردو اور دوسری پاکستانی زبانوں میں عربی اور پارسی الفاظ، مصادر معاون کے طور پر آتے ہیں، اسی طرح کشمیری میں بھی مصادر معاون کے ساتھ مل کر استعمال ہوتے ہیں۔ اُردو میں ’’کرنا‘‘ پنجابی میں ’’کرنٖ‘‘ سرائیکی میں ’’کرݨ‘‘ اور سندھی میں ’’کرݨ‘‘ مصدر معاون کے طور پر آتا ہے۔

کشمیری زبان میں عربی، فارسی الفاظ بھی اسی طرح کثرت سے ملتے ہیں جس طرح اُردو میں ہیں۔ اساسی الفاظ کے لحاظ سے بھی کشمیری زبان کا سندھی، پنجابی، سرائیکی اور اُردو سے گہرا رشتہ ہے۔ چند الفاظ پیش کیے جاتے ہیں:

کشمیری	اُردو	پنجابی	سندھی
ترییہ	تین	تن	ٹرے۔ ٹے
ست	سات	ست	ست
اٹھ	آٹھ	اَٹھ	اٹھ
دہ	دس	دس	ڈہ
وُہ	بیں	بیں	ویہَ
میون	میرا	میرا	مُنھنجو
اسی	ہم	اسی/اسیں	اسیں
تہانڈو	تمہارا	تہاڈا/تساڈا	توھانجو[۲۵]

کشمیری زبان کی اصل کے سلسلے میں بروشسکی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ بروشسکی زبان پاکستان کے علاقہ ”ہنزہ“ اور اس کے آس پاس بولی جاتی ہے۔ کشمیری زبان اور بروشسکی کے اساسی الفاظ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ان میں کوئی مطابقت دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ کشمیری اور اُردو میں بہت مطابقت پائی جاتی ہے:

کشمیری	اُردو	بروشسکی
زَہ	دو	الْتو
ترِیہ	تین	اسکو
ست	سات	تالو
اٹھ	آٹھ	التمابو
نو	نو	ہنچو
دہ	دس	تورمٹو
بوہ	میں	جی - جَ
اتھ	ہاتھ	اِرین
کس	کون/کس	آمین
کیاہ	کیا	بسن
تشہ	تُو	یُن
میٹوں	میرا	جا
کھیہ	کھا	شی
بہ	بیٹھ	ہرت
توہندو	تمہارا	مہ

اس سے ثابت ہوا کہ بروشسکی زبان دوسری پاکستانی زبانوں سے بالکل مختلف ہے اور کشمیری زبان سے اس کی کوئی نسبت دکھائی نہیں دیتی۔

کشمیری زبان میں جو الفاظ ”و“ سے شروع ہوتے ہیں، ان کا ”و“ اُردو اور سرائیکی میں ”ب“

میں تبدیل ہو جاتا ہے، لیکن سندھی اور پنجابی میں ''وٗ'' ہی رہتا ہے۔ مثلاً

کشمیری	اُردو	پنجابی	سندھی
وال	بال	وال	وار
وری	برس	برس/ ورہ	ورہ
وہ	بیس	ویہہ/ ویہہ	ویہ
وانگن	بینگن	بینگن	وانگن
وٗالی	بالی	بالی/والی	والی[۲۶]

کشمیری اور اُردو کے فعل کا تقابلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

کشمیری	اُردو
سہ چھ آمت ۔	وہ آیا ہے۔
ژہ چھک آمت ۔	تُو آیا ہے۔
تو ہے چھوا آمت ۔	آپ آئے ہیں ۔
بہ چھوس آمت ۔	میں آیا ہوں ۔
اسہ چھ آمت ۔	ہم آئے ہیں ۔

یعنی ''آیا'' خواہ آئے کے لیے ''آمت'' ہی آتا ہے۔ ''چھ'' (ہے) فاعل کی صورت میں تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور ''چھوس''، ''چھک'' اور ''چھو'' کی صورت اختیار کرتا ہے۔ فعل مضارع کی صورت میں جس طرح اُردو میں ''ہے'' نہیں آتا، اسی طرح کشمیری میں بھی ''چھ'' نہیں آتا، البتہ فعل فاعل کی صورت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً:

کشمیری	اُردو
سہ لیکھ ۔	وہ لکھے ۔
تم لیکھن ۔	وہ لکھیں ۔
زہ لیکھہ ۔	تو لکھے گا ۔
توہ لیکھو ۔	تم لکھو ۔

کشمیری قدیم زمانہ میں ''شاردا'' خط میں لکھی جاتی تھی۔ مغل دور تک مسلمان ''شاردا'' ہی میں کشمیری لکھا کرتے تھے۔ سولھویں صدی میں کشمیری خطِ نسخ میں لکھی جاتی تھی۔ بابا نصیب نے اِسی خط میں ''کشورنامہ'' لکھی۔ سیف الدین لدھیانوی نے کشمیری زبان کے حروف علت ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں خطِ نسخ میں کتابیں چھپتی رہیں۔ ۱۹۴۸ء میں ایک کمیٹی نے خطِ نسخ نئے اعراب کے ساتھ ایجاد کیا ۱۹۵۴ء تک اسی خط میں کتابیں چھپتی رہیں۔ اس کے بعد خط نستعلیق تجویز ہوا۔ لیکن اعراب اسی طرح قائم رکھے گئے۔ اُردو اور کشمیری زبان کے حروف تہجی ایک سے ہیں:

ا ب بھ پ پھ ت تھ ٹ ٹھ ث ج جھ چ چھ ح خ د دھ ڈ
ڈھ ر ڑ ڑھ ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک کھ
گ گھ ل م ن و ہ ی۔

عبدالاحد آزاد مصوتوں کی تعداد پندرہ بتاتے ہیں۔ انھوں نے گریرسن کے دیے ہوئے ۳۰ مصوتوں پر غور وفکر کر کے اور کشمیری زبان کی لطافت اور مزاج کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل ۱۵ مصوتے متعین کیے ہیں:

۱۔	ا	اچھ	اچھ	آنکھ	(سندھی/ پنجابی : اکھ)
۲۔	آ	آ-ٹھ	اٹھ	آٹھ	(سندھی/ پنجابی : اٹھ)
۳۔	اُ	اُکھ	اکھ	ایک	(سندھی/ پنجابی : ھِکُ)
۴۔	آ	آر	آر	رحم	(سندھی : آر)
۵۔	اَ	تھر	تیھر	سردی	(سندھی : تھِدہ)
۶۔	ای	ترٛ	ترٛ	چیتھڑا	(سندھی : چیڑہ)
۷۔	اِ	دِل	دِل	دِل	
۸۔	ای	تیٖل	تیل	تیل	
۹۔	اُ	وُٹھ	وٹھ	ہونٹ	
۱۰۔	اُو	وُونٹھ	وونٹھ	اونٹ	
۱۱۔	او	وُٹھ	ووٹھ	چھلانگ	

۱۲۔	او	ژُ	نُور	آستین	
۱۳۔	او	نُور	نُور	نلکہ	(سندھی : نار)
۱۴۔	اے	ڈیو	دیو	دیو	(سندھی : ڈیو)
۱۵۔	اے	یئیر	یئیر	اُن کے لیے	

اُردو زبان کی طرح کشمیری زبان کو بھی ارتقائی منازل طے کرتے وقت بہت سی دشواریاں پیش آئیں۔ سنسکرت کے بعد یہاں کی پراکرتیں ''ماگدھی' مہراشٹری' پیاچی' اونگ کے بعد اپ بھرنش' شورسینی'' ان چھ پراکرتوں کے بارے میں لکھتے ہیں: یہ کشمیر اور ہندوستان کے شمال مغربی حصوں میں بولی جاتی ہیں۔ اگر یہ ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ ہے تو اس میں آباد شہر ملتان' سندھ' لاہور' پشاور اور کشمیر کا علاقہ آتا ہے۔ پھر ان زبانوں کا لسانی رشتہ ایک ہونا چاہیے۔ اسی طرح گریرسن کا نظریہ کہ کشمیری ہند ایرانی آریہ گروہ کی بچھڑی ہوئی شاخ پیاچہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح مغربی' پنجابی یا لہندہ جو شمال مغربی گروہ سے تعلق رکھتی ہے، کی نشو و نما اور کشمیری زبان کی آبیاری اسی طرح سے ہوئی جس طرح اُردو کی ہوئی ہے۔

کشمیری زبان پیاچہ مشرقی پنجابی اور مغربی ہندی عنصر سے مرکب ہوئی اور اُردو کے شانہ بشانہ ترقی کرتی رہی۔ جان بیمز نے انڈو جرمانک کی جن آٹھ شاخوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں انگ زبانوں کی تعداد دس بتائی ہے۔ جو ہندی' پنجابی' بنگالی' سندھی' مرہٹی' گجراتی' نیپالی' آسامی' کشمیری ہیں۔ ہارنل اور جان بیمز دونوں کشمیری زبان اور اُردو کے بارے میں لکھتے ہیں۔ یہ دونوں زبانیں شورسینی اور اپ بھرنش کی پیداوار ہیں۔

ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہندوستان کی ابتدائی زبان ویدکی زبان تھی اور پراکرتیں اس سنسکرت کی بیٹیاں ہیں جو سنسکرت زبان وید میں موجود ہے' اور ان پراکرتوں کا آپس میں بہنوں کا تعلق ہے۔ ان کا شجرہ نسب آپس میں ملتا ہے۔ اگر یہ زبانیں بہنیں ہیں تو رشتے کی بہنیں ضرور ہیں۔

اس ملک کی خوبصورتی نے شاعر اور مصور کو اپنے فن کے لیے محتاج نہ رکھا۔ جو چیزیں دہلی اور پنجاب کے شاعر کو میسر نہ تھیں وہ اسے کشمیر میں حاصل ہوئیں۔ ظاہر ہے ایک شاعر گنگا اور جمنا کے کنارے سے اٹھ کر ایران تو نہیں جا سکتا تھا، وہ کشمیر میں پہنچا مناظر قدرت کی عکاسی کرتا تھی تو اس نے پہلگام اور امرناتھ کا رُخ کیا جو کچھ نظر آیا اسے لاہور کے شالیمار باغ میں شعر کی صورت میں موزوں کیا۔ گل و بلبل' گل و سنبل' فاختہ' ہدہد' زلف'

کاکل، گلاب، سنطور، اُوز، کمان، یاسمین، نرگس، بنفشہ، بادام، چشم، رنگ، سیب، یہ سارے الفاظ ہیں جو اُردو زبان میں بھی ہیں۔ اس طرح کشمیری زبان کا اُردو لسانیات کی تشکیل میں اہم کردار رہا ہے۔

تشکیل الفاظ دو طریقوں سے عمل میں آتی ہے

۱۔ بذریعہ اشتقاق یا تجزیاتی طور سے

۲۔ بذریعہ ترکیب

اُردو اور کشمیری زبان میں لفظوں کی بناوٹ کے یہ دونوں طریقے کثرت سے بولے جاتے ہیں اور ایسے بے شمار الفاظ ملتے ہیں جو دونوں زبانوں میں ایک ہی قاعدے سے بنتے ہیں۔

اُردو حاصل مصدر اور کشمیری میں اسم ذات کا تقابلی جائزہ

اُردو زبان	کشمیری زبان
کھانا سے کھا۔	کھیون سے کھیہ۔
لڑنا سے لڑ۔	لڑون سے لڑ۔
مارنا سے مار۔	ماژن سے مار۔
چیرنا سے چیر۔	چیرن سے چیر۔
بننا سے بنا۔	بنُن سے بن۔
رونا سے رو۔	وون سے وو۔
کرنا سے کر۔	کرن سے کرہ۔

کبھی خود مصدر سے اسم کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً:

اُردو	کشمیری
آنا جانا۔	این چھن۔
مرنا جینا۔	مرن زیون۔
لینا دینا۔	لین دین۔

کشمیری مادے پر 'ت' کا اضافہ کردیا جاتا ہے، لیکن علامت مصدر اس سے قبل ادا کردی جاتی ہے اور کشمیری زبان

میں بھی یہی کیفیت رہتی ہے۔ مثلاً:

اُردو	کشمیری
لکھنا سے لکھت	لکھن سے لکھت
پڑھنا سے پڑھت	پڑن سے پڑت
بچنا سے بچت	بچنا سے بچت

کبھی اسم صفت پر یائے معروف بڑھا کر اسم ذات بنا لیتے ہیں:

اُردو	کشمیری
مہنگا ، چور ، دور ،	مہنگہ ، چور ، دور ،
ڈور ، زور سے	ڈور ، زور سے
مہنگائی ، چوری ، دوری	مہنگائی ، چوری ، دوری ،
ڈوری ، زوری۔	ڈوری ، زوری۔

اب لسانی تقابل دیکھیں کشمیری اور اُردو کے الفاظ ایک جیسے ہیں:

اُردو	کشمیری
دوکاندار ، ساہوکار ، پنسار سے	دکاندار ، ساہوکار ، پنسار سے
دوکانداری ، ساہوکاری ، پنساری۔	دکانداری ، ساہوکاری ، پنساری۔

کبھی ”ی“ کا اضافہ کر کے صفت نسبتی بناتے ہیں۔ مثالیں:

اُردو	کشمیری
ہندو ، پاکستان ، ایران ، افغانستان	ہندو ، پاکستان ، ایران ، افغانستان
ہندی ، پاکستانی ، ایرانی ، افغانی۔	ہندی ، پاکستانی ، ایرانی ، افغانی۔

کبھی منفی افعال سابقہ اَن کے اضافہ سے بنائے جاتے ہیں:

اُردو	کشمیری
پڑھ ، جان ، مول سے	پڑھ ، جان ، مول سے
اَن پڑھ ، انجان ، انمول	اَن پڑھ ، انجان ، انمول

اس تقابلی جائزے سے ہمیں ثابت ہوا ہے کہ کشمیری زبان اور اُردو میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس طرح اُردو لسانیات کی تشکیل میں کشمیری زبان کا بھی اہم کردار ہے۔ کشمیری اور اُردو لسانیات کے مباحث پیش کیے گئے ہیں اور مختصر طور پر لسانی تعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

حصہ دوم

اردو میں لسانی مباحث کا ارتقا

(قیامِ پاکستان کے بعد)

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز سال میں جہاں برصغیر کو انگریزی غلامی سے آزادی ملی، وہیں مسلمانوں کو اپنا ایک علیحدہ خطہ ارضی بھی حاصل ہو گیا جہاں انہیں محنت و مشقت، ہمت و حوصلے اور لگن کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرنے کے مواقع میسر آئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک گزشتہ کئی برس سے جاری بالعموم اور ۱۹۴۰ء کے بعد سے بالخصوص جاری رہنے والے فسادات، ہنگاموں، شورشوں، ہجرت، غربت اور دیگر مسائل سے دوچار اس خطے میں دیگر شعبوں کی طرح ''لسانیات'' کے شعبے میں بھی ارتقا کا عمل کسی حد تک رکاوٹ سے دوچار ہو گیا۔ تاہم یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیگر شعبوں کی طرح اس شعبے میں بھی کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اسی احساس کے تحت بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی اہلِ علم و ادب اور ماہرینِ لسانیات نے اپنے اپنے طور پر لسانیات کے مختلف پہلوؤں پر اردو زبان میں اور اردو زبان کے حوالے سے کام کیا۔ یوں قیامِ پاکستان کے بعد ''لسانیات'' کے حوالے سے دو مرکز بن جاتے ہیں یعنی ہندوستان اور پاکستان۔

اگرچہ ہندوستان اور پاکستان سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف نظریات کے حامل علاقے ہیں، تاہم اردو زبان کے حوالے سے ان دونوں علاقوں کی خدمات مشترکہ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں خطوں میں اردو زبان کی پیدائش بھی ہوئی اور اردو زبان نے یہاں نشوونما بھی پائی۔ صرف یہی نہیں، ان دونوں خطوں کے رہنے والے افراد نے اردو زبان کو اس قدر عروج دیا کہ وہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے مقابل کھڑی ہونے کے قابل ہو سکی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد ازاں ہندو دھرم کے پنڈتوں نے اسی مشترکہ زبان کو رسم الخط کی مدد سے دو علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا۔

اردو میں لسانی مباحث

(پاکستان میں ہونے والے کام کا جائزہ)

اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ (۱۹۴۹ء):

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا شمار برصغیر پاک و ہند کے نامور محققین میں ہوتا ہے اور اردو زبان و ادب میں اپنی گرانقدر خدمات کی بدولت ”بابائے اردو“ کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ پاکستان کی خوش قسمتی رہی کہ تقسیم برصغیر کے بعد جن محققین اردو نے پاکستان کا رخ کیا، ان میں مولوی عبدالحق کا نام سرِفہرست رکھنے جانے کے قابل ہے۔

مولوی عبدالحق نے ”اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ“ کے عنوان سے ۵۵ صفحات کا مضمون تیار کیا جسے انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی نے کتابچے کی شکل میں ۱۹۴۹ء میں شائع کیا۔ جیسا کہ اس مضمون کے عنوان سے ظاہر ہے کہ اس میں اردو زبان میں اصطلاحات کے حوالے سے بحث کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اصطلاحات سازی لسانیات کا خاص اور اہم موضوع ہے۔ مولوی عبدالحق مذکورہ کتابچے کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ”میرے علم اور تحقیق میں ہندوستانی زبانوں میں اردو ہی ایک زبان ہے جس میں زمانہ دراز سے علمی اصطلاحات پر غور و فکر کیا گیا ہے اور مختلف اوقات میں اس کے اصول وضع کیے گئے۔ ایک صدی زیادہ کا عرصہ ہوا جب کہ دہلی کالج میں تمام جدید علوم مثلاً جغرافیہ، تاریخ، نیچرل فلاسفی، ریاضیات، معاشیات، قانون، طبعیات وغیرہ وغیرہ اردو زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔“[۲۸]

صرف یہی نہیں، یہ اصطلاحات ہندی اور اردو زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں مرکبات اور مشتقات بنانے کا بھی اچھا قاعدہ ہے جس کے بارے میں بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالحق مزید فرماتے ہیں:

> ”(۱) سنسکرت، عربی، فارسی اور ان مغربی الاصل الفاظ سے جو ہماری زبان میں مروج ہیں۔
>
> (۲) مصطلحات سے جو عربی کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن عام طور پر استعمال نہیں

ہوئیں۔

(۳)عربی کے مرکبات و مشتقات جو خاص قواعد کی پابندی سے وضع کیے جائیں۔

(۴)یونانی یا لاطینی اصل کی اصطلاحوں سے جن میں بہ تقلید اہلِ عرب ہماری زبان کی صوتی خصوصیات کے موافق ترمیم ہو جائے۔

(۵)مفرد مشتق یا مرکب الفاظ سے جو فارسی سے مستعار لیے جائیں۔"۲۹

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو میں جب دیگر علوم کی تعلیم و تدریس کا عمل شروع ہوا تو ترجمے کے ساتھ ساتھ مختلف علوم کی مخصوص اصطلاحوں کو بھی ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس حوالے سے عربی کو بنیادی زبان کا درجہ حاصل رہا اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی اور دیگر زبانوں کی مخصوص اصطلاحات کو بھی کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ اردو میں منتقل کر لیا گیا۔ اس حوالے سے مولوی عبدالحق کی تصنیف "اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ" اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے علاوہ مولوی وحید الدین سلیم، ڈاکٹر عطش درانی اور ڈاکٹر سلیم اختر کے کام کو بھی اہمیت حاصل ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لسانیات کو سمجھنے کے لیے اصطلاحات کا جاننا بھی ضروری ہے۔

اردو ادب کے آٹھ سال (۱۹۵۵ء):

پاکستان میں لسانی حوالے سے کام کا آغاز فوری طور پر تو شروع نہ ہوا، البتہ کچھ عرصہ بعد رفتہ رفتہ اس میدان میں کام کا آغاز ہوا۔ اس حوالے سے "اردو ادب کے آٹھ سال" کے عنوان سے ایک کتاب ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں تھی بلکہ عشرت رحمانی نے مرتب کی تھی۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۰۲۳ پر سید وقار عظیم نے ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء تحریر کیا ہے اور آخر میں ۱۶ مارچ لکھ کر دستخط کیے ہیں۔ اس اندرونی شہادت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تصنیف ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء تک پاکستان میں تحریر شدہ ادب کا جائزہ لیتی ہے۔ اس طرح یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب کا مقصد لسانی بحث نہ تھا بلکہ پاکستانی ادب کی آٹھ سال تاریخ مرتب کرنا تھا۔ تاہم ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا مضمون "اردو میں دخیل الفاظ" اور نصیر الدین ہاشمی کا مضمون "دکھنی کلچر" اس کتاب میں لسانی بحث کو شامل کر دیتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون میں ایسے بہت سے الفاظ کی فہرست دی ہے جو دوسری زبانوں یعنی انگریزی، پرتگیزی، فارسی، ہندی وغیرہ سے اردو ادب میں داخل ہوئے۔ مجموعی طور پر اس مضمون کا مطمع نظر یہ بیان کرنا تھا کہ ہر زبان دوسری زبانوں پر اثر ڈالتی ہے اور مختلف زبانیں بولنے والے افراد کے آپس میں میل ملاپ سے نئے الفاظ بھی جنم لیتے ہیں۔ اسی طرح نصیرالدین ہاشمی اپنے مضمون ”دکھنی کلچر“ میں بیان کرتے ہیں:

> دکن میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں اردو، تلنگی، مرہٹی، کنڑی، تامل اور انگریزی وغیرہ زبانوں کو اس وقت اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اردو کے سوا بقیہ زبانیں صرف اپنے اپنے حدود ہی میں بولی جاتی ہیں اور صرف اردو کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ دکن کے تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کی ہر دلعزیزی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ جو لوگ اردو نہیں سمجھتے وہ بھی اردو کی متحرک تصویروں کو پسند کرتے ہیں۔ دکن کی زبان میں اردو کو ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ ہر مذہب کے لوگوں کی زبان ہے اور اس کا احاطہ نہایت وسیع ہے اور یہ ہمارے دکھنی کلچر کی بڑی نشانی ہے۔“[۳۰]

گویا اس مضمون میں اردو کی ایک محدود علاقے میں ہر دلعزیزی کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ حقیقت میں یہ پورے برصغیر کی ہر دلعزیز، بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔ مجموعی طور پر عشرت رحمانی کی مرتبہ یہ کتاب اردو میں لسانی مباحث کا معمولی سا حوالہ تو پیش کرتی ہے مگر اس میں لسانی مباحث کے واضح نقوش موجود نہیں ہے۔ البتہ اس کی اس قدر اہمیت ضرور تسلیم کی جانی چاہیے کہ اس میں شامل ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور نصیر الدین ہاشمی کے مضامین اردو میں لسانیات کی بحث میں حصہ لینے والوں کو دعوتِ فکر ضرور دیتی ہے۔

اردو زبان کا ارتقا (۱۹۵۶ء):

ڈاکٹر شوکت سبزواری پہلے پاکستانی ہیں جنھوں نے ۱۹۵۶ء میں پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ”اردو زبان کا ارتقا“ کے عنوان سے ڈھاکا یونیورسٹی سے شائع کیا۔ اس مقالے میں انہوں نے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں اپنے نظریات مدلل انداز میں پیش کیے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی زبانوں کے رشتے اور اردو زبان کے ماخذ کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"۱۔ آریا قبیلے جو مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس سے پہلے ہندوستان آئے ایک زبان بولتے تھے جسے ہم قدیم ہند آریائی کہتے ہیں۔

۲۔ یہ قدیم زبان ترقی کر کے کچھ منازل طے کرنے کے بعد سنسکرت (شستہ) کہلائی۔

۳۔ سنسکرت میں صوتی اور صرفی تغیرات ہوئے تو اس نے اولین پراکرت یعنی "پالی" کا روپ اختیار کیا۔ "پالی سے حسب ذیل چار پراکرتیں وجود میں آئیں:

(الف) شورسینی (ب) ماگدھی (ج) مہاراشٹری (د) اردما گدھی

۴۔ پراکرتیں روپ بدل کر اپ بھرنش بنیں۔ ہر پراکرت کا اپ بھرنش روپ الگ تھا۔

۵۔ ہندو پاکستان کی موجودہ بول چال کی زبانیں ان اپ بھرنشوں کی پیداوار ہیں۔"[۳۱]

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ لسانیات کا اصول ہے کہ جن زبانوں یا بولیوں کے درمیان صوتی یا صرفی مشابہتیں پائی جائیں، وہ ایک ہی خاندان کی زبانیں ہوتی ہیں۔ سنسکرت، لاطینی اور یونانی ایک ہی خاندان کی زبانیں ہیں جن میں صوتی و صرفی دونوں خوبیاں ایک جیسی ہیں۔ اس وقت دنیا کی چار بڑی پرانی زبانیں ایسی ہیں جو زبانوں کی مائیں کہلاتی ہیں۔ ان میں عبرانی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت شامل ہیں جبکہ دنیا میں اس قت سات ہزار کے قریب بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں جن کے سو (۱۰۰) بڑے خاندان ہیں۔ اس حوالے سے شوکت سبزواری، سنیتی کمار چیٹر جی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے "پالی" کو وسطی علاقوں کی بولیوں پر مبنی "مغربی ہندی" کی مورثِ اعلیٰ بتایا ہے۔ اس کا شجرہ نسب درج ذیل ہے[۳۲]:

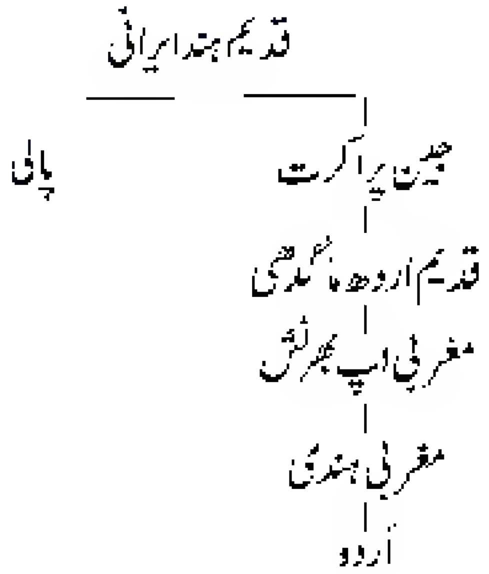

ڈاکٹر گریرسن کے حوالے سے ڈاکٹر شوکت سبزواری ''اردو'' زبان کے اصول صرف و نحو کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اردو اپنے قواعد اور الفاظ کے اعتبار سے ایک مخلوط، عام اور مشترک زبان ہے۔ اس میں شمالی ہندوستان کی تمام بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، تیلگو زبان کے الفاظ بھی ہیں۔''[۳۳]

اسی طرح اپنے نظریات کی ذیل میں ڈاکٹر شوکت سبزواری ''اردو لسانیات اور صوتیات'' کے عنوان سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آوازیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ کچھ منہ میں ہوا کی سرسراہٹ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ 'حرکات' و 'علل' کہلاتی ہیں۔ کچھ زبان اور منہ کے دو حصوں کے باہم ٹکرانے سے وجود میں آتی ہیں، انہیں حروفِ صحیح کہتے ہیں۔ ان دونوں قسموں کی آوازوں کے خاص خاص مقام ہیں جو اصطلاح میں 'مخارج' کہلاتے ہیں۔ ان کا تعلق صوتیات سے ہے[۳۴]۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر شوکت سبزواری کا مقالہ اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے نہ صرف مکمل معلومات اور نظریات کا احاطہ کرتا ہے بلکہ یہ پاکستان میں اردو کے لسانی مباحث کے حوالے سے اہمیت کا حامل بھی ہے جس کی بنیاد پر بعد میں بہت سے مقالات اور کتب تحریر ہوئیں۔ گویا اس مقالے نے پاکستان میں لسانی مباحث کی نہ صرف داغ بیل ڈالی بلکہ اس باب میں نئے در بھی وا کیے۔

داستانِ زبانِ اُردو (۱۹۶۰ء):

پاکستان میں لسانی مباحث کا مطالعہ کیا جائے تو ڈاکٹر شوکت سبزواری کی خدمات ناقابلِ فراموش دکھائی دیں گی۔ انہوں نے لسانی مباحث کی ذیل میں جو تصانیف پیش کیں، وہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ''اردو زبان کا ارتقا'' (۱۹۵۶ء) کے علاوہ ان کی دوسری تصنیف ''داستانِ زبانِ اردو'' کے نام سے دسمبر ۱۹۶۰ء میں ترقی اردو بورڈ کراچی سے اشاعت سے ہم کنار ہوئی۔ اردو زبان کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر شوکت سبزواری بیان کرتے ہیں:

> ''اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں شاہی لشکر یا معسکر یعنی چھاؤنی۔ اردو کو اول اول زبان اردوئے معلی شاہ جہان آباد میں کہا گیا۔ کثرتِ استعمال سے زبان کا لفظ گرا تو اردوئے معلی یا اردوئے معلی شاہجہان آباد رہا۔ اس کے بعد صرف اردو۔

تنہا اردو زبان کا معنی ڈاکٹر بیلی کو مصحفی کے یہاں ملا:

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس سے منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے [۳۵]

ڈاکٹر بیلی نے اردوئے معلّٰی سے مراد فصاحت و بلاغت والی زبان سمجھا تھا جبکہ میر امن نے ۱۸۰۲ء (باغ و بہار میں) اردو کی زبان کا ترجمہ کیا ہے۔ عرشؔ کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہم ہیں اردوئے معلّٰی کے زباں داں اے عرشؔ
مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

تاہم ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی رائے اس ضمن میں سب سے الگ ہے۔ ان کے نزدیک کھڑی بولی کے معنی گنواری بولی ہے جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے اور وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ [۳۶]۔ اس حوالے سے یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کھڑی معنی ''اکھڑ'' یا ''کھردری'' زبان ہے یعنی اس کا لہجہ اکھڑا اکھڑا ہے۔ مولانا شیرانی نے اردو کا قدیم نام ہندی یا ہندوی بتایا تھا اور ''پنجاب میں اردو'' (۱۹۲۸ء) میں لکھا تھا کہ اردو دہلی، آگرہ اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی اور یہ وہ زبان تھی جو پنجاب کی بولی سے ترقی پا رہی تھی۔ درج ذیل بیان ملاحظہ ہو:

> ''جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے، نہ وہ برج ہے اور نہ قنوجی بلکہ وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔'' [۳۷]

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ''پنجاب میں اردو'' کا درج بالا حوالہ دے کر ڈاکٹر چیٹر جی کا نظریہ بھی بیان کیا ہے جس کے مطابق اردو کا نام ہندی (قدیم تر ہندوی) ہندوستانی اور اردو کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے۔

اس تصنیف کا مجموعی مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی گزشتہ تصنیف ''اردو زبان کا ارتقا'' میں پیش کیے جانے والے نظریات کی کسی حد تک تکرار بھی کی ہے اور اس میں مزید اضافہ بھی کیا ہے جو اُن کی لسانی مباحث میں تبحر علمی کی نشاندہی کرتی ہے۔ ''داستان'' کا لفظ اس بات کا غماز ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس تصنیف میں خالص تحقیق موضوع میں کسی حد تک داستانوی فضا بھی شامل کر دی ہے جو قاری کو اکتاہٹ کا شکار اور بیزار نہیں کرتا۔ اس بحث سے قطع نظر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ''داستانِ زبانِ اردو'' میں اگرچہ لفظ 'اردو' کے روایتی معنی ہی استعمال کیے ہیں اور روایتی بحث کو ہی بیان کیا ہے، تاہم انہوں

نے حافظ شیرانی اور سنیتی کمار چیٹر جی جیسے معتبر و مستند ماخذات کی مدد سے دلائل و براہین کے ساتھ اپنے خیالات نظریات کو پیش کیا ہے۔

اردو زبان اور اسالیب (۱۹۶۱ء):

سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی نے ۱۹۶۱ء میں ''اردو زبان اور اسالیب'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی جو اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس تصنیف میں فاضل مصنف نے جن لسانی موضوعات کو اپنی بحث کا محور بنایا ہے، ان میں تلفظ کی صحت، غیر مانوس الفاظ، انس اور انسیت، معنی کی تنوع، احتساب، صحت الفاظ کا مطالعہ وغیرہ شامل ہیں۔ ۳۱۶ صفحات پر محیط اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ یہ باور کرتا ہے کہ اردو ادب میں قواعد اور لسانیات کے حوالے سے مذکورہ تصنیف ''دریائے لطافت'' سے بھی زیادہ آسان اور جلد سمجھ میں آنے والی ہے۔

اردو کی زبان (۱۹۶۳ء):

اردو لسانیات کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری کی خدمات پر دو رائے نہیں۔ آپ کا شمار پاکستان کے چوٹی کے ماہرِ لسانیات میں ہوتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ''اردو کی زبان'' کے عنوان سے ان کی اہم تصنیف فضلی سنز کراچی نے شائع کی جو ۳۱۹ صفحات پر مشتمل تھی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے مذکورہ تصنیف میں لسانیات، زبان اور صوتیات اور اشتقاقیات کے حوالے سے اہم مباحث پیش کیے ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے ''اردو کی زبان'' میں لسانیات کی جامع تعریف پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں مختلف آرا کی مدد سے اسے آسان فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔ بعد ازاں لسانیات کے دیگر علوم سے روابط اور تعلق پر اجمالی بحث کی ہے۔ آواز کیا ہوتی ہے؟ ابتدائی آوازیں کیا تھیں یا کیا ہوتی ہیں؟ ابتدائی صوتی اشکال کیسی تھیں یا کیسی ہوتی ہیں؟ ڈاکٹر سہیل بخاری نے ان سوالوں کے مدلل جواب پیش کر کے ابہام دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے ''معنی'' پر جامع انداز میں بحث اس تصنیف میں شامل کی۔ اسی طرح تقابلی لسانیات، صوتیات، صرف ونحو جیسی لسانیات کی اقسام پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ چنانچہ لسانیات کی تعریف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''عربی میں لسان اس پارہ گوشت کو کہتے ہیں جو ہمارے بتیس دانتوں کے درمیان رہتا ہے اور غذا کے مختلف ذائقوں میں تمیز کرتا ہے۔ فارسی میں اسے زبان، انگریزی میں ٹنگ اور اردو میں جیبھ کے لفظ سے پکارتے ہیں لیکن عربی، فارسی اور انگریزی کے انہیں الفاظ سے وہ آوازیں مراد ہوتی ہیں جو انسان اپنے منہ سے نکالتا ہے اور جو اس کی سماجی زندگی کو مستحکم اور پائدار بنانے کا ایک زبردست وسیلہ ہے۔ اردو میں ان کے مجموعے کو بولی کہتے ہیں۔ لفظ ''لسانیات'' اس عربی ''لسان'' (بولی) سے بنا ہے جس کے معنی ''زبان کا علم'' ہیں۔ چنانچہ لسانیات علم کی وہ قسم ہے جو زبان کی اصلیت و ماہیت کا مطالعہ کرتی ہے اور اس کی پیدائش، فروغ، دائرہ عمل اور تغیرات جیسے مسائل پر غور کرتی ہے۔''[۳۸]

اردو لسانیات کی جس قدر کتب کا مطالعہ کیا جائے، اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ جیسے ڈاکٹر سہیل بخاری نے ''لسانیات'' کی مفصل اور جامع تعریف بیان کر دی ہے، کسی اور سے نہ قبل ازیں ہو سکی اور نہ ہی بعد ازاں۔ تاہم ''اردو کی زبان'' کی اہمیت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کا شمار ایسے افراد کی فہرست میں بھی درجہ اول پر رکھا جاتا ہے جنہوں نے اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا۔ چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں:

> ''اردو اور ہندی ایک زبان کے دو نام ہیں جسے لسانیوں کی اصطلاح میں کھڑی بولی کہا جاتا ہے۔''[۳۹]

ڈاکٹر سہیل بخاری کی لسانی خدمات کے شہرے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہندی، فارسی اور اردو کے حروفِ علت اور حروفِ صحیح کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ ہندی زبان کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے۔ اسی کی بدولت ان کا لب و لہجہ بھی ہندی بولی سے ملتا جلتا ہے۔ اسی خاصیت کی بنا پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب رہے کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہے۔ ان میں صرف رسم الخط کا ہی فرق ہے، ورنہ بولنے میں دونوں ایک جیسی زبانیں ہیں۔

زبان کا مطالعہ (۱۹۶۴ء):

پروفیسر خلیل صدیقی کی لسانی مباحث پر مشتمل کاوش ۱۹۶۴ء میں قلات پبلشرز، مستونگ سے شائع

ہوئی۔ اردو لسانیات اور اردو زبان کی خدمات کے حوالے سے خلیل صدیقی کے مطالعہ لسان، تاریخی جائزہ اور مغربی مفکرین اور ماہرین لسانیات کی کتب کے تراجم بخوبی اردو لسانیات میں شامل کیے ہیں۔ اس حوالے سے لسانیات کا دیگر علوم سے رشتہ، لسانیات کی شاخیں، لسانیات کے شعبے، علم الاصوات اور لسانیات کی مبادیات کے حوالے سے بھرپور علمی و لسانی مباحث پیش کیے گئے ہیں۔

''زبان کا مطالعہ'' کا پہلا باب جو ''لسانیات کیا ہے؟'' کے عنوان سے قائم ہے، اس میں پروفیسر خلیل صدیقی نے لسانیات کو طبعی علوم کے مقابل لا کھڑا کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فزکس اور کیمسٹری کی طرح ''لسانیات'' بھی ایک سائنس ہے اور اسے سائنسی بنیادوں پر ہی سیکھنا چاہیے۔ اس باب میں محی الدین قادری زور کی تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' کے تسلسل میں زبان اور لسانیات کے بارے میں بحث کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ زبان کی ساخت کے حوالے سے پروفیسر خلیل صدیقی بیان کرتے ہیں:

> ''لسانیاتی تحلیل و تجزیہ میں زبان کی ساخت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ساخت سے مراد وہ ڈھانچہ ہے جو اضداد کے ایسے منظم مجموعوں پر مشتمل ہو جنہیں زبان میں دریافت کیا جا سکے، خواہ ان کا تعلق صوتی اکائیوں سے ہو یا گرامر کے تصرفات اور مشتقات سے، یا بعض حالتوں میں زبان کی مختلف صورتوں اور ہیئتوں کے معنی سے۔ معانی کی یہ شق مشرقی ادبیات میں علم معانی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔''[۲۰]

زبان میں سب سے اہم کام اس کی ساخت کو سمجھنا اور پھر اس کا تقابلی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا ہے۔ انسان کی تاریخ میں اس کی ماہیت اور خصوصیت کو پروان چڑھایا جاتا ہے کیونکہ زبان اور انسان کا تعلق ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ انسان کے منہ سے نکلی ہوئی ہر وہ آواز جو معانی رکھتی ہے، لسانیات کی توجہ کا مرکز ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ زبانیں تغیر و تبدل کے دور گزرتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان کے عمومی و آفاقی، اصول و ضوابط اور کلیات اخذ کرنا ''لسانیات'' کا خاص منصب ہے۔ تقابلی لسانیات کی تنظیم اور ترقی نے ان تمام مباحث کو اجاگر کیا ہے جن سے آج لسانیات کی حدود اور وسعت متعین ہوتی ہے۔

خلیل صدیقی زبان کی پیدائش کے اس نظریے کو رد کرتے ہیں جس کے مطابق زبان تخلیق ربانی

ہے۔ اس سے قبل لفظ کو خدا اور زبان کو اس کی تخلیق قرار دیا جاتا رہا ہے۔ خلیل صدیقی اس حوالے سے مغربی ماہر لسانیات (جیکب گرم) کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> ”زبان کی تخلیق ربانی نہیں اور نہ ہی خدا نے انسان کو تخلیق کر کے اس پر زبان کا انکشاف کیا۔ زبان کی خامیاں اور اس کے تغیرات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ زبان تخلیقِ ربانی نہیں ہو سکتی بلکہ بتدریج نمو پاتی ہے۔ وہ انسان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور پرندوں کے چہچہوں اور عام مخلوقات کی فطرتی آوازوں سے بے تعلق۔ مرد اور عورت بالغوں کی حیثیت سے تخلیق کیے گئے ہوں گے کیونکہ اگر بالکل ابتدا میں ایک ہی جوڑا تخلیق کیا گیا ہوتا تو یہ عین ممکن تھا کہ ان سے صرف اولاد ذرینہ ہی پیدا ہوتی، یا صرف لڑکیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس صورت میں افزائش نسل کیوں کر ممکن ہوتی۔ بالفرض ایک جوڑے کی ایک اولاد دونوں جنسوں پر مشتمل بھی ہوتی تو بھائی بہن کے ازواج کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔“[1]

پروفیسر خلیل صدیقی نے لسانیات کا تعلق دیگر جدید علوم سے بھی جوڑا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے علم حیاتیات کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ ان کے مطابق حیاتیات کی طرح لسانیات میں کسی بھی شخص کی عمر، جنس، جسمانی نوعیت اور بناوٹ، قد و قامت، خد و خال وغیرہ کی اہمیت وضرورت ہوتی ہے۔ جدید لسانیات میں زبانوں کے فرق و امتیاز یا ایک ہی زبان میں انحراف کی توضیح بولنے والوں کی طبیعاتی حالات کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ اس میں بولنے والے کے قد و قامت، وزن اور سر کی بناوٹ کا بھی علم ہوتا ہے۔ کسی موٹے شخص کی آواز اگر باریک ہو تو ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ اس طرح کی آواز کی بلندی اور اس کے حیطے سے انسان کی جسامت کا پتہ چلتا ہے۔ زبان سے بولنے والے کی کیفیات معلوم ہوتی ہیں کیونکہ زبان متکلم کا اشاریہ ضروری ہوتی ہے۔

اردو لسانیات (۱۹۶۶ء):

”اردو لسانیات“ بھی لسانی مباحث پر مشتمل ڈاکٹر شوکت سبزواری کی ایک گرانقدر تصنیف ہے جو ۱۹۶۶ء میں انجمن ترقی اردو بورڈ، کراچی کی جانب سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس تصنیف میں محض اردو زبان کے آغاز وارتقا یا اردو کے لسانی مباحث ہی کے متعلق قلم نہیں اٹھایا گیا بلکہ زبان، زبان کی اقسام، لسانیات، لسانیات

کی شاخیں اور اردو قواعد و نحو کے بارے میں بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس تصنیف کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پاکستان میں لسانی مباحث اور لسانی مسائل سے بحث کی حامل یہ ایک اہم تصنیف ہے جس پر اگر مزید تحقیق کے در کھولے جاتے تو پاکستان میں اردو کے لسانی مباحث کی ترقی میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا تھا۔ اس امر کا اندازہ درج ذیل اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ ہے کہ لسانیات کی دو بڑی شاخیں ہیں، توضیحی (یا تشریحی) لسانیات اور تاریخی لسانیات جن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ توضیحی لسانیات کے حدود و امکانات کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ”کسی زبان کو محض پہچاننے کے لیے توضیحی لسانیات سے کام لیا جاتا ہے لیکن زبان کا صرف پہچاننا ہی مفید نہیں، اس کا جاننا بلکہ ناقدانہ جاننا بھی ضروری ہے۔ زبان کی ’جان پہچان‘ زبان کا علم و عرفان ہے اور یہ علم و عرفان اس وقت حاصل ہوتا ہے جب زبان کے بارے میں جاننے کے ساتھ ہی کہ وہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ کیا اور کیوں دونوں لازم و ملزوم ہیں۔“[۴۲]

اسی طرح تاریخی لسانیات کے بارے میں ان کا نکتۂ نظر یہ ہے کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہے جیسے سوالوں کا جواب مہیا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ”لسانیات کا رسم تحریر سے بھی قریبی تعلق ہے۔ اس لیے ”اردو لسانیات“ میں اردو کی بعض اصوات کے پہلو بہ پہلو اِن کی اشکال و علامات بھی زیر بحث آتی ہیں۔ صوتیات ایک جدید فن ہے۔ علم و فن کی استواری اصطلاحات میں یکسانی و ہمواری کی محتاج ہے۔ جدید علوم و فنون کی طرح لسانیات اور جدید صوتیات کی اصطلاحات میں بھی یک گونہ ناہمواری برتی جا رہی ہے اور بعض ایسی اصطلاحات جو پہلے سے اردو اور عربی میں رائج تھیں، نئی نامناسب اور غلط اصطلاحات گھڑی جا رہی ہیں۔“[۴۳]

گویا ڈاکٹر شوکت سبزواری نہ صرف لسانیات اور صوتیات کو جدید علم قرار دیا ہے، بلکہ اس حوالے سے بھی ناقدانہ رائے دی ہے کہ جن اصطلاحات کے بارے میں الفاظ پہلے سے موجود ہوں، ان کے لیے نئے الفاظ گھڑنا اور وہ

بھی جو نا مناسب یا غلط ہوں، درست اقدام نہیں ہے یعنی اس بحث میں ہمیں روایت اور جدیدیت کی بحث بھی ملتی ہے جو ٹی۔ ایس ایلیٹ کے راستے اردو میں پہنچی تھی۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری لسانیات کی بحث سے نکل کر لسانی مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے زبان کی دو اقسام بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق زبان کی پہلی قسم قدیم یا اصلی زبان ہوتی ہے اور کچھ زبانیں 'ام السنہ' یعنی زبانوں کی مائیں کہلاتی ہیں۔ اس ضمن میں ان کا نکتہ نظر یہ ہے کہ سنسکرت، لاطینی، یونانی، قدیم فارسی، وغیرہ ''آریائی''، عربی، عبرانی، سریانی، اشوری وغیرہ ''سامی''، تامل، تیلگو، کنڑی وغیرہ ''دراوڑ'' خاندان کی زبانیں ہیں۔ دوسری قسم کی زبانیں قدیم زبانوں سے اخذ کی جاتی ہیں جنھیں ''غیر اصلی زبانیں'' بھی پکارا جاتا ہے۔

یہاں تک کی بحث ہمیں ڈاکٹر شوکت سبزواری کی اولین تصنیف ''اُردو زبان کا ارتقا'' میں بھی مل جاتی ہے۔ تاہم یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے ہاں خیالات و نظریات کی تکرار پائی جاتی ہے بلکہ اس تکرار کے پیچھے ارتقا کا عنصر واضح دکھائی دے گا جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تحریروں میں اپنے نظریات کو محض ایک دفعہ قائم کرنے کے بعد اس پر رک جانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ اس میں درجہ بدرجہ ترقی بھی کی جس نے اردو میں لسانی مباحث کے نظریات کو دو چند اور جدید علوم کے مد مقابل کھڑا کر دیا۔ اس لیے دیکھا جا سکتا ہے کہ اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر شوکت سبزواری ''اردو'' زبان کی طرف آتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ اردو میں عربی زبان کے الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی، ترکی، پرتگالی، تیلگو، گجراتی، فرانسیسی زبانوں کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ عربی سامی خاندان کی زبان ہے، فارسی کا تعلق ہند ایرانی سے ہے، ترکی تورانی قبیلے کی اور تیلگو دراوڑ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح انگریزی تیوتانی ہے تو فرانسیسی اور پرتگالی لاطینی ہیں۔ اس طرح اردو کے ان الفاظ کو بنیاد بنا کر اصلیت معلوم کی جائے تو جا کر علم ہوگا کہ اردو کا خاندان کونسا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی تصنیف میں ڈاکٹر ہیورنلے کا یہ بیان قلم بند کرتے ہیں:

> ''اردو مقابلۃً حال کی پیداوار ہے۔ یہ دہلی کے نواح میں جو مسلم اقتدار کا مرکز اور برج، مارواڑی، پنجابی کا سنگم تھا، بارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جلی زبان (اردو) وجود میں آئی جو صرفی نحوی اصول کی حد تک برج ہے۔ اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی

> کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ بدیسی یعنی فارسی و عربی۔ ''[۴۴]

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو قواعد اور الفاظ کے لحاظ سے مخلوط اور مشترک زبان ہے۔ اس میں ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی اور تیلگو کے الفاظ شامل ہیں۔ میر امن نے ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں اردو زبان کے آغاز کے حوالے سے بحث کی ہے[۴۵] لیکن یہ لسانیات کی کتاب نہیں ہے۔ تاہم اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ دہلی کے بازاروں میں مختلف زبانیں بولنے والے جمع ہو گئے تھے اور ان تمام زبانوں کے مرکب سے اردو وجود میں آئی۔ ڈاکٹر گریرسن، جیولس بلوک اور چیٹر جی اردو کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کا ماخذ شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش ہے۔

ماہرینِ لسانیات نے برصغیر کی قدیم و جدید آریائی زبانوں پر تحقیقی کام کیا ہے اور سب نے گیارہویں صدی عیسوی کو جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز کا زمانہ بتایا ہے (اس حوالے سے گزشتہ باب کے حصہ اول میں بحث کی جا چکی ہے) اور اپ بھرنشوں سے ۱۰۰۰ء کے قریب اردو پروان چڑھی۔ مسلمان فاتحانہ شان میں دہلی میں داخل ہوئے اور اردو کو نکھارا۔ ڈاکٹر ٹی۔ گراہم بیلی نے ۱۱۹۳ء کو اردو کے آغاز کا زمانہ بتایا ہے[۴۶]۔

برصغیر کی جدید بولیوں میں سے ''اردو'' برج اور پنجابی سے بہت ملتی ہے۔ اسی لیے محمد حسین آزاد نے برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دیا ہے[۴۷] اور حافظ محمود شیرانی نے پنجابی کو اردو کا ماخذ بتایا ہے۔ اسی طرح ۱۰۲۷ء میں محمود غزنوی نے جب پنجاب فتح کیا اور لاہور کو شاہی معسکر یعنی فوجی چھاؤنی بنایا تو اس وقت برصغیر میں اپ بھرنش بولی جاتی تھی۔ اپ بھرنش کے معنی ہیں پست، افتادہ اور گری پڑی، اس کو سنسکرت کے مقابلے میں پست سمجھا جاتا تھا۔ قدیم سے جدید کا سفر کرتے ہوئے ڈاکٹر شوکت سبزواری ''اردو لسانیات'' میں ماہر صوتیات سوسیئر (Saussure) کا حوالہ قلم بند کرتے ہیں:

> ''کسی آواز کے اپنے مخرج سے نکلنے یا ادا ہونے تک اپنی بحثوں کو محدود رکھتے اور اس کے سماعی پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہر صوتی عمل کے دو پہلو ہیں۔ (۱) فعلی اور یہ آواز کا منہ کے کسی حصہ سے ٹکرا کر اور ہوا کا سر سرا کر نکلنا ہے۔ (۲) انفعالی: سننے والے پردۂ گوش پر جا کر آواز یا موجِ ہوا کا متصادم ہونا اور اس کے ارتعاشات کا

ذہن تک پہنچتا ہے۔''۸۸؎

یوں قدیم نظریات سے لے کر جدید نظریات تک آتے آتے ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو میں لسانی مباحث کو عمدہ طریقے سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تحقیق وتنقید کے نئے در وا کیے اور مستقبل میں ان کی کاوشوں پر مزید بہتر عمارتیں قائم ہوئیں اور صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے اردو ماہرینِ لسانیات بھی ان کی خدمات سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

اردو اور سندھی کے لسانی روابط (١٩٧٠ء):

شرف الدین اصلاحی نے ''اردو اور سندھی کے لسانی روابط'' کے عنوان سے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کیا جسے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے ١٩٧٠ء میں شائع کر دیا۔ مذکورہ تصنیف لسانیات کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے جس میں توضیحی اور تقابلی لسانیات کے حوالے سے کام کیا گیا ہے۔ اگرچہ کتاب کے عنوان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اردو اور سندھی کا تقابل پیش کیا گیا ہے، تاہم تفصیلی مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں سندھی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی دیگر زبانوں کو بھی بحث میں شامل کیا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخی لسانیات کے حوالے سے بھی عمدہ مباحث پیش کیے ہیں۔ شرف الدین اصلاحی بیان کرتے ہیں:

> ''زبان کی تاریخ خود انسان کی تاریخ ہے۔ علم اللسان (Philology) اور علم الانسان (Anthropology) میں گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں زبان کی تاریخ زیرِ بحث آتی ہے، وہاں نسلِ انسانی کا ذکر پہلے آتا ہے۔ علمائے لسانیات نے دنیا کی زبانوں کے ساتھ مختلف انسانی گروہوں اور خاندانوں کا جائزہ بھی لینے کی کوشش کی ہے اور زبانوں کی ساخت اور ثقافتی حالات سے بھی بحث کی ہے۔''۸۹؎

''اردو اور سندھی کے لسانی روابط' ایک تحقیقی مقالہ ہے جو تحقیق کے مختلف آلات اور معیارات کے مطابق تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے حوالہ جات کا درست اور برموقع استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر تنقیدی بحث بھی کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے محض اردو اور سندھی کے تعلق کو ہی محورِ بحث نہیں بنا رکھا بلکہ لسانیات کے مختلف شعبوں پر بھی مہارت سے تبصرہ کیا ہے۔ خاص طور پر جدید لسانیات کی اہم شاخوں صوتیات، مارفیمیات، نحویات اور فونیمیات کے تحت اردو اور سندھی کے لسانی رشتے پر مشتمل مباحث پیش کیے ہیں۔

اردو کا روپ (۱۹۷۱ء):

ڈاکٹر سہیل بخاری کی اردو میں لسانی مباحث پر مشتمل مساعی کا اظہار ''اردو کا روپ'' کی صورت میں مارچ ۱۹۷۱ء میں آزاد بک ڈپو، لاہور سے ہوا۔ ۴۲۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو کی کچھ اصطلاحیں بیان کرنے کے بعد بولی کی اٹھان، ارو کا گھرانہ، بولی کا پھیر، آوازوں، بولی کی بناوٹ، بول کے معنی و منصب جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں بولی کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل بخاری بیان کرتے ہیں:

> ''بولی بول سے بنی ہے اور بول کئی آوازوں کے معنی دار جُگٹ کو کہتے ہیں۔ آوازیں جب تک الگ الگ رہتی ہیں، ان کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ جیسے ہی وہ کسی ریت کی گھڑ کر بول بن جاتی ہیں، ان میں معنی آ جاتے ہیں۔ اسی لیے بولی کا نام آواز کی جگہ بول پر رکھا گیا ہے۔ بولی کی آوازیں دو بھانت کی ہوتی ہیں، سُر اور اسُر۔''۵۰

سہیل بخاری نے اردو اور ہندی الفاظ کی ملاوٹ سے سلیس اندازِ تحریر میں لسانی مباحث پیش کیے ہیں۔ انہوں نے سنسکرت اور ہندی الفاظ کا بھی خوب مطالعہ کر رکھا ہے۔ ان کی دیگر تصانیف ''اردو رسم الخط کے لسانی مباحث''، ''اردو کی کہانی''، ''لسانی مقالات'' (جلد اول تا سوم) میں بھی ان کا دوسرے ماہرینِ لسانیات سے الگ اسلوب ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے بعد انہوں نے لسانیات پر مسلسل کام کیا ہے۔ اردو زبان کے آغاز کے حوالے سے انہوں نے الگ نظریہ قائم کرتے ہوئے کھڑی بولی سے اردو کا تعلق جوڑا ہے۔ اس حوالے سے وہ ڈاکٹر گیان چند سے اختلاف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ گیان چند کھڑی بولی کو پہلے اور اردو کو بعد میں تصور کرتے ہیں جبکہ سہیل بخاری اردو زبان کو پہلے اور کھڑی بولی کا ذکر بعد میں کرتے ہیں یعنی اردو کا تعلق بولی سے جوڑتے ہیں جبکہ گیان چند کھڑی بولی کا تعلق اردو سے جوڑتے ہیں۔

جامع القواعد: حصہ صرف (۱۹۷۱ء):

اردو سائنس بورڈ لاہور نے ۱۹۷۱ء میں ''جامع القواعد (حصہ صرف)'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس کی تحریر کا ذمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو سونپا گیا تھا۔ یہ کتاب دس ابواب اور اشاریہ پر مشتمل تھی۔ اس

کا پہلا باب تاریخی پس منظر کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے جس میں اردو زبان کا خاندان، آریائی زبانوں کی تاریخ اور تقسیم، ہندآریائی زبانوں کے ارتقا، سنسکرت، پراکرت اور جدید ہند پاکستانی زبانیں اور بولیاں، برصغیر پاکستان و ہند کی غیر آریائی زبانوں اور بولیوں کے ساتھ ساتھ اردو کے صرفی ارتقا جیسے موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق انسانوں کی وسیع برادری کی طرح انسانوں کی زبانیں بھی قبیلوں اور خاندانوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ تاہم ان کے متعلق اب تک کوئی خاطر خواہ جائزہ لسانیہ نہیں لیا گیا۔ اگر زبانوں کے خاندانوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو برصغیر پاکستان و ہند غیر آریائی اور آریائی زبانوں کا عجائب خانہ معلوم ہوگا۔ اس طرح اردو کے لسانی ڈھانچے اور اردو کی قواعد نویسی کے آغاز و ارتقا پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

'اردو کا صوتی نظام' کے عنوان سے ''جامع القواعد (حصہ صرف)'' کا چوتھا باب قائم کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''حرف ایک تحریری علامت کا نام ہے۔ یہ ابتدائی بحث دراصل تحریر کی نہیں کلام کی بحث ہوتی ہے اور کلام کا سب سے سادہ جز حرف نہیں صوتیہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی زبان کے ایک صوتیہ کو ایک حرف پوری صحت کے ساتھ پیش کر سکے۔ اس لیے اکثر ایک مفرد صوت یعنی صوتیہ کو ایک سے زیادہ علامات کی مدد سے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔''[۱۵]

''اردو کا صوتی نظام'' کے عنوان سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایک خطبہ دیا تھا جسے یونیورسٹی نے ۱۸ر دسمبر ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا تھا۔ یہ خطبہ اس کتاب کا اہم حصہ ہے جس میں نظامِ صوت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے یہ نظریہ پیش کیا:

> ''صوتیوں کی دوسری نوع ایسی آوازوں کی ہے جن کو باہم ملنے کے لیے مصوتے کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو میں ان کی تفصیل یہ ہے۔ یہ صوتیے اردو رسم الخط میں حسب ذیل حروف سے ظاہر کیے جاتے ہیں:
>
> ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، د، دھ، ڈ، ڈھ، ر، رھ، ڑ، ڑھ، چ، چھ، ج، جھ،
> ح، خ، غ، ق، ک، کھ، گ، گھ

> ل، لھ
>
> م، مھ، ن، نھ، نگ
>
> و، وھ، ف
>
> ی، ء، ھ
>
> س، ش، ز، ژ
>
> ان کی کل تعداد چوالیس ہوتی ہے۔ اردو کے اکثر قواعد نویسوں نے مخلوط ہائیہ آوازیں الگ تصور نہیں کیں۔“[۵۲]

”جامع القواعد (حصہ صرف)“ کے دیگر ابواب میں اردو املا، اردو صرف اور اس کے مباحث و موضوعات پر بحث کرتے ہوئے صرفی قواعد کے اجزا یعنی اسم، فعل اور حرف کو تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اردو میں مشتق اور مرکب الفاظ کی وضاحت کی گئی ہے۔ یوں مجموعی طور پر اس کتاب میں اردو کے لسانی ڈھانچے کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قواعد پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

(اردو سائنس بورڈ نے اس منصوبے کا دوسرا حصہ ”جامع القواعد (حصہ نحو)“ کے نام سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے ذمہ سونپا جو ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آیا اور اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ کی جا سکے گی۔)

اردو زبان کی قدیم تاریخ (۱۹۷۲ء):

عین الحق فرید کوٹی نے اردو کے لسانی مباحث میں گرانقدر اضافہ کرتے ہوئے ۱۹۷۲ء میں ”اردو زبان کی قدیم تاریخ“ کے عنوان سے پیش کی جسے اورینٹ ریسرچ سنٹر، لاہور نے اشاعت سے ہم کنار کیا۔ لسانی مباحث کے حوالے سے اس کتاب کی اہمیت اس لیے ہے کہ عین الحق فرید کوٹی نے حافظ محمود شیرانی کی طرح اس میں سائنسی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے اردو کا تعلق دیگر زبانوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے سنسکرت اور لاطینی زبانوں کے تعلق کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اہلِ مغرب میں سنسکرت کو متعارف کرانے کا سہرا ولیم جونز (William Jones) کے سر باندھتے ہوئے وہ بیان کرتے ہیں:

> ”اہلِ مغرب کو سنسکرت سے متعارف کرانے اور تقابلی لسانیات کی داغ بیل ڈالنے

> میں سر ولیم جونز (William Jones) (۱۷۴۶ء تا ۱۷۹۴ء) کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ چوبیس سال کی عمر میں ہی اس نے دس غیر زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا جن میں عبرانی اور فارسی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ذریعہ معاش کے طور پر اس نے وکالت سیکھی۔ ۱۷۷۴ء میں وکالت کی سند حاصل کی۔ ۱۷۸۳ء میں کلکتہ سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا گیا۔ اس نے ۲۷ ستمبر ۱۷۸۶ء کو ایشیاٹک سوسائٹی کے تیسرے سالانہ جلسے میں تقابلی لسانیات کی بنیاد پر خطبہ دیا۔ اس خطبے میں اس نے سنسکرت، یونانی، لاطینی، جرمن، کلٹی اور فارسی کے درمیان باہمی لسانی رشتوں کا ذکر واضح کیا اور واشگاف الفاظ میں کیا۔"[۵۳]

عین الحق فرید کوٹی کے مطابق جرمنی کے مشہور ماہرِ لسانیات فرانز بوپ نے تقابلی لسانیات کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا اور اس حوالے سے وہ شلیگل کی تصنیف "ہندوستان کی زبان اور حکمت" سے متاثر تھا۔ اس نے پیرس جا کر سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۱۲ء میں سنسکرت کے صرفی پہلو کا یونانی، لاطینی، فارسی اور جرمن زبانوں سے موازنہ بھی پیش کیا۔ عین الحق فرید کوٹی تقابلی لسانیات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "تقابلی لسانیات کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کا سہرا جرمنی کے ماہر لسانیات فرانز بوپ (Franz Bopp) کے سر بندھتا ہے اور سنسکرت کی دریافت اس نئی سائنس کا پیش خیمہ ثابت ہوئی لیکن خود یورپ میں یہ تحریک پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ جوسف جسٹس شلیگر (Joseph Justus Scaliger) (۱۵۴۰ء تا ۱۶۰۹ء) نے یورپی زبانوں کے بارے میں ایک رسالہ قلم بند کیا جس میں اس نے ان زبانوں کو گیارہ مختلف گروہوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم کی بنیاد یں مترادالفاظ کی مطابقت اور ان کے اختلافات پر رکھی گئی تھی۔"[۵۴]

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عین الحق فرید کوٹی نے لسانی حوالے سے خاصا تفصیلی مطالعہ کر رکھا ہے۔ اس حوالے سے خاص طور پر مغربی لسانی مباحث پر توجہ کرنا ضروری ہے کیونکہ اردو کا دامن اس حوالے سے خاص اور بہتر کام سے کچھ تشنہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں لسانی مباحث پیش کرتے وقت مغرب کی طرف نظر دوڑائی

جاتی ہے جہاں سے اپنے مطلب کے موتی چن کر اردو کا دامن مالا مال کیا جاتا ہے۔

''اردو زبان کی قدیم تاریخ'' میں صوتیات کے حوالے سے خصوصی بحث ملتی ہے۔ اس ضمن میں عین الحق فرید کوٹی نے اردو زبان کا تعلق ''دروا ڑی'' سے جوڑتے ہوئے بیان کیا ہے کہ مختلف قوموں کے درمیان آوازوں کا اشتراک یا ان میں مماثلت کا کوئی غیر فطری بات نہیں ہے کیونکہ آوازیں ایک ہی قسم کی ہوتی ہیں جو مختلف نسلوں میں پائی جاتی ہیں۔ مخصوص صوتی نظام لسانی گروہوں کے درمیان وجہ امتیاز تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ یہ نقطۂ نظر اپناتے ہیں کہ ہندوستان کی تمام زبانیں دراوڑی ہیں اور ان کا خاندان ایک ہے جو دوسرے خاندانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان تمام زبانوں میں مشترک خصوصیات ملتی ہیں اور یہی ان کے دراوڑی ہونے کی پہچان ہے۔ دروا ڑی زبانوں کے حوالے سے چند مثالیں ان کی کتاب سے پیش کی جاتی ہیں:

> ''نا ڑ پچو (تامل): چالیس (نا ڑ ،نال: چار۔ پچو: دس)
>
> نا ڑ کالی (تامل): چار پاؤں والی یعنی کرسی۔ (نا ڑ: چار۔ کال: پاؤں۔ پنجابی: کھلا)
>
> کارہولو (کناری): برساتی گھاس (کار: موسم برسات۔ ہولو: گھاس)
>
> ہماری اپنی زبان بھی اسی قسم کے مرکبات سے بھری پڑی ہے جیسے کہ جنگجو، چارپائی، منجدھار اور کھیون ہار وغیرہ۔''[۵۵]

ماہرین زبان دنیا کی زبانوں کو صرف و نحو کے لحاظ سے دو بڑے گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اول: تعریفی، دوم: غیر تعریفی۔ آریائی، سامی اور بعض امریکی قبائل کی زبانیں پہلے گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور باقی زبانیں دوسرے گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

مجموعی طور پر عین الحق فرید کوٹی نے تقابلی لسانیات اور صوتیات کے حوالے سے اس کتاب میں بڑے اہم مباحث کو پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے اردو زبان و ادب میں اور خاص طور پر اردو زبان کی قدیم تاریخ کے حوالے سے اہم کام انجام دیا ہے۔

اردوئے قدیم (١٩٧٢ء):

ڈاکٹر محمد باقر کی تصنیف کردہ ''اردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں)'' کو مجلس ترقی ادب، لاہور نے اگست ١٩٧٢ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر محمد باقر نے مذکورہ تصنیف میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، ان میں قدیم اردو کا پس منظر، اردو کے مختلف نام اور مغلیہ دور میں اردو زبان کا فروغ اور اس کے صحیح مولد و منشا شامل ہیں۔ ٣٧٦ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اصل میں دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اردو کا تعلق پنجاب سے اور دوسرے حصے میں اردو کا تعلق دکن سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اردو کے مختلف ناموں کے حوالے سے ڈاکٹر محمد باقر نے درج ذیل نام گنوائے ہیں:

> ''اردو، ہندوستانی، ہندی یا پتہ ہندوئی (قدیم فارسی فرہنگوں میں ایک بے نام زبان)۔''٥٦

اردو کے ناموں کے حوالے سے ڈاکٹر نذیر احمد نے مجلہ اردو میں قدیم فارسی فرہنگوں کے سلسلہ میں لسانی نکتۂ نظر سے اہم بحث کا آغاز کیا اور اردو عناصر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اردو کو کبھی ''ہندی'' اور کبھی ''ہندوستانی'' کے نام سے پکارا گیا ہے:

> ''اہل ہندی خوانند۔ اہل ہندی گویند۔ بزبان ہندی گویند۔''٥٧

اس طرح اردو کے ناموں کے حوالے سے ڈاکٹر محمد باقر اعتراض اٹھاتے ہیں کہ فارسی کی پرانی فرہنگوں میں ''اردو'' کو ''اردو'' نہ کہنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح دیگر ماہرینِ لسانیات پر بھی اعتراض وارد کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس زبان کا نام ''ہندوستانی'' اور ''ہندی''' کیوں رکھا ہے؟ اور وحید الدین سلیم پانی پتی نے بھی ''افاداتِ سلیم'' میں ہندوستانی زبان کی جگہ ''ہندالمان'' لکھا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد باقر اپنا نکتۂ نظر پیش کرتے ہیں کہ اردو زبان کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ پانچ چھ سو سال پہلے اس کا نام ''زبانِ ہند'' یا ''اہلِ ہند کی زبان'' تھا۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں:

> ''یہ زبان سات دریاؤں کی اس سرزمین کی پیداوار تھی جس پر آریاؤں نے شروع شروع میں قبضہ کیا تھا۔ یعنی یہ آریاؤں کی زبان آریائی سے بھی قدیم تر ہے اور اس کی موجودہ شکلیں اردو، پنجابی، ملتانی، بہاول پوری اور خیرپوری وغیرہ ہیں۔''٥٨

اگر اس حوالے سے مولانا محمد حسین کے نظریات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کا کہنا ہے کہ اردو دہلی کی گلیوں میں گھٹنوں سے چلتی تھی۔ مسلمانوں نے اس کو سینے سے لگایا۔ ’’اردوئے قدیم‘‘ میں ڈاکٹر باقر نے پنجابی، ہریانی، برج بھاشا سے اردو کا تقابلی مطالعہ کر کے تقابلی لسانیات پر بحث کی ہے۔ صرف یہی نہیں، انہوں نے مذکورہ تصنیف میں اردو زبان کے قدیم و جدید، صرفی نحوی اور صوتی مطالعے کا جائزہ لینے پر بھی زور دیا ہے اور اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اردو زبان کا لسانی تجزیہ کر کے اس کا تاریخی ارتقا تفصیل سے بیان کیا جائے۔ اسی طرح قدیم اردو کی تا حال تبدیلیاں پیش کر کے اس کا تجزیاتی مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ مجموعی طور پر ’’اردوئے قدیم‘‘ کا مطالعہ اس بات کا غماز ہے کہ یہ اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔

جامع القواعد: حصہ نحو (۱۹۷۳ء):

اردو سائنس بورڈ کے زیر اہتمام جامع القواعد دو حصوں میں شائع کی گئی تھی جس کا پہلا حصہ ’’جامع القواعد (حصہ صرف)‘‘ کے عنوان سے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا گیا تھا جس کی تصنیف کی ذمہ داری ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے نبھائی تھی۔ جامع القواعد کا دوسرا حصہ ’’جامع القواعد (حصہ نحو)‘‘ کے عنوان سے ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی کاوشوں سے منظر عام پر آیا۔ یہ حصہ ۲۰۰۳ء میں دوبارہ اشاعت سے ہمکنار ہوا جسے مرکزی اردو بورڈ، لاہور نے شائع کیا۔

’’جامع القواعد (حصہ نحو)‘‘ نو (۹) ابواب مشتمل ہے جنہیں جملے کی ساخت، مسند الیہ ہونے والے کلمات، مسند، مفعولی اور تکمیلی کلمات، صفت، حروف اور ان کا استعمال، عطف، املا اور علاماتِ وقف اور مستثناتِ نحو کے عنوانات دیے گئے ہیں۔ کتاب کا آغاز ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں ’’نحو‘‘ کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان بیان کرتے ہیں:

> ’’نحو عربی لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی طریق، راہ، قصد، ارادہ اور اسلوب کے ہیں مگر اصطلاحی معنی اور ہیں۔ متاخرین نحاۃ عرب کے نزدیک یہ اس علم کا نام ہے جس سے کلامِ عرب کے اعراب معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس تعریف پر اعتراض کیا ہے اور بہتر تعریف پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ’’نحو کی تعریف متاخرین

> نے یہ کی ہے۔ علم باصول یعرف بہا احوال اواخر الکلم۔''۔۔۔۔ نحو کا علم اعراب سے
> ہے۔''[۵۹]

اسی طرح علم نحو کی تعریف و تفاصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے دیگر ماہرین لسانیات و قواعد کے حوالے بھی دیے ہیں جن میں ''احسن القواعد''، ''جامع القوانین''، گل کرسٹ کی ''قواعدِ زبانِ اردو''، پامر کی ''ہندوستانی زبان کی نحو''، شیکلٹ کی ''فارسی قواعد: حصہ نحو''، انشا کی ''دریائے لطافت''، نجم الغنی کی ''قواعدِ حامدی''، مولوی فتح محمد جالندھری کی ''مصباح القواعد''، مولوی عبدالحق کی ''قواعدِ اردو''، روسی مصنفہ سونیا چرنیکووا کی ''اردو کے صیغے'' کے علاوہ ''قواعدِ کشوری'' اور ''اساسِ اردو'' بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اس حوالے سے مولانا شبلی نعمانی کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان بیان کرتے ہیں کہ مولانا شبلی نعمانی کی ''فن نحو کی تدوینِ جدید'' نے قواعد نویسوں کو ایک حد تک متاثر کیا ہے[۶۰]۔

جہاں تک اردو میں نحو کے جدید ترین رجحانات کا تعلق ہے تو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان سونیا چرنیکووا کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ''اردو کے صیغے'' لکھ کر اردو نحو میں جدید ترین رجحانات کو پیش کیا ہے۔ اردو قواعد نویسی ایک نئی چیز ہے جو اردو نحو کے دوسرے پہلوؤں پر ایسی نوعیت کے تخصیصی اور تحقیقی مطالعے کی راہیں کھولتی ہیں۔

مجموعی طور پر ''جامع القواعد (حصہ نحو)'' بلاشبہ اردو لسانیات کے حصہ قواعد کے حوالے سے اہم کتاب ہے لیکن اس میں قواعد کے حوالے سے بحث زیادہ کی گئی ہے اور لسانی مباحث پر گفتگو نہ ہونے کے برابر ہے جس کا سبب بالکل واضح ہے کہ اس کے حصہ اول یعنی ''جامع القواعد (حصہ صرف)'' میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے تفصیلی بحث کر رکھی ہے۔ اگر دونوں حصوں کو ملا کر دیکھا جائے تو اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے ایک اہم تصنیف معلوم ہوتی ہے جو جدید خطوط پر تحریر کی گئی ہے اور اپنے عہد کی جدید ترین معلومات کو بھی بیان کرتی ہے۔

تاریخ ادبِ اردو (جلد اول ۱۹۷۵ء):

اردو ادب کی تواریخ پر ہمیشہ ہی کسی نہ کسی حوالے سے اعتراضات وارد کیے جاتے رہے ہیں اور ہر نئی تاریخ لکھنے والا ان اعتراضات کی روشنی میں غلطیوں سے مبرا تاریخ ادب لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب تک

اردو ادب کی جس قدر تواریخ لکھی گئی ہیں، ان میں سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی چار جلدوں پر ضخیم (مگر نامکمل) اور غلطیوں سے کافی حد تک مبرا تاریخ کو بلند مقام حاصل ہے۔ اس تاریخ کی جلد اول پہلی دفعہ مجلس ترقی ادب، لاہور نے جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع کی جبکہ اس کا پانچویں اشاعت مارچ ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادبِ اردو'' ایک بہت بڑا کارنامہ ہے کیونکہ اس میں تحقیقی اغلاط کافی حد تک کم ہیں اور یہ اردو ادب کے طلبہ و اساتذہ کو یکساں استفادے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ''تاریخ ادبِ اردو'' کی جلد اول اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے جس میں اردو زبان کی پیدائش کے حوالے سے مباحث شامل ہیں۔ اردو زبان کا پنجاب کے ساتھ تعلق ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی بیان کرتے ہیں:

> ''پنجاب اور اہلِ پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناتا روزِ اول ہی سے قائم ہے اور اہلِ پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانے سنوارنے میں حصہ لیا ہے۔ وہ زبان جو عبوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہنچی، اس کی ساخت، اس کے مزاج، لہجے اور آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا۔ قدیم گجری و دکنی ادب کے نمونوں میں جب ہم پنجابی اثر و مزاج کو دیکھتے ہیں تو ذرا دیر کو حیرت ضرور کرتے ہیں لیکن ہماری حیرت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ہم اردو اور پنجاب کے اثر و رشتہ کی تاریخ کو روشنی میں دیکھ کر ان نمونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔''[۱۲]

اردو زبان کے آغاز کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل نے ''تاریخ ادبِ اردو'' جلد اول میں اردو کی پیدائش کے حوالے سے لسانی بحث کو تحقیقی نکتہ نظر سے اور تفصیلی انداز سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے محض اردو زبان کا تعلق صرف پنجاب سے ہی نہیں جوڑا گیا بلکہ سندھ، سرحد اور بلوچستان سے بھی واضح کیا گیا ہے۔

''تاریخ ادبِ اردو'' کی جلد اول اردو زبان کے آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک کے عرصے کا احاطہ کرتی ہے اور چھ فصلوں کے علاوہ پانچ ضمیمہ جات پر مشتمل ہے جبکہ آخر میں کتب، اشخاص، مقامات اور موضوعات کا اشاریہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ لسانی مباحث کے حوالے سے کچھ زیادہ تفاصیل اس کتاب میں شامل نہیں ہیں لیکن جس قدر تفاصیل مہیا کی گئی ہیں، وہ گزشتہ موجود ماخذ و منابع سے حاصل کی گئی ہیں اور ان کے متعلق اپنی یا کوئی حتمی رائے سے گریز کا اظہار دکھائی دیتا ہے۔

زبان کا ارتقا (۱۹۷۷ء):

اردو میں لسانی مباحث کے پاکستانی کام کا جائزہ لیا جائے تو چند ہی نام سامنے آئیں گے جنہوں نے خاص طور پر ''لسانیات'' کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ انھی افراد میں ایک نام خلیل صدیقی کا ہے۔ ''زبان کا ارتقا'' خلیل صدیقی کی ہی تصنیف ہے جو ۱۹۷۷ء میں پہلی بار زمرد پبلی کیشنز، کوئٹہ نے شائع کی۔ خلیل صدیقی مذکورہ تصنیف کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''اصوات، ارکان، الفاظ، محاوروں اور فقروں کا معروضی تجزیہ زیادہ سے زیادہ مرکزِ توجہ بن رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لسانیات کے فروغ کے اسباب علمی ہی نہیں بلکہ سیاسی بھی ہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان ایک طرح کی تکثیری سائنس یا عام العلوم ہے کیونکہ سائنسی دعوؤں کا وسیلہ وہی ہوتی ہے اور زبان کا مطالعہ اپنے دامن میں بہت سے علوم کو سمیٹ لیتا ہے۔ لسانیات اخذ کردہ نتائج، تاریخ انسانی نیز انسانی ذہن، مزاج، ثقافت، نسلی رشتوں کی تاریخ، بشریات کے مسائل اور خود حضرتِ انسان کو سمجھنے کے لیے بڑے کارآمد اور دلچسپ ثابت ہوتے ہیں۔ لسانیاتی تکنیک کی زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ صورت، دوسری زبانوں کے سیکھنے اور ان میں بول چال کی مہارت پیدا کرنے میں مدو معاون ہوسکتی ہے۔''[۶۲]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیل صدیقی نے نہایت اختصار کے ساتھ نہ صرف لسانیات کی ضرورت واہمیت کو بیان کر دیا ہے بلکہ مختلف علوم کے ساتھ اس کے تعلق اور روابط کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ یہی اجمال ہمیں باقی ماندہ تصنیف میں دکھائی دیتا ہے جہاں انہوں نے مختلف مباحث کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

زبان یا بول چال کی ابتدا اور پیدائش کے بارے میں خلیل صدیقی کا خیال یہ ہے چونکہ زبانوں کی اولین تاریخ موجود نہیں ہے اس لیے ان الفاظ کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا جو ہم بولتے ہیں یعنی نطق کا آغاز کیسے ممکن ہوا اور ان کو بولنے والا پہلا شخص کون تھا؟ اسی طرح ان کا یہ نقطۂ نظر بھی ہے کہ الفاظ میں صوتی معنوی تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں جو زبانوں کے تشکیل پانے کے ساتھ ساتھ ان میں تغیرات کا ذریعہ بنتے رہتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ ڈنمارک کے ماہرِ لسانیات آٹو یسپرسن کا حوالہ دینے کے ساتھ ساتھ ان کے بیان کا تجزیہ بھی

کرتے ہیں:

> ’’ڈنمارک کے مشہور ماہرِ لسانیات آٹو یسپرسن کی رائے میں افراد کے حوالے کے بغیر لسانیات کا صحیح حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس نے افراد کے حوالے ہی سے نموئے لسان کے مباحث کو پیش کیا ہے اور بحث کی۔ اس صورت کو ’’لسانیاتی حیاتیات‘‘ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔‘‘[۶۳]

اسی طرح زبان کا تعلق سماج سے جوڑتے ہوئے خلیل صدیقی بیان کرتے ہیں کہ زبان ایک سماجی ورثہ ہوتی ہے اور سماج کے ذریعہ ہی اس میں کاٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے۔ زبان کی تبدیلی اور اضافہ ہر لفظ کی کسی نہ کسی فرد کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ زبانوں کی تاریخی و تقابلی مطالعے اور ان کی ساخت کے تجزیوں سے صوریاتی گروہ بندی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیل صدیق باور کرتے ہیں کہ ماہرینِ لسانیات نے قدیم ترین ہند یورپی کی جدید تشکیل کی ہے:

> ’’ماہرِ لسانیات وھٹنے کے نزدیک زبان کے مسئلے کا تعلق زبانوں کے باہمی رشتوں کے مسئلے کی طرح بلاواسطہ لسانی شواہد سے نہیں بلکہ فلسفۂ لسان سے ہے۔‘‘[۶۴]

مجموعی طور پر ڈاکٹر خلیل صدیقی نے لسانی تغیرات کے مختلف پہلوؤں پر بھی بحث کی ہے اور بیان کیا ہے کہ لسانی تغیرات نہ صرف صوتی ہوتے ہیں بلکہ صوریاتی بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح نہ صرف لسانیات میں لغوی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ معنیاتی تبدل بھی رونما ہوتا ہے البتہ اصوات میں معانی اور نحوی رشتوں کے مقابلے میں زیادہ صریحی تبدیلیاں ہوتی ہیں اس لیے لسانی تغیرات کی کوئی مخصوص تشریح نہیں ہوتی۔

فلسفۂ جدید اور اس کے دبستان (۱۹۸۱ء):

پروفیسر ڈاکٹر سی۔ اے قادر کی تصنیف کردہ ’’فلسفۂ جدید اور اس کے دبستان‘‘ کی طبع اول مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی جانب سے جون ۱۹۸۱ء میں اشاعت سے ہم کنار ہوئی۔ یہ تصنیف بنیادی طور پر علمِ فلسفہ سے متعلق ہے تاہم اس میں لسانی فلسفہ اور منطقی اثباتیت کے حوالے سے لسانیات کو سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے اور فلسفی نقاد زبان کو اچھے طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس حوالے ڈاکٹر سی۔ اے قادر لکھتے ہیں:

> ’’جی۔ ای۔ مور (G.E. Moore) اصولِ اخلاقیات (Principia Ethica) کی تمہید میں لکھتا ہے کہ جب میں کسی فلسفی کو پڑھتا ہوں تو اول تو میں دیکھتا ہوں کہ وہ

> کیا کہتا ہے اور پھر جو کچھ کہتا ہے، وہ اس کے لیے کیا دلائل لاتا ہے۔ یہ پہلا جملہ کہ ”وہ کیا کہتا ہے“ لسانی پروگرام کا پیش خیمہ ہے۔ یہ ٹھیک معلوم نہ ہو سکے گا کہ کوئی فلسفی کہتا کیا ہے، جب تک اس کے الفاظ اور ان الفاظ سے جو فقرے بنتے ہیں، ان کا تجزیہ نہ کر لیا جائے۔“[۶۵]

ڈاکٹر سی۔ اے قادر کی یہ تصنیف اگرچہ جدید مغربی فلسفیانہ افکار کے حوالے سے معلومات مہیا کرتی ہے، لیکن لسانی فلسفہ اور منطقی اثباتیت جیسے مضامین اسے لسانی مباحث کے دائرے میں جزوی طور پر ضرور داخل کر دیتے ہیں۔ وٹگنسٹائن (Wetgenstien) جو منطقی اثباتیت کا امام ہے، اس نے Tractatus نامی شہرۂ آفاق کتاب لکھی تھی جس میں اس نے بیان کیا تھا کہ اگر اظہار بہتر نہ ہو سکے تو زبان بند ہی رکھنی چاہیے۔ زبان اظہار کا بہترین وسیلہ ہے اور منطقی اثباتیت والوں کا نکتہ نظر ہے کہ جذباتی بیان پر توجہ نہ دی جائے کیونکہ وہ معانی سے خالی ہوتے ہیں۔ منطقی اثباتی زبان کو مثالی بنانا چاہتے ہیں اور جملوں کی ساخت ریاضیاتی منطق کے اصولوں پر کرتے ہیں۔

کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ (۱۹۸۲ء):

اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے تحقیقی کام کچھ زیادہ مقدار کا حامل نہیں ہے۔ اس میدان میں خاص طور پر مختلف زبانوں کے تقابل کے حوالے سے بہت کم کام ہوا ہے۔ ”کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ“ پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر ہونے والا ایسا ہی کام ہے جسے ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اس سے قبل اسی طرح کے موضوع پر شرف الدین اصلاحی (اردو اور سندھی کے لسانی روابط، مطبوعہ ۱۹۷۰ء) کر چکے ہیں۔ تاہم ان کے کام کا محور اردو اور سندھی کا تقابلی مطالعہ نہ تھا، اگرچہ اس حوالے سے انہوں نے کچھ بحث ضرور کی ہے۔ البتہ ”کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ“ اس ذیل میں اہمیت کا حامل ہے جسے مرکزی اردو بورڈ، لاہور نے ستمبر ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ اس حوالے سے انہوں نے نہ صرف دونوں زبانوں کی پیدائش، ابتدا اور نشو و نما کے مراحل کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے بلکہ دونوں زبانوں کے تعلق پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد یوسف اردو اور کشمیری کو دو مستقل زبانیں قرار دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> ”یہ دونوں زبانیں بغیر کسی شک و شبہ کے اپنی اپنی انفرادیت اور یکسانیت رکھتی ہیں۔ ان کے مآخذ اور استخراج ایک ہی ہیں لیکن ان کی ارتقائی راہ مختلف رہی۔ الفاظ کی

> تعمیر و تشکیل میں اردو اور کشمیری زبان کے درمیان فرق ہے۔ لیکن کچھ نقاط یا باتیں ایسی ضرور ہیں جن پر ان دونوں زبانوں کا اتصال یا تعاون ہوتا ہے۔"۶۶

اسی باب کے ابتدائی اوراق میں کشمیری اور اردو کے لسانی روابط کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اسی طرح اردو اور کشمیری الفاظ کا لسانی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف بخاری کے مطابق کشمیری اور اردو زبان کے مادے ایک ہیں۔ اس حوالے سے وہ دونوں زبانوں کے مصادر اور اُن کے معنوی و صوتی مماثل کو بھی بیان کرتے ہیں ۶۷۔

اردو	کشمیری		اردو	کشمیری
اٹکنا	اٹکن		پکڑنا	پکڑن
اجڑنا	اجڑن		بکنا	بکن
اچھلنا	اچھلن		بچنا	بچن
اڑنا	اڑنا		بنانا	بناون

اسی طرح ڈاکٹر موصوف نے اردو گرامر کے دیگر قواعد خاص طور پر فعل حال، فعل ماضی اور فعل ماضی اقسام میں مماثلت کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق ماضی کے افعال میں بھی دونوں زبانوں میں قدر مشترک پائی جاتی ہے اور فعل مضارع میں بھی جس میں حال اور مستقبل دونوں زمانے پائے جاتے ہیں۔ اس طرح کشمیری زبان میں مصدر سے فعل مضارع بنایا جاتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے بھی یوسف بخاری نے امثال کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں زبانوں میں اعداد کے لیے بولے جانے والے الفاظ میں بھی زیادہ فرق نہیں ہے ۶۸۔

اردو	کشمیری		اردو	کشمیری
ایک	اکھ		بیس	وہ
دو	زہ		تیس	ترہ
تین	ترہ		چالیس	ژتجہ

چار	ژور		پچاس	پنچہ
پانچ	پانژہ		ساٹھ	شیٹھ
چھ	شہہ		ستر	ستتھ
سات	ستھ		اسی	شیتھ
آٹھ	اٹھ		نوے	نمتھ
نو	نو		سو	ہتھ
دس	دہ		ہزار	ساس
			لاکھ	لچھ

''کشمیری اردو زبان کا تقابلی مطالعہ'' کے عمیق مطالعے سے یہ بات علم میں آتی ہے کہ فاضل مصنف نے اس تحقیقی مقالے کو تحقیقی آلات اور معیارات کے مطابق خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے اور دونوں زبانوں کا تقابل لسانیاتی تحقیق کو مدنظر رکھتے ہوئے بہتر طریقے سے کیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف بخاری کے مطابق اردو اور کشمیری زبان میں بہت سے اسم عربی، فارسی اور انگریزی سے لیے گئے ہیں۔ اسی طرح جیسے اردو میں بہت سے الفاظ علاقائی زبانوں کے دکھائی دیتے ہیں، کشمیری زبان کا دامن بھی ایسے علاقائی الفاظ سے خالی نہیں ہے۔ یہ امر محض الفاظ کی سطح پر نہیں ہے بلکہ بہت سے افعال اور مصادر بھی علاقائی زبانوں سے کشمیری زبان میں داخل ہوئے ہیں۔ اسی طرح جہاں اردو میں ہندوستان میں بولی جانے والی بے شمار زبانوں الفاظ رائج ہیں، کشمیری زبان میں بھی ان زبانوں کے الفاظ اردو کے راستے داخل ہوئے ہیں۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر یوسف بخاری نے اردو اور کشمیری کے لسانی، صوتیاتی اور قواعدی طریقہ کار میں پائی جانے والی مشابہت اور مطابقت کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اس طرح سے مذکورہ تصنیف تحقیقی نکتہ نظر سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

لسانی مباحث (۱۹۹۱ء):

پروفیسر خلیل صدیقی اردو زبان اور لسانیات کے حوالے سے اہم خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری جیسے ماہرین لسانیات کے بعد پاکستان میں لسانی مباحث کے میدان میں کام کرنے والے پروفیسر خلیل صدیقی ہیں۔ انہوں نے کوئٹہ اور ملتان میں رہتے ہوئے لسانیات جیسے خشک موضوع کو بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔ لسانیات کے حوالے سے انہوں نے مغربی فلسفیوں، نقادوں اور ماہرینِ لسانیات کا بھی خوب مطالعہ کیا ہے۔ ان کی تصنیف ''لسانی مباحث'' ۱۹۹۱ء میں زمرد پبلی کیشنز کوئٹہ سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔

''لسانی مباحث'' خالصتاً لسانیات کے موضوع پر تحریر کی گئی ہے اور اس کی فہرست سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں لسانیات کی تمام شاخیں اور ان کی تفاصیل بیان کر دی گئی ہیں۔ اس میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے، ان میں تاریخی لسانیات، ہند آریائی لسانیات، صوتیہ، فونیمیات، صرف و نحو، ساختیات، معنیات، زبان اور شناخت، لغت نویسی، اردو املا اور مسائل کے ساتھ ساتھ پاکستان میں لسانی مسائل شامل ہیں۔ ''لسانیات'' کی تعریف کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> ''جب لسانیات کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ وہ زبان کی سائنس ہے تو یہ تعریف دائرہ علم و وقوف (Knowledge) اور دیگر سائنسی مطالعات کی طرح دوسرے علوم سے کچھ مخصوص رابطوں اور موضوع کی شعبہ جاتی تقسیم کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ لسانیات کو طبیعی سمعیات، عضویات، نفسیات، بشریات سے بھی رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن دوسرے علوم کی طرح اس کا ارتقائی سفر بھی جاری ہے۔ اس کے نئے نئے افق اور نظریے ابھرتے رہے ہیں۔''[۷۹]

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ خلیل صدیقی نے لسانی مباحث کے حوالے سے مغرب کا تفصیلی مطالعہ کر رکھا تھا، انہوں نے محض ان کا حوالہ ہی نہیں دیا بلکہ ان کی تشریحات بھی دی ہیں۔ مثال کے طور پر مغربی ماہر لسانیات ''جیکب گرم'' کے نظریے پر بحث کرتے ہوئے خلیل صدیقی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان ہی لفظ کا موجد ہے۔ زبان ابتدائی تین مصوتوں (a, i, u) اور چند مصمتوں پر مشتمل تھی۔ ہر لفظ ایک رکن ہوتا تھا اور

مجرد تصورات کم تھے۔ صوتی اکائیوں یا رکنوں کے اعانے نے ان آوازوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا ہے۔ آواز کی صوتی کیفیت کے بارے میں خلیل صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''دو مختلف آلات سے پیدا ہونے والی ایک ہی صوتی سطح کی آوازوں میں تفریق صوتی کیفیت ہی کی بدولت ہوتی ہے۔ دو افراد ایک ہی آواز یکساں صوتی کیفیت ہی کی بدولت ہوتی ہے۔ دو افراد ایک ہی آواز یکساں صوتی سطح پر ادا کریں تو بھی ان میں سے ہر ایک کی آواز منفرد کی جا سکتی ہے۔''[۷۰]

یعنی آواز نطق کے مختلف طریقوں سے پیدا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر انسان کے مصوتے ادا کرنے کا طریقہ کار الگ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آواز کی گونج اور اس میں خلا پیدا ہونا ہر انسان کا ایک الگ خاصا ہے۔ ہر انسان کی صوتی کیفیت ہی مختلف نہیں ہوتی بلکہ ہر انسان کا لہجہ بھی مختلف ہوتا ہے۔ ایک تلفظ کو دو انسان تقریباً الگ الگ ادا کرتے ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ ہر ایک کے گلے میں فرق ہوتا ہے۔

''لسانی مباحث'' کا بغور مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خلیل صدیقی نے جن لسانی مباحث اور لسانیاتی موضوعات کو پیش کیا ہے، اس قبیل کے موضوعات پر بہت کم کام ہوا ہے۔ خلیل صدیقی کے مطابق زبان کا سائنسی مطالعہ ہی لسانیات ہے۔ اس طرح زبانوں کے لسانی مواد کا تجزیہ اور تقابل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تاریخ حضرت آدم تک جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کی زبان کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے۔ اس تناظر میں عبرانی کو انسان کی قدیم ترین زبان قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبرانی کے الہیاتی زبان اور ام السنہ ہونے کے تصور نے قیاسی اشتقاقیات کی راہیں ہموار کی ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان قبائل در قبائل میں تقسیم ہوتا گیا، اسی طرح زبان کے خاندان بھی وجود میں آتے گئے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خلیل صدیقی کا نکتہ نظر یہ ہے:

> ''زبان کے وسیلے سے ہماری جو شناخت ہوتی ہے، اس کی متعدد سطحیں اور کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ہماری تکلمی زبان یا بول چال کی کچھ خصوصیات کم و بیش مستقل ہوتی ہیں اور ان سے عمر، جنس، صحت یا جسمانی نوعیت، جذباتی کیفیت وغیرہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔''[۷۱]

درج بالا بحث سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہو جاتا ہے کہ خلیل صدیقی نے ۳۹۸ صفحات پر مشتمل تصنیف ''لسانی مباحث'' میں بہترین مواد کے ذریعے عمدہ ترین نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے لسانیات کے تمام قدیم اور جدید نظریات اور ماہرینِ لسانیات کے حوالے سے جو مفصل مباحث و تشریحات پیش کی ہیں، وہ ''لسانی مباحث'' کو اہم تصنیف قرار دینے پر مجبور کرتی ہیں۔

اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ (۱۹۹۱ء):

پاکستان میں لسانی مباحث کے حوالے سے جو اہم نام شامل کیے جاتے ہیں، ان میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا نام سرفہرست ماہرینِ لسانیات میں رکھا جاتا ہے۔ ''اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ'' ان کی ایسی ہی تصانیف میں شامل ہے جو اُن کے مقام و مرتبے کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مذکورہ تصنیف مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے ۱۹۹۱ء میں شائع کی جو درحقیقت دو حصوں میں منقسم ہے۔ ۲۰۲ صفحات پر مشتمل اس تصنیف کا پہلا حصہ اردو زبان کا صوتی نظام ہے جبکہ دوسرا حصہ تقابلی مطالعہ ہے جس میں تقابلی لسانیات پر مفصل بحث شامل ہے۔ فارسی کا صوتی تبادل، فارسی اور رویدک، سنسکرت پراکرت، اردو اور انگریزی، اردو اور فارسی، اردو سنسکرت، اردو اور رویدک وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر سائنسی بنیادوں پر بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ہندی زبان کو بھی خوب سمجھتے ہیں اور اسی حوالے سے انہوں نے ہندی اور اردو صوتیات کا تقابلی مطالعہ عمدہ طریق پر کیا ہے۔ ''اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ'' ایسی تصنیف نہیں ہے جسے عام قاری سمجھ سکے۔ اسے سمجھنے کے لیے صوتیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اردو زبان کی اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری بیان کرتے ہیں:

> ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو کا سرمایہ مانگے تانگے کا ہے، وہ غلطی پر ہیں۔ اردو آوازیں ذاتی ہیں۔ الفاظ نجی ہیں۔ معنی اپنے ہیں اور نظامیات (گرامر) کے اصول فطری اور داخلی ہیں۔''۲؎

بڑے اور اہم محقق و نقاد کی شناخت یہ ہے کہ وہ نہ صرف دیگر زبانوں اور علوم سے استفادہ کرتا ہے بلکہ ان کی تشریح و توضیح کرنے کے ساتھ ان میں ترمیم و اضافہ بھی کرتا ہے۔ اردو میں لسانیات کے حوالے سے کام

کرنے والوں میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے مغربی لسانی فلاسفہ کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے جیکب گرم کے دریافت کیے ہوئے لسانی قوانین کے ساتھ ساتھ دیگر مغربی ماہرینِ لسانیات کے پیش کردہ صوتی تغیرات کے اسباب، مختلف زبانوں کا تقابلی مطالعہ اور خاص طور پر اردو زبان کا دیگر زبانوں سے تقابل کے لیے تحقیق کے معیاری آلات اور کٹھن جستجو کے ساتھ پیش کیا ہے۔ صوتی تبادل کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل بخاری کا نظریہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

> ''دنیا کی ہر زبان میں کسی لفظ کی ایک یا ایک سے زیادہ آوازوں کا اس کے معنی بدلے بغیر بیک وقت گر جانا یا بڑھ جانا یا ایک آواز کا دوسری آواز کے آگے پیچھے ہو جانا یا کسی آواز کا کسی دوسری آواز سے بدل جانا مجموعی طور پر صوتی تغیر کہلاتا ہے۔ ان صوتی تغیرات کو الگ الگ بالترتیب سقوط، اندراج، تقلیب و توازن اور صوتی تبادل کہتے ہیں۔ ان میں صوتی تبادل زبان کا اہم ترین بنیادی اصول ہے جس کی بدولت ایک ایک لفظ کے کئی کئی ہم معنی لفظ بنتے رہتے ہیں اور زبان کے سرمایے میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔''۳؎

زبان کے حروفِ تہجی میں آوازوں کا دو اقسام میں تبدیل ہونا فطری بات ہے۔ جس طرح جسم کی ہڈیوں کو ہلایا جائے تو حرکت میں آ جاتی ہیں، ہی طرح زبانوں کی آوازوں کو جب منہ سے ادا کیا جائے تو وہ دو طرح کی ہو جاتی ہیں جن کو علت اور صحیح آوازوں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری بیان کرتے ہیں:

> ''۱۔ سُر جسے انگریزی میں واول (Vowel)، سنسکرت میں سُوَر اور عربی میں حرفِ علت کہتے ہیں۔
>
> ۲۔ اَسُر جسے انگریزی میں کانسوننٹ (Consonant)، سنسکرت میں وینجن اور عربی میں حرفِ صحیح کہتے ہیں۔ اسے میں نے اَسُر (اَ بمعنی نہیں + سُر یعنی جو سُر نہیں ہے) نام دیا ہے کیونکہ اردو میں بھی عربی کی تقلید میں آوازوں کی جگہ حروف کے نام ہوتے ہیں۔''۴؎

اس حوالے سے ہم یہ جانتے ہیں کہ تمام زبانیں وقت کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور یہ تبدیلیاں صوتی مخارج

کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر سہیل بخاری نے ''اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ'' میں صوتی تبادل کو بطورِ خاص موضوعِ بحث بنایا ہے اور اس ضمن میں مغربی ماہرینِ لسانیات کے نظریات کی روشنی میں نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کاوشوں کی مدد سے انہوں نے اردو کو دنیا کی جدید زبانوں کے مقابل کھڑا کر دیا ہے۔

لسانیاتِ پاکستان (۱۹۹۲ء):

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی نے ''لسانیاتِ پاکستان'' کے عنوان سے ایک اہم تصنیف قلم بند کی ہے جسے مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا۔ مذکورہ تصنیف میں ڈاکٹر میمن عبدالمجید نے اردو زبان کا پاکستانی زبانوں سے تعلق قائم کرنے کے ساتھ اردو کا اِن زبانوں سے تقابل دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب کا دوسرے حصے میں صوبہ وار تمام علاقائی زبانوں کے ابواب قائم کیے گئے اور ان زبانوں کے متعلق مفید اور اہم معلومات درج کی ہیں۔ صرف یہی نہیں ''لسانیاتِ پاکستان'' میں لسانیات کی تعریف اور دیگر مباحث کو بھی عمدگی سے بیان کرنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں اپنی رائے بھی قائم کی ہے۔ اردو کے لسانی تعلقات پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر میمن عبدالمجید لکھتے ہیں:

> ''ملتان کی سرائیکی آگے بڑھ کر پنجابی زبان سے جا ملتی ہے۔ اس تدریجی علاقائی تبدیلی کو دیکھ کر ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سرائیکی زبان، وادیٔ سندھ کی زبان کی وہ درمیانی کڑی ہے جو سندھی زبان کو پنجابی سے ملاتی ہے۔ لہٰذا وہ ہندکو اور کشمیری سے بھی تعلقات کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسی طرح وادیٔ سندھ میں کراچی سے لے کر کشمیر تک ان زبانوں کو ایک دوسری کے ساتھ کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے۔''[۵]

''لسانیاتِ پاکستان'' اردو زبان و ادب اور پاکستان کی صوبائی و علاقائی زبانوں کے کے آغاز و ارتقا کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کے حروفِ تہجی کی لسانی اور صوتیاتی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس حوالے سے سندھی، پنجابی، سرائیکی اور اردو کے مصادر کا تعلق بھی واضح کیا گیا ہے کہ ان میں کس قدر مشابہت موجود ہے۔ ذیل کی چند مثالیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں[۶]:

اردو	پنجابی	سرائیکی/ملتانی	سندھی
ابھرنا	ابھرنا	ابھڑن	ابھڑن
بگاڑنا	بگاڑنا	بگاڑݨ	بگاڑݨ
ترسنا	ترسݨا	ترسݨ	ترسݨ
ٹنگنا	ٹنگݨا	ٹنگݨ	ٹنگݨ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرائیکی اور سندھی آپس میں بہت قریب ہیں۔ ان کی صوتی اور معنوی لحاظ سے آوازیں اور مفہوم ایک جیسی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے مطابق سرائیکی کو اسی لیے سندھ کے سرے کی زبان کہا جاتا ہے کیونکہ وادیٔ سندھ اور ملتان بہت پرانے شہر تھے جو محمد بن قاسم کے حملوں ۷۱۲ء میں ایک ہی ریاست ہوتے تھے۔ ان کی تہذیب بھی آپس میں ملتی جلتی ہے۔ سرائیکی اور سندھی کے پ، ڈ، چ، گ اصوات کے بجائے اردو اور سندھی میں ب، د، ج، گ ہیں۔

''لسانیاتِ پاکستان'' میں ڈاکٹر میمن عبدالمجید کشمیری، سندھی، سرائیکی، پنجابی اور کسی حد تک اردو میں گہری مطابقت پیش کی ہے۔ ان کے مطابق جس طرح اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں میں عربی اور پارسی الفاظ، مصادر معاون کے طور پر آتے ہیں اسی طرح کشمیری میں بھی مصادر معاون کے ساتھ مل کر استعمال ہوتے ہیں۔ اردو میں ''کرنا'' پنجابی میں ''کرݨا''، سرائیکی میں ''کرݨ'' اور سندھی میں ''کرݨ'' مصادر معاون کے طور پر آتا ہے جبکہ کشمیری زبان میں ''کرن'' اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ویران کرنا (اجاڑنا) حملہ کرن وغیرہ؟؟۔

اسی طور پر ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی نے پاکستان کی تمام صوبائی اور علاقائی زبانوں کا جائزہ پیش کیا ہے اور ان تمام زبانوں کا اردو کے ساتھ ربط بھی پیش کیا ہے۔ اپنے موضوع اور لسانی مباحث کے حوالے سے بلاشبہ ''لسانیاتِ پاکستان'' ایک اہم کاوش ہے۔

آوازشناسی (۱۹۹۳ء):

خلیل صدیقی کی تصنیف ''آوازشناسی'' ۱۹۹۳ء میں بیکن بکس، ملتان سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ ۱۵۱ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف بنیادی طور پر لسانیات کی اہم شاخ ''صوتیات'' پر مبسوط بحث پر محیط ہے۔ بنیادی طور پر اس تصنیف کے محض دو ابواب ہیں جن میں سے ایک کا عنوان صوتیات اور دوسرے کا فونیم اور

فونیمیات ہے۔ صوتیات (Phonetics) کی تعریف کرتے ہوئے خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

> ''صوتیات'' تکلمی آوازوں یا اصوات (Articulated Sounds or Phones) کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔ اس کے مستنبط اور منضبط اصولوں کا اطلاق تمام زبانوں پر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں اجزائے آواز یا وضع اصوات سے بھی بحث کی جاتی ہے اور آوازوں یا اصوات کی ماہیت، نوعیت، صفات اور کیفیات سے بھی۔ وضع اصوات کے ذیل میں ان کے مخارج یا ''جوف دہن'' یا منہ کے اندر کے خلا کے وہ مقامات بھی آ جاتے ہیں جہاں سے انہیں ادا کیا جاتا ہے۔''[۷۷]

صوتیات درحقیقت لسانیات کی اہم شاخ گردانی جاتی ہے۔ خلیل صدیقی نے صوتیات کی مزید تین ذیلی شاخوں کی وضاحت بھی بڑی تفصیل سے کی ہے۔ اس ضمن میں انگریزی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور اعضائے صوت کے حوالے سے اشکال کی مدد سے تشریح بھی کی گئی ہے۔ اسی طرح مصوتی آوازوں اور مصمتی آوازوں سے متعلق بھی جزوی تفاصیل بیان کی گئی ہیں۔

صوتیات کے بعد خلیل صدیقی نے فونیمیات (Phonology) پر بھی تفصیلی بحث کرنے کے علاوہ اس کی دو ذیلی اقسام یعنی Segmental Phonology اور Supra-Segmental Phonology کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ''آواز شناسی'' کے تفصیلی مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ خلیل صدیقی نے صوتیات اور فونیمیات کے علاوہ معنیات، عضویات، نطقی صوتیات، سمعی صوتیات، طبیعاتی صوتیات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسی طرح اگر تاریخی لسانیات کی بات کی جائے تو ہمیں قدیم ہند میں صوتیات اور عربی صوتیات یعنی عربی حروف کے مخارج کی وضاحت بھی ملتی ہے جبکہ آخر میں اصطلاحاتِ لسانیات کا مفہوم بیان کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ خلیل صدیقی کی یہ کتاب صوتیات کے حوالے سے ایک اہم تصنیف ہے جس میں انگریزی اصطلاحوں کی تشریح بڑے اچھے انداز میں کی گئی ہے۔

عمومی لسانیات: ایک تعارف (۱۹۹۳ء):

رائل بک کمپنی، کراچی کی جانب سے ۱۹۹۳ء میں اشاعت سے ہمکنار ہونے والی کتاب ''عمومی لسانیات: ایک تعارف'' ڈاکٹر عبدالسلام کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے لسانیات کی تحقیق کے فوائد بیان

کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”لسانیات کی تحقیق سے حاصل ہونے والے علم کی مدد ایسے مریضوں کا علاج کیا جا سکتا ہے جن کے نظامِ تکلم (Speech Machanism) میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو یا کوئی خلقی خامی پائی جاتی ہو۔ اس طریقہ علاج کو Speech Therapy کہتے ہیں۔“ ۸؎

اگر اس ضمن میں آر۔ ایچ رابنسن کی کتاب "General Linguistics: An Introductry Survey" کی کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر عبدالسلام کی تصنیف ”عمومی لسانیات: ایک تعارف“ اسی کتاب کا بلا کم و کاست ترجمہ ہے۔ آر۔ ایچ رابنسن اپنی تصنیف میں بیان کرتے ہیں کہ دیسی اور غیر ملکہ زبانوں کی تدریس میں لسانیات اور صوتیات کے ذریعے بہت سے فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ تدریسی نصاب تیار کرتے وقت لسانیات کے اصولوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے تا کہ طالب علموں کی بہتر ذہنی نشوونما کو ممکن بنایا جا سکے۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے اگرچہ رابنسن کی کتاب کا ترجمہ کیا ہے تاہم اس کا کسی مقام پر ذکر نہیں کیا۔ اس لحاظ سے ان کی کاوش کسی درجہ کمتر ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے سند کے طور پر آر۔ ایچ رابنس کی مذکورہ تصنیف یعنی "General Linguistics: An Introductry Survey" ملاحظہ کی جا سکتی۔ دونوں تصانیف کی ابواب بندی صاف ظاہر کرتی ہے کہ ایک ہی کتاب دو زبانوں میں تحریر کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی یہ ترجمہ شدہ تحریر اگرچہ سرقہ کی ذیل میں آتی ہے، تاہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس طرح کی کتب کا اردو میں وجود نہیں ہے اور ڈاکٹر عبدالسلام نے اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اُردو کا صوتی نظام (۱۹۹۷ء):

صوتیات علمِ زبان یا لسانیات کا اہم جزو ہے جس پر کئی ماہرینِ لسانیات نے تحقیق و تنقید کے در وا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ”اردو کا صوتی نظام“ ڈاکٹر محبوب عالم خان کی ایسی ہی تصنیف ہے جسے مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے ۱۹۹۷ء میں اشاعت سے ہمکنار کیا۔ یہ تصنیف درحقیقت مصنف کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جس میں لسانی صوتیات کے طبیعاتی اور سمعیاتی پہلوؤں سے زیادہ نطقیاتی پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔

صوتیات (Phonetics) اور علم صوتیہ (Phonemics) پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر محبوب عالم لکھتے ہیں:

> ''صوتیات کے ذریعے ہم خام مواد حاصل کرتے ہیں اور علم صوتیہ کے ذریعے اس مواد کو قابل استعمال شکل دیتے ہیں۔ عملی صوتیات کسی زبان کی آوازوں کو تلفظی (Articulatory)، سمعیاتی (Acoustic) اور سمعی (Auditory) سطح پر پرکھنے اور بیان کرنے کا نام ہے لیکن آوازوں کی ادائیگی اور سماعت کی خصوصیت ہر فرد کے ساتھ مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک زبان کے بولنے والے بھی آوازوں کو بالکل یکساں ادا نہیں کرتے۔ لہٰذا ایسی تمام آوازوں کو جو کسی زبان میں لسانی اہمیت کی حامل ہوں، ان کی عمومی خصوصیات کی بنا پر علیحدہ کرنا علمِ صوتیہ سے تعلق رکھتا ہے۔''۹۷

ڈاکٹر محبوب عالم نے مذکورہ تصنیف میں صوتیاتی رسم الخط اور علامات کے حوالے سے خاصی دلچسپ بحث کی ہے۔ ان کے مطابق تحریر میں مختلف حروف اور علامات کے ذریعے آوازوں کو لکھا جاتا ہے اور ہم آواز یا ہم صوت والے حروف کو Homophone کا نام دیا جاتا ہے۔ مذکورہ مقالے میں یہ بحث بھی شامل ہے کہ IPA Transcription کے تحت اردو کی خکی معکوسی آوازوں کے لیے بین الاقوامی صوتیاتی حروف کے نیچے نشان لگانے کی بجائے نقطہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محبوب عالم نے اردو رسم الخط اور علامتوں کے لیے صوتی رسم الخط اور علامتیں اردو حروفِ تہجی اور انگریزی حروف کے ساتھ موازنہ اور تقابل کرتے ہوئے تفصیلی بحث شامل کی ہے۔

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ کسی بھی زبان کے حروفِ تہجی کسی دوسری زبان کے تمام تر حروفِ تہجی کا نعم البدل نہیں ہوتے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہر زبان کے بنیادی حروفِ تہجی مخصوص تعداد میں ہوتے ہیں اور ان میں کمی بیشی بھی پائی جاتی ہے۔ اس لیے بین الاقوامی سطح پر انگریزی کی مدد سے مختلف زبانوں کے حروفِ تہجی اپنا اپنا تشخص ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محبوب عالم نے اس حوالے سے اردو اور انگریزی حروفِ تہجی کا خصوصی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کا نکتۂ نظر یہ ہے کہ اردو کی ''ت'' کے لیے انگریزی حرف "t" اور اردو ''ٹ'' کے لیے صوتیاتی رسم الخط انگریزی حرف "t" کے نیچے نقطہ لگا کر صوتی علامت بیان کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ کار امریکی صوتیاتی رسم الخط سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہی صورتِ حال ہمیں ''د'' اور ''ڈ'' کی آواز کے لیے بھی دکھائی دیتی

ہے جہاں "d" اور "ḍ" استعمال کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محبوب عالم خان نے ”اردو کا صوتی نظام“ کی دوسری فصل میں اردو مصوتے، سانس اور آواز، مصوتے اور مصمتے کی آوازوں کو شاملِ بحث کیا ہے اور اس ضمن میں اردو کے دس اساسی مصوتے بیان کیے ہیں۔ صوتی خصوصیات کی اکائیوں کے حوالے سے ڈاکٹر محبوب عالم خان بیان کرتے ہیں:

> ”صوتی خصوصیات زبان کے معنیاتی نظام پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں اور چونکہ زبان بنیادی طور پر ترسیلِ ابلاغ کا ذریعہ ہے، لہٰذا ان خصوصیات کو پرکھے اور سمجھے بغیر صوتیاتی نظام کا علم ناپختہ اور تشنہ رہ جاتا ہے۔ امریکی ماہرینِ لسانیات نے ان خصوصیات کو فوق قطعاتی خصوصیات (Supra-Segmental Features) کا نام دیا ہے۔“[۱۸]

مجموعی طور پر ڈاکٹر محبوب عالم خان کا مقالہ اردو کے صوتی نظام کو سمجھنے کے لیے انتہائی اہم ہے۔ اس میں جہاں انہوں نے ماضی کے مآخذ سے استفادہ کیا ہے، وہیں صوتیاتی تحقیق کی مدد سے کچھ نئے نظریات بھی پیش کیے ہیں۔ اس سے قبل ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس میدان میں طبع آزمائی کی تھی اور ڈاکٹر محبوب عالم خان نے ان سے ایک قدم آگے بڑھ کر سلیس انداز میں یہ مقالہ پیش کیا ہے جو جدید لسانیات کی اچھی مثال سمجھا جاتا ہے۔

جدیدیت اور مابعد جدیدیت (۱۹۹۹ء):

ضمیر علی بدایونی کا بنیادی حوالہ ماہرِ لسانیات کا نہیں ہے، تاہم انہوں نے ”جدیدیت اور مابعد جدیدیت“ کے عنوان سے ایک فلسفیانہ تحریر ضرور پیش کی ہے جس میں کچھ لسانی فلسفیانہ مباحث اور لسانی فلسفیوں جن میں سائسیئر کا نام سرِ فہرست ہے، کے افکار کا اظہار ضرور ہے۔ ”جدیدیت اور مابعد جدیدیت“ اختر مطبوعات، کراچی کی جانب سے ۱۹۹۹ء میں پہلی بار اشاعت سے ہم کنار ہوئی۔ مذکورہ تصنیف میں جن موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے ان میں جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات اور نئی لسانی تشکیلات اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے ساختیات اور نئی لسانی تشکیلات خالصتاً لسانی مباحث ہیں جن پر ضمیر علی بدایونی نے قلم فرسائی کی ہے۔ لسانی تشکیلات خاص طور پر اس لیے اہمیت کی حامل ہیں کہ اس کی ابتدا افتخار جالب، انیس ناگی

اور سعادت سعید جیسے افراد نے کی جو ادبی حوالے سے اہم مقام کے حامل ہیں۔ ضمیر علی بدایونی بھی چونکہ بنیادی طور پر ادیب ہیں، اس لیے ان کی مذکورہ تصنیف میں فلسفیانہ عناصر کے ساتھ ساتھ ادبیت کی شان بھی پائی جاتی ہے۔

لسانی مباحث کے ساتھ ساتھ ’’جدیدیت اور مابعد جدیدیت‘‘ میں مغربی مفکرین کے افکار و نظریات کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ ان مغربی مفکرین میں سا سیئر، لیوی سٹراس، ژاک لاکاں، دریدا وغیرہ کے نام زیادہ اہم ہیں۔ سا سیئر کو بنیادی طور پر اردو لسانیات میں اہم مقام حاصل ہے اور ان کے افکار کو عموماً پیش کیا جاتا ہے۔ ضمیر علی بدایونی سا سیئر کے ساختیاتی افکار کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ’’سا سیئر کے نزدیک زبان ایک خود مکتفی نظام ہے جو اپنے اندرونی قوانین سے عمل پیرا ہے۔ دنیا میں اشیا کا وجود زبان کی ماہیت کا تعین نہیں کرتا بلکہ اس کے بالکل برعکس لفظ خالصتاً ایک ایسا نشان ہے جسے من مانے طور پر قائم کیا گیا ہے جس کی ہستی دوسرے لفظوں سے مختلف ہونے پر قائم ہے۔ زبان بنیادی اکائیوں کے درمیان رشتوں کا ایک نظام ہے۔ یہ ہیئت و صورت ہے جوہر نہیں۔ نشان معنی کی بنیادی اکائی ہے۔ یہ نشان پر مشتمل ہوتا ہے۔ لفظ تمثال یا اشارندہ اور نفسی تصور یا معروضِ اشارت پر جسے انگریزی میں Signifier اور Signified کہتے ہیں۔ سا سیئر کی یہ دو اصطلاحیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں اور سچ پوچھیے تو سا سیئر کی فکر کا یہ حصہ سب سے زیادہ معروف و مشہور ہے۔‘‘ ۸۲؎

گویا نشان اور نشان نما دونوں لسانی حقیقتیں ہیں جو نشان کی وحدت میں مدغم ہیں۔ ضمیر علی بدایونی کے مطابق یہ دونوں انسان کی مرضی کے مطابق ظہور پذیر ہوتیں اور ایک رشتہ میں منسلک ہوئی ہیں۔

مجموعی طور پر ضمیر علی بدایونی نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تصورات کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ مذکورہ تصنیف ’’جدیدیت اور مابعد جدیدیت‘‘ میں انہوں نے ساختیات اور لسانیاتی تناظر میں نئی ادبی تنقید کو مغربی فلسفی نقادوں سے موازنہ اور تقابل کر کے نئی جدیدیت کو فروغ دیا ہے۔ خاص طور پر اس تصنیف کا مطالعہ مغربی لسانیاتی فلاسفہ کو سمجھنے میں کارآمد ہے۔

اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ (۲۰۰۸ء):

اردو زبان و ادب میں تاریخ نگاری اور نفسیاتی نقاد کے طور پر ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ فکشن میں نفسیات کا مطالعہ ان کا اہم موضوع رہا ہے۔ ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے حوالے سے ان کی شہرت کو بقائے دوام حاصل ہے جس کے بعد انہوں نے ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ'' تحریر کر کے اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے بھی اپنی پہچان بنانے کی کوشش کی ہے۔ ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ'' ۲۰۰۸ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ'' میں جن موضوعات پر بحث کی ہے ان میں سے ایک جدید لسانیات کا صوتیاتی مطالعہ ہے جسے باب اول میں ''عالم صوت'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس باب میں لسانیات کو بطور سائنس پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح اردو زبان کے مختلف ناموں پر جو تنقیدی مباحث پیش کیے گئے ہیں، اہمیت کے حامل ہیں۔ دیگر موضوعات میں اردو زبان کا آغاز اور اس ضمن میں مختلف نظریات کا تنقیدی مطالعہ، اصلاحِ زبان اور اردو رسم الخط، اردو لغت نویسی، اردو میں قواعد نگاری، تراجم اور اصطلاحات شامل ہیں۔ آخری باب کو ''اردو زبان: مباحث و مسائل'' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے جس میں خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو زبان پر بحث کی گئی ہے۔

زبان کا تعلق انسان ہے۔ جب سے انسان کا کائنات میں ظہور ہوا ہے، اسی دن سے زبان کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کا بیان یہ ہے کہ جس طرح انسانوں کا ایک جدِ امجد ہے، اسی طرح زبانوں کی بھی ایک ماں ہے اور انسان کے کنبے کی طرح زبانوں کے بھی خاندان ہیں۔ اس نظریہ کو ''وحدت اللسان'' کا نام دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ''زبان کیا ہے؟'' کی بابت بیان کرتے ہیں:

> ''بائبل میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے "Logos" (لفظ/کلام) تھا۔ قرآن مجید میں ''الکتاب'' اور ''القلم'' کہا گیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو غارِ حرا میں اولین درس ''اقرا'' کی صورت میں ملا۔ یہودیوں میں تحریر کو حضرت یونسؑ کی عطا بتایا گیا تو ہندو اساطیر میں فنونِ لطیفہ اور ادب و شعر کی سرپرست دیوی سرسوتی ہے۔ اسی طرح دیگر

> ممالک کی اساطیر میں زبان، تحریر اور تخلیقات کے لیے سرپرست دیوتا اور دیویاں
> مقرر کی گئی ہیں۔“[۸۳]

چنانچہ ڈاکٹر سلیم اختر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ابتدا میں جب زبان کا آغاز ہوا تو اس وقت صرف گنتی وغیرہ اور چند الفاظ ہی ہوتے تھے۔ بعد ازاں جب انسان رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کرتا گیا، اس طرح اس کی زبان بھی ترقی کے مدارج طے کرنے لگی۔ حتیٰ کہ اب زبان ”لسانیات“ کے درجے تک پہنچ گئی ہے اور لسانیات نے بطور ایک سائنس کے ترقی کر لی ہے۔ اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر اردو زبان تک پہنچتے ہیں اور اردو قواعد نویسی کی بابت تاریخ رقم کرتے ہیں:

> ”اردو زبان کی سب سے پہلی قواعد جان جوشوا کیٹلر "John Joshwa Ketaer" کی ۱۷۴۳ء Lingua Hindustanica تسلیم کی جاتی ہے۔ اسے لاطینی زبان میں سمجھا جاتا رہا ہے لیکن ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے جس مقدمے کا حوالہ دیا جا چکا ہے، اس میں انہوں نے بنجمن شلزے کے حوالے سے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے: ”یہ لاطینی نہیں، ڈچ تھی۔“ تاہم عام طور پر اسے لاطینی ہی میں سمجھا جاتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ تازہ ترین تالیف ”کتابیات قواعد اردو“ (۱۹۸۵ء) میں بھی اسے لاطینی زبانوں میں درج کیا گیا ہے۔“[۸۴]

اس بحث کے دوران ڈاکٹر سلیم اختر نے بنجمن شلزے کی ”ہندوستانی گرائمر“ کو قرار دیا ہے جبکہ اس کی تصنیف ۳۰ رجون ۱۷۴۱ء میں عمل میں آئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ تک کے کام پر تبصرہ کیا ہے اور مجموعی طور پر کیٹلر سے ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ تک اردو قواعد کی اہم کتب کا تفصیلی تعارف اور تذکرہ کیا ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر سلیم اختر کی تصنیف ”اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ“ اپنے اختصار کے باوجود جامعیت کی حامل ہے۔ اردو زبان کی تاریخ پر اس قدر جامع اور مبسوط تحریر اس سے قبل دکھائی نہیں دیتی۔ اگرچہ ضمناً زبان کی تاریخ چند کتب میں بیان کی گئی ہے، تاہم مذکورہ تصنیف خالصتاً اردو زبان کی تاریخ اور زبان سے متعلق مختلف لسانی پہلوؤں کا عمدہ احاطہ کرتی ہے۔

لسانیات زبان اور رسم الخط (۲۰۰۹ء):

۱۶۰ صفحات پر مشتمل ڈاکٹر اشرف کمال کی تصنیف کردہ ''لسانیاتِ زبان اور رسم الخط'' مثال پبلشرز، فیصل آباد نے ۲۰۰۹ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر اشرف کمال نے اس تصنیف میں زبان کی تعریف، ابتدا اور ارتقا جیسے موضوعات پر مختصر اور جامع بحث کی ہے۔ بعد ازاں اردو کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کا تعلق ہند آریائی سے لے کر ہند یورپی زبانوں تک واضح کیا ہے۔ اسی طرح شمالی ہند میں اردو کے ورود اور دکن میں اردو زبان و ادب کے بارے میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اردو رسم الخط، حروفِ تہجی، املا وغیرہ کے موضوعات پر بھی لسانی نکتہ نظر سے اہم مباحث شامل کیے گئے ہیں جبکہ لسانیات کی تعریف بیان کرنے کے ساتھ اس کی مختلف شاخوں پر بھی اختصار سے قلم فرسائی دکھائی دیتی ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر اشرف کمال کی یہ کاوش لسانیات کی ذیل میں بنیادی موضوعات کی تعریفوں کو سمجھنے میں بہت مفید ہے۔ اس تصنیف میں جہاں لسانیات کی چند بنیادی تعریفیں دی گئی ہیں، وہ ڈاکٹر گیان چند کی تصنیف ''عام لسانیات'' سے ماخوذ ہیں۔ تاہم لسانیات اور زبان پر کام کرنے والے طالب علموں کے لیے یہ ایک اہم کتاب اس لیے بن جاتی ہے کہ اس میں لسانیات کی بنیادی کتب کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

بنیادی اردو قواعد (۲۰۱۰ء):

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے جہاں اردو زبان و ادب کے دیگر شعبوں میں اپنی خدمات پیش کی ہیں، وہیں کسی حد تک لسانی مباحث پر مشتمل کتب کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔ انھی میں سے ایک ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ کے قلم سے نکلی ''بنیادی اردو قواعد'' بھی ہے جو ۲۰۱۰ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ ۴۷۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پیش لفظ افتخار عارف نے تحریر کیا ہے۔ وہ اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ماہرینِ لسانیات کے لیے نہیں، زبان سے عمومی دلچسپی رکھنے والے صاحبانِ ذوق کے لیے بھی قواعد کی بڑی اہمیت ہے۔ زبان کی نشو و نما میں قواعد کا بہت اہم کردار رہتا ہے۔ ایک عرصہ سے یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ قواعد کی ایک ایسی کتاب تصنیف کی جائے جو اہلِ علم کے تمام طبقوں کے ساتھ ساتھ خاص طور پر اساتذہ و طلبہ کی

> ضروریات کو پورا کر سکے۔ پیش نظر کتاب ''بنیادی قواعد اردو'' ممتاز اسکالر ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ نے ان ہی خطوط پر مرتب کی ہے۔''۸۵

ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ نے مذکورہ تصنیف میں لفظ کی ساخت، ترکیب اور ماخذ کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب میں افعال کی ایک فہرست لفظی اور لغوی معنی کے ساتھ دی گئی ہے۔ سابقوں اور لاحقوں پر بحث بھی اس کتاب کا جزو ہے جبکہ لفظ سازی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی دکھائی دیتی ہے۔ صرف یہی نہیں، اصطلاحات، عربی و فارسی قواعد نویسی اور جدید فارسی قواعد کی اہمیت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ علم صرف اور لفظ کی تعریف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ بیان کرتے ہیں:

> ''صرف: وہ علم جس میں حروف و حرکات کے تغیر و تبدل سے مختلف طرح کے الفاظ اور مختلف قسم کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔
>
> لفظ: انسان کے منہ سے جو مختلف آوازیں یعنی طرح طرح کے حروف نکلتے ہیں، ان کو لفظ کہتے ہیں۔''۸۶

اسی طرح علم نحو کی تعریف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ لکھتے ہیں:

> ''نحو وہ علم ہے جس سے اجزائے کلام کو ترکیب دینے اور جدا جدا کرنے کا ڈھنگ آتا ہو اور کلمات کے ربط اور باہمی تعلق کا حال معلوم ہوتا ہے اور جس غلطی سے مطلب میں خلل واقع ہو، اس سے کلام کو بچاتا ہے۔''۸۷

ڈاکٹر سہیل عباس نے اپنی اس تصنیف میں اردو حروف تہجی کی تعداد باون (۵۲) بیان کی ہے۔ مجموعی طور پر یہ تصنیف اردو قواعد کے حوالے سے بنیادی اہمیت کی حامل ہے جو طالب علموں اور اساتذہ کو یکساں استفادے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ بنیادی گرامر سیکھنے کے لیے اس کا مطالعہ انتہائی اہم ہے۔

درج بالا بحث میں بیان کردہ کتب کے علاوہ بھی لسانی مباحث کے حوالے سے پاکستان میں کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی تصانیف اس ضمن میں اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے لسانیات کے حوالے سے جو کتب پیش کیں، ان میں ’’اردو کا روپ‘‘، ’’اردو کی کہانی‘‘، اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث‘‘، ’’اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ‘‘ کے علاوہ تین حصوں پر مشتمل ’’لسانی مقالات‘‘ بھی شامل ہیں۔ اسی طرح ان کی ایک اور اہم کتاب کا عنوان ’’اردو کی زبان‘‘ بھی ہے جس میں انہوں نے صوتیات کے حوالے سے بحث کی ہے۔ صوتیات کے حوالے سے ہم گزشتہ ابواب میں بحث کر چکے ہیں کہ صوتیات، لسانیات کی سب سے اہم شاخ ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے زبان کے صوتی یا فونی تجزیے میں عموماً تین اصطلاحیں استعمال کی ہیں یعنی فون، فونیم اور ذیلی فونیم۔ ان کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل بخاری بیان کرتے ہیں کہ زبان سے جو بھی آواز تلفظ کی جاتی ہے، فون یا صوت کہلاتی ہے۔ فونیم سے ہم آواز کی بنیادی اور ذیلی حیثیت کا پتہ لگاتے ہیں۔ ذیلی فونیم لفظ میں معنی کی بجائے تلفظ کے فرق کا پتہ لگایا جاتا ہے۔

’’لسانی فلسفہ اور فکشن کی شعریات‘‘ یونس خان ایڈووکیٹ کی تصنیف ہے جو جنوری ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے اس تصنیف میں اردو بطور خاص حافظ محمود شیرانی، رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی کاوشوں کو سراہا ہے۔ لسانی مباحث میں اضافہ کرتے ہوئے یونس خان زبان کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ سب سے اہم معاشرتی آلہ زبان ہے جو کہ انسان کا حقیقی شعور ہے۔ زبان پیداواری عمل کے دوران معاشرتی رشتوں میں پیدا ہوئی۔ معانی سماج میں ظاہر ہوتے ہیں۔ معروف لسانی مفکر ڈی سوئسر (De Saussure) نے اس تصور کی تردید کی کہ زبان کوئی جوہری یا قائم بالذات شے ہے۔ اس کی بجائے اس نے زبان کے نسبتی تصور کو اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح یونس خان کے مطابق زبان اشیا کو نام دینے والا نظام نہیں بلکہ زبان افتراقات کا نظام ہے۔ اس کے نزدیک زبان (Language) ایک جامع تجریدی نظام ہے جبکہ گفتار (Parole) اس کی محدود انفرادی شکل ہے۔ باختن سرکل نے سوئسر کے لسانی فلسفہ پر تنقید کی اور یہ کہا کہ زبان کے قواعد و ضوابط کے اس نظام نے زبان کو ایک مقدس شے بنا دیا ہے۔ زبان تصرف (Use) کا نام نہ کہ کوڈ (Code) یا زیر کار فرما نظام کا، زبان کی گرامر کی نمایاں خصوصیات کو بھی سماجی عناصر متاثر کرتے ہیں۔ گرامر، اسلوب اور سوشیالوجی کے متعلق سوالات کو

ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہیئت پسندوں نے زبان کی معنوی جہت کو اپنی فکر میں کوئی جگہ نہ دی اور زبان کو محض ظاہری رشتوں کا وظیفہ قرار دیا۔ باختن نے زبان کو نظام کی بجائے سماجی سرگرمی کے طور پر دیکھا۔ وہ زبان کے دایالوجک (Dialogic) وجود پر زور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک زبان ایک بند نظام نہیں، اس طرح زبان کے ارتقا کے بارے میں اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس کتاب کا مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ یونس خان نے اپنے نظریات بیان کرنے کی بجائے مختلف یورپی فلاسفۂ لسانیات کے خیالات کو یکجا کر کے ان کا تقابل کرنے کی سعی کی ہے۔

''لسانیات اور تنقید'' ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا کام ہے۔ انہوں نے مغربی فلسفی نقادوں اور ماہرینِ لسانیات کے اہم مضامین کا حوالہ دیا ہے۔ یہ کتاب ان کے تحقیقی مضمون کے نام پر ہے جس میں بلوم فیلڈ کی کتاب "Language" کے حوالے سے بحث بھی شامل کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے مطابق ایک ماہرِ لسانیات تمام لوگوں کی زبان کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ کسی عظیم ادیب کو نہیں جانچتا بلکہ اس علاقے کے تمام رہنے والوں کی زبان کو سمجھنا چاہتا ہے۔ ناصر عباس نیر نے سوسئیر کے نظریۂ لینگ اور پیرول کے حوالے سے بھی بحث کی ہے۔

''لسانیات اور تنقید'' جنوری ۲۰۰۹ء میں پورب اکادمی، اسلام آباد کی جانب سے اشاعت پذیر ہوئی جو ۲۹۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے اہم مضامین میں نوآبادیاتی صورتِ حال، ادبی تاریخ نویسی میں تنقید، ساختیات: حدود اور امتیازات، جدیدیت کی فکری اساس، گلوبلائزیشن اور اردو زبان، لسانیات اور تنقید، سماجی سائنسوں کے پیراڈائم وغیرہ شامل ہیں۔ ''لسانیات اور تنقید'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر بیان کرتے ہیں:

> ''ساختیاتی لسانیات سے تنقید نے غیر معمولی مدد لی ہے۔ اس مدد کے نتیجے میں تنقید، نئی تنقیدی تھیوری، میں منقلب ہوئی ہے۔ تنقید کا تھیوری کا لیبل اختیار کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ساختیات کے زیرِ اثر تنقید نے بھی ادبی متون کی طرح نظری ماڈل مرتب کیے ہیں۔''[۸۸]

اردو میں لسانی مباحث

(ہندوستان میں ہونے والے کام کا جائزہ)

اردو زبان اور اس کا رسم الخط (۱۹۴۸ء):

سید مسعود حسن رضوی ادیب کی تصنیف ''اردو زبان اور اس کا رسم الخط'' ۶۸ صفحات پر مشتمل ایک مختصر رسالہ نما کتاب ہے جس کے آخر پر ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے عنوان سے جان بیمز کا مشہور پمفلٹ ہے جس کا اصل نام "An Outline of Indian Philology" ہے، یہ اسی کا ترجمہ ہے۔ پانچ ابواب پر منقسم اس کتاب کا آغاز ۵۰ صفحات پر مشتمل مقدمے سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے جس کے پہلے حصے میں اردو کی ابتدا کے متعلق لسانی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

> ''اردو اصل میں شمالی ہند کی ایک عوامی بولی تھی جس میں تاریخی حالات کے ماتحت سنسکرت، قدیم ایرانی، قدیم یونانی، تورانی، فارسی، عربی، ترکی، فرانسیسی، پرتگالی، انگریزی اور نہ معلوم کن کن زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے رہے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبے جو ایک زمانے میں مختلف ملکوں کی حیثیت رکھتے تھے، ان کی زبانوں یعنی پنجابی، گجراتی، بنگالی وغیرہ کے الفاظ بھی اس میں ملتے رہے۔''۵۹؎

اسی طرح اس تصنیف کے دوسرے حصے میں اردو کے رسم الخط کے مباحث بیان کیے گئے ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے لسانی مباحث کی ذیل میں قدیم تر کام اور خدمات کے حوالے سے بھی بحث کی ہے اور فورٹ ولیم کالج اور ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی کی لسانی خدمات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کی لسانی اہمیت مسلم ہے جس میں قیامِ پاکستان کے بعد پہلی دفعہ ہندوستان میں اردو کے لسانی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کاوش قابلِ قدر دکھائی دیتی ہے کہ ہندوستان میں جہاں ہندی کے نام سے رسم الخط تبدیل کر کے اردو ہی کو رائج کر دیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ ہندی ہی درحقیقت مقامی زبان ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ ہندی، ہندوی یا ہندوستانی ''اردو'' کے ہی قدیم نام ہیں جس کا رسم الخط عربی و فارسی تھا اور اسی کا تذکرہ قدیم کتب ہائے لسانیات و قواعد میں ملتا ہے۔

مقدمہ تاریخ زبان اُردو (۱۹۴۸ء):

انگریزوں کی آمد کے بعد مقامی باشندوں میں جہاں جاہ و حشم، مذہب و روایت، سیاست و معاشرت کے حوالے سے تقسیم ہوئی، وہیں زبان کے حوالے سے بھی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ خاص طور پر ہندوؤں نے اردو کو مسلمانوں کی جبکہ ہندی (سنسکرت سے بوجھل اُردو) کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اسے بطور سرکاری زبان رائج کرنے پر زور دیا۔ اس تمام تر صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ''مقدمہ تاریخ زبان اُردو'' کے عنوان سے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کیا جو ۱۹۴۸ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور دہلی سے شائع ہوا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد جب قرارِ پاکستان منظور ہوئی تھی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کافی وسیع ہو چکی تھی اور آپس کے اختلافات کی ضربیں زبان پر بھی پڑ رہی تھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کا مقالہ اس وقت اردو زبان کے مقدمے کے طور پر پیش کیا گیا جس کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ زبان کے معاملے میں سیاست کو دخل نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی زبان سے محبت میں سیاست سے ڈرنا چاہیے۔

''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' میں لسانی نظریوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس کے پہلے مضمون بعنوان ''ہندوستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ ہے۔ اس میں آریوں کا وطن اور ہندوستان میں ورود کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے بیان کیا گیا:

> ''ہند یورپی خاندان کی زبانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ماہرینِ لسانیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ تمام زبانیں کسی ایک قدیم زبان سے نکلی ہیں لیکن اس سلسلے میں ہمیں میکس مولر کا قول نہیں بھولنا چاہیے کہ زبانوں کے ہند یورپی خاندان کا وجود اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اس کے بولنے والے بھی ایک ہی نسل سے ہیں۔ یہ اصل زبان کیا تھی؟ اس کے بولنے والے کہاں بستے تھے؟ اور وہ کس طرح یورپ و ایشیا کے وسیع براعظموں میں پھیلے؟ آریوں کے متعلق یہ ایسے سوال ہیں جن پر محققین آج تک متفق نہیں ہو سکے۔''[۹۰]

اس طرح ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اردو زبان کی تاریخ کو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے کئی صدیاں بیشتر سے شروع کرتے ہوئے آگے تک پہنچتے ہیں۔ اس حوالے سے اگر آریوں کی تاریخ کی مطالعہ کیا جائے تو معلوم

ہوگا کہ ان کی تاریخ کے بارے میں محض قیاس آرائیاں ہی کی گئی ہیں، کوئی حتمی رائے نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کی قدیم کتابیں جو کئی ہزار برس قبل تحریر کی گئیں، وہ بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ البتہ ہندوؤں کے مذہبی عقیدے کی رو سے تبت انسان کا پہلا گھر سمجھا جاتا ہے اس لیے انہوں نے آریاؤں کو بھی اسی علاقے سے منسوب کیا ہے۔ سنسکرت کی قدیم کتب میں بھی آریوں کے بدیسی ہونے کا اشارہ نہیں ملتا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ آریائی لوگ ہندوستان کی زمین سے اُٹھے تھے جو پھر ایران اور یورپ کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے شاعری، تنقید، تحقیق، تدوینِ متن، لسانیات اور اردو زبان کی تاریخ کے حوالے سے اہم کام کیا ہے۔ لسانیات، صوتیات اور اسلوبیات کے ساتھ ان کی خاص دلچسپی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری، محقق اور نقاد کے علاوہ ماہرِ لسانیات بھی مانے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی تصنیف ''شعر و زبان'' بھی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تصنیف ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد (دکن) سے شائع ہوئی۔ اس کا ایک اہم مضمون ''اردو صوتیات کا خاکہ' اردو صوتیاتی تحقیق کے حوالے سے پہلا مضمون خیال کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے اردو اصوات کا معروضی اور سائنسی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے آپ کے حوالے سے ''نذرِ مسعود'' کے نام سے اہم مضامین مرتب کیے ہیں جو اردو کے لسانی مباحث کے حوالے سے ایک اہم کام بن جاتے ہیں۔

اردو کی کہانی (۱۹۵۶ء):

سید احتشام کی ۱۰۴ صفحات پر مشتمل مختصر تصنیف قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی سے ۲۰ر جون ۱۹۵۶ء میں اشاعت سے ہم کنار ہوئی۔ سید احتشام حسین نے اس تصنیف میں ہندوستان کو ''زبانوں کا گھر'' کہتے ہوئے کہا:

> ''بنگالی، مراٹھی، گجراتی، پنجابی، سندھی، آسامی اور اُڑیا بھی نئی آریائی زبانیں ہیں۔
> یہ بھی تاریخ کا ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو ان
> زبانوں کی بھی ترقی ہوئی۔''[۹۱]

جیسا کہ قبل ازیں (گزشتہ باب میں) بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں پراکرتیں جن کا نام شورسینی تھا، بولی جاتی تھیں، انہی کے پیٹ سے بھاشائیں پیدا ہوئی جن کا نام ہندوستانی، ہندی اور بالآخر اردو رکھا گیا۔ اردو

زبان کی ابتدا اور دکنی ہندوستان میں اور برج بھاشا، اودھی، راجستھانی، مرہٹی، بنگالی وغیرہ سب نے ترقی کی۔ اس طرح اردو کی عمر ہندوستان کی نئی زبانوں میں کسی زبان سے کم نہیں ہے۔ ڈاکٹر احتشام حسین نے اس تمام تر تاریخ کو اس تصنیف کے دامن میں سموتے ہوئے اردو زبان کی تاریخ رقم کی ہے۔ اگر چہ اردو کے حوالے سے یہ لسانی بحث کچھ پرانی نہیں ہے، اس لیے ”اردو کی کہانی“ اس تناظر میں کوئی نیا نظریہ پیش کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ اس طرح ہندوستان میں لسانی مباحث کے حوالے سے یہ تصنیف گزشتہ تصانیف کا تتبع کرتی دکھائی دیتی ہے۔

تاریخ اردو (۱۹۶۲ء):

ڈاکٹر شجاعت سندیلوی کی تصنیف پہلی بار اپریل ۱۹۶۲ء میں ادارہ فروغِ اردو، لکھنؤ سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کے حصہ اول میں آغازِ اردو، ابتدائی اردو کے نمونے، شمالی ہند اور جنوبی ہند میں اردو کے مختلف نام کے عنوانات کے تحت اردو کی پیدائش، اس کی نشو و نما اور ترقی کے حوالے سے مباحث کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ حصہ دوم میں اردو نظم، شاعری کے اسکول، مشاہیر شعرائے اردو کے عنوانات کے تحت اردو شاعری کی تاریخ کو اپنے دامن میں سموتی نظر آتی ہے جبکہ حصہ سوم اردو نثر کی تاریخ، تعارف مشاہیرِ ادب، اردو کے چند اور ادارے کے عنوانات کے تحت اردو نثر کی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ سید انشا کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے شجاعت سندیلوی بیان کرتے ہیں:

> ”سید انشا نے نثر میں دو کتابیں ”دریائے لطافت“ اور ”رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی“ لکھیں۔ دریائے لطافت ۱۸۰۲ء میں لکھی تھی۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ انشا نے لکھا ہے۔ دوسرا حصہ مرزا قتیل نے لکھا ہے۔ پہلے حصے میں صرف و نحو کے علاوہ ہر طبقہ کی بول چال اور رسم و رواج کا بھی ذکر کیا ہے۔ الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کی تحقیق کی گئی ہے اور لفظوں کی صحت و فصاحت کے اصول لکھے ہیں۔ دوسرے حصے میں قتیل نے منطق و عروض لکھا ہے۔ رانی کیتکی کی کہانی ۱۸۰۳ء میں لکھی ہے۔ انشا نے اس میں ایک لفظ بھی عربی، فارسی کا آنے نہیں دیا۔“[۹۲]

اس طرح انشا کی اولیت دو حوالوں سے ثابت کرنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے کہ نہ صرف انہوں نے لسانی مباحث

کو ’’دریائے لطافت‘‘ میں بیان کیا ہے اور اردو کا مقامی زبانوں کے حوالے سے شرف بیان کیا ہے کہ خالص ہندوستانی زبان معرب ومفرس اردو سے کسی طرح کم نہیں ہے جس کا پرتو انہوں نے اپنی تصنیف ’’رانی کیتکی کی کہانی‘‘ میں دکھا دیا ہے۔ گویا انشا نے نہ صرف اردو زبان خاص طور پر صرفی ونحوی حوالے سے لسانی بحث کی ہے بلکہ اس کو عملی طور پر برت کر بھی دکھایا ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر شجاعت سندیلوی کے لسانی مباحث کا تعلق ہے، انہوں نے اس میدان میں قابلِ قدر جوہر دکھائے ہیں۔ اس ضمن میں نہ صرف انہوں نے اردو زبان کی پیدائش اور اردو کے ناموں کے حوالے سے بحث کی ہے بلکہ اردو میں لسانیات کی ضرورت واہمیت کے حوالے سے اردو لسانیات کا تذکرہ اور اس کے میدان مخصوص کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ چنانچہ اردو کے مختلف ناموں کے حوالوں سے ڈاکٹر شجاعت سندیلوی نے درج ذیل بحث کی ہے:

> ’’۱۔ اندوستان: قدیم انگریز مورخین نے ہندوستان کے حالات لکھنے کے سلسلہ میں اردو کو لفظ ’اندوستان‘ سے تعبیر کیا ہے۔
>
> ۲۔ مورز: بعض انگریز مورخوں نے اردو کو ’مورز‘ کے نام سے یاد کیا ہے۔
>
> ۳۔ لینگوا اندوستانی: اٹھارہویں صدی عیسوی کے ابتدائی لاطینی مصنفین نے اردو کو ’لینگوا اندوستانی‘ کا نام دیا ہے۔
>
> ۴۔ ہندوستانی: (الف) ۱۶۱۶ء میں مسٹر پول نے اردو کو ’ہندوستانی‘ لکھا ہے۔
>
> (ب) ۱۷۸۷ء میں جان گلکرائسٹ نے اردو کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔
>
> (ج) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی اردو کا نام ہندوستانی تحریر کیا گیا ہے۔
>
> (د) ڈنکن فاربس نے اپنی اردو قواعد کا نام ’ہندوستانی گرامر‘ رکھا۔ اس کتاب کے صفحہ ۴۸ پر حاشیہ میں تحریر ہے: ’’ہندوستانی یا اردو یا ریختہ‘‘۔
>
> ۵۔ ہندی: صوفیائے کرام اور علما نے اردو کا نام ’ہندی‘ لکھا ہے۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے قرآن پاک کا ترجمہ ’ہندی‘ کے نام سے کیا ہے۔

۶۔ ریختہ: غالب کے زمانے تک اردو کا نام ریختہ استعمال ہوا ہے۔ سعدی کاکوری جو ولیؔ سے پہلے کے شاعر ہیں، کہتے ہیں:

سعدیؔ کہ گفتار ریختہ در ریختہ
شیر و شکر ہم شعر ہے ہم گیت ہے

غالبؔ کہتے ہیں:

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

۷۔ اردوئے معلیٰ: شاہجہاں نے جب شاہ جہاں آباد، آباد کیا اور لال قلعہ، جامع مسجد، شہر پناہ وغیرہ عمارتیں تعمیر کرائیں تو بازار کا نام اردوئے معلیٰ رکھا۔

۸۔ اردو: انیسویں صدی ہی میں ریختہ اور اردوئے معلیٰ کے بجائے اردو کا لفظ عام طور پر استعمال ہونے لگا۔ مصحفیؔ نے اردو کا لفظ استعمال کیا ہے:

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میرؔ و مرزؔ کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفیؔ ''اردو'' ہماری ہے[۹۳]

درج بالا تمام تر بحث سے واضح ہوتا ہے کہ ''تاریخ اردو'' محض ادب کی تاریخ کو بیان کرتی ہے اور نہ ہی محض لسانی مباحث پر مشتمل ہے بلکہ اس میں تاریخی کتب کے روایتی طریقے کے مطابق اردو زبان اور ادب دونوں پر قلم فرسائی کی گئی ہے۔ تاہم لسانی مباحث کے حوالے سے یہ تصنیف اس لیے اہمیت اختیار کر جاتی ہے کیونکہ اس میں اردو میں لسانیات کی اہمیت وضرورت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ''اردو لسانیات'' کا طریق کار بھی بیان کیا ہے کہ اردو لسانیات کن کن مسائل کو زیر بحث لاتی ہے۔ اس ضمن میں وہ بیان کرتے ہیں:

> ''اردو ادب میں لسانیات کی اہمیت کو پچیس تیس سال سے محسوس کیا گیا ہے۔ 'لسانیات' سے زبان کی پیدائش اور نسل و خاندان کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اردو زبان کی پیدائش کب اور کس طرح اور کہاں ہوئی؟ وہ زبانوں کے کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے، اس کے اندر کس کس نسل کے الفاظ ہیں؟ اس قسم کی باتیں، لسانیات ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور،

مسعود حسین خاں، سید احتشام اور شوکت سبزواری لسانیات کے ماہر ہیں۔ ”[۹۴]

گویا شجاعت سندیلوی نے اپنے سے قبل ہونے والے لسانی کام کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے اس کی اہمیت وضرورت کو محسوس کیا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار جامع انداز میں کیا ہے۔

توضیحی لسانیات۔ ایک تعارف (مترجمہ: ۱۹۷۹ء):

”توضیحی لسانیات“ درحقیقت ایچ۔ اے گلیسن (جونیئر) کی تصنیف ہے جسے اردو زبان میں عتیق احمد صدیقی نے ۱۹۷۹ء میں ترجمہ کر کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع کروایا۔ اس تصنیف میں مصنف توضیحی لسانیات کی بابت یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ ”توضیحی لسانیات“ وہ علم ہے جس میں زبانوں کی اندرونی ساخت کے اعتبار سے ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے؛ یہ انسانی تکلم کے مختلف پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ اس طرح یہ علمِ صوتیات اور لسانیاتی ساخت کا عمومی نظریہ قائم کرتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص کسی خاص زبان کو سمجھنے کی کوشش کرے تو انہی خطوط پر کام کرے۔ اس کے نظریے میں عمومیت اور لچک ہونی چاہیے اور تمام توضیحات کا موازنہ کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ ۵۸۹ صفحات پر مشتمل اس تصنیف کے آخر میں لسانیات سے متعلقہ اصطلاحات درج کی گئی ہیں۔ اس ترجمے کی ضرورت غالباً یہ ہے کہ اردو میں لسانیات کے علم کے حوالے سے کوئی خاطر خواہ نہیں ہوسکا۔ اگر کچھ کام ہوا بھی ہے تو اس کا مطمع نظر اردو زبان کی پیدائش اور تاریخ سے متعلق زیادہ تھا اور زبان کی ساخت اور دیگر لسانی امور سے کم تھا۔ اسی لیے انگریزی زبان سے لسانیات کا علم حاصل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اردو زبان اور ادب (۱۹۸۳ء):

۲۰۸ صفحات پر مشتمل ڈاکٹر مسعود حسین خان کی تصنیف ”اردو زبان اور ادب“ کا ترمیم شدہ ایڈیشن ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ مذکورہ تصنیف مکمل طور پر لسانی مباحث کی ذیل کی شامل نہیں ہے، البتہ اس کے چند موضوعات اس حوالے سے اہمیت کے حامل ضرور ہیں۔ خاص طور پر اس تصنیف میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے شعری لسانیات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس حوالے سے تخلیقِ شعر، مطالعۂ شعر اور غزل کے فن کے ساتھ ساتھ جوش، مصحفی، اصغر گونڈوی اور عظمت اللہ خان کی شعری لسانیات کا جائزہ بھی لیا گیا

ہے۔ اردو حروفِ تہجی کی صوتیاتی ترتیب لسانی مباحث کے حوالے سے ایک اہم مضمون ہے۔ اسی قبیل کے دیگر مضامین میں اردو ایک ترقی پسند زبان، اردو ایک مردانہ زبان، اور اردو نئے ماحول میں شامل ہیں۔ مطالعہ شعر (صوتیاتی نقطۂ نظر) کے عنوان سے ایک مضمون میں ڈاکٹر مسعود حسین خان بیان کرتے ہیں:

> ’’لسانیاتی مطالعۂ شعر دراصل شعریات کا جدید ہیئتی نقطۂ نظر ہے لیکن یہ اس سے کہیں زیادہ جامع ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر شعری حقیقت کا کلی تصور پیش کرتا ہے۔ ہیئت و موضوع کی قدیم بحث اس نقطۂ نظر سے بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہ کلاسیکی نقد ادب کے اصولوں کی تجدید کرتا ہے اور قدما کے مشاہدات اور اصطلاحاتِ ادب کو سائنسی بنیاد عطا کرتا ہے۔ لسانیاتی مطالعۂ شعر صوتیات کی سطح سے ابھرتا ہے اور ارتقائی صوتیات، تشکیلیات، صرف و نحو اور معنیات کی پر پیچ وادیوں سے گزرتا ہوا ’’اسلوبیات‘‘ پر ختم ہوتا ہے۔ ’’اسلوبیات‘‘ کو ابھی تک ماہرینِ لسانیات علم اللسان کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔‘‘[۹۵]

اگرچہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کا اسلوبیات کی اہمیت کے حوالے سے بیان درست ہے، تاہم فی زمانہ جدید اسلوبیات کا مطالعہ لسانیات کے تحت ہی کیا جاتا ہے اور اسے جدید لسانیات کی اہم شاخ تسلیم کی جاتا ہے۔

جدید تنقید سماجی علوم کا بہت سہارا لے رہی ہے اور آج کے دور میں سماجی علوم کا بہت چرچا ہے صوتیات، لسانیات کی پہلی سطح ہے جس پر ناقد سوچتا ہے اور عمل کرتا ہے۔ اردو کا نظامِ صوت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک حصہ حروفِ علت پر مشتمل ہے جو تعداد میں دس (۱۰) ہیں جبکہ دوسرا حصہ حروفِ صحیح پر مشتمل ہے جو تعداد میں (۳۷) ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان اپنے مضمون ’’اردو حروفِ تہجی کی صوتیاتی ترتیب‘‘ میں لکھتے ہیں:

> ’’اردو نہ صرف صَرف و نحو بلکہ صوتی لحاظ سے بھی ایک مخلوط زبان ہے۔ اس میں خالص ہندوستانی آوازیں (ٹ، ڈ، ڑ، کھ، گھ وغیرہ) بھی پائی جاتی ہیں اور خالص عربی (ق) اور فارسی (ژ) بھی مسلمانوں کے داخلۂ ہند کے فوراً بعد سے یہ مسئلہ ماہرینِ زبان کے سامنے رہا ہے کہ عربی رسم الخط کو، جس کا ایرانی جامہ تیار ہو چکا تھا،

ہندوستانی زبانوں کے نمونوں کا کس طور پر بنایا جائے۔‘‘[۹۶]

’’اردو حروفِ تہجی کا صوتیاتی مطالعہ‘‘ ڈاکٹر مسعود حسین خان کا دلچسپ موضوع ہے۔ انہوں نے صوتیاتی تحقیق پر بہت کام کیا ہے۔ ان کی ایسی ہی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے ایک کتاب ’’نذرِ مسعود‘‘ مرتب کی جسے بیکن بکس، ملتان (پاکستان) نے شائع کیا۔ اس میں ڈاکٹر مسعود حسین خان کے اہم مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر مذکورہ کے بعض موضوعات لسانی مباحث کے حوالے سے ڈاکٹر مسعود حسین خان کی قابلیت بین ثبوت پیش کرتے ہیں۔

اردو صرف و نحو (۱۹۸۵ء):

ڈاکٹر اقتدار حسین نے جنوری ۱۹۸۵ء میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کے پلیٹ فارم سے ’’اردو صرف و نحو‘‘ کے عنوان سے کتاب شائع کی جس کے دیباچے میں وہ صرف و نحو کو لسانیات کی اہم شاخیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’لسانیات میں زبان کا سائنسی طور سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ صرف و نحو لسانیات کی دو اہم شاخیں ہیں۔ اس میں ہم زبان کا ’’لفظ‘‘ کی سطح (صرف) سے مکمل جملے (نحو) تک مطالعہ کرتے ہیں۔ صرف کے لیے لسانیات میں نئی اصطلاح تشکیلیات بھی استعمال ہونے لگی ہے۔ اگرچہ صرف و نحو قدیم اصطلاحیں ہیں لیکن جدید لسانیات میں بھی ان کو نئی معنی دے کر جدید لسانیاتی تصورات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔‘‘[۹۷]

اس اقتباس میں ’’تشکیلیات‘‘ کا لفظ غور طلب ہے کیونکہ ۷۰ء کی دہائی میں پاکستان میں اس حوالے سے افتخار جالب اور ڈاکٹر سعادت سعید وغیرہ نے مل کر ’’لسانی تشکیلات‘‘ کی تحریک کا آغاز کیا تھا (’’لسانی تشکیلات‘‘ کی بحث اگلے باب میں پیش کی جائے گی)۔ اس کتاب کا مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ اردو میں لسانیات کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں صرف و نحو کو کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کے لیے بہت مفید ہے جس میں تلفظ کے حوالے سے بین الاقوامی صوتی علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے تاکہ لسانیات کا طالب علم علامتوں کو سمجھ سکے۔ اس ضمن میں مارفیم کی اقسام، مارفیم کی شناخت، تعریف اور اشتقاق، نحو، نحوی طریقے، قواعد، تبادلی قواعد جیسے مضامین پر بحث کی گئی ہے۔ مارفولوجی کی تعریف ڈاکٹر اقتدار حسین ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''مارفولوجی لسانیات کی وہ شاخ ہے جس میں ہم کسی زبان کے چھوٹے سے چھوٹے بامعنی لسانی روپ کا مطالعہ کرتے ہیں۔''۹۸

۱۳۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں لسانی مسائل کے حوالے سے خاطر خواہ مباحث پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خان نے ''اردو صرف ونحو'' میں زبان کے مطالعہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی ''فونیمیات (صوتیہ یات) جس میں زبان کی آوازوں کا انفرادی طور سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور قواعد جن میں زبان میں استعمال ہونے والی آواز یا آوازوں کے جوڑ کا مطالعہ کرتے ہیں جو بامعنی ہوں۔ اسی طرح ڈاکٹر اقتدار حسین بامعنی آوازوں کے مطالعہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں:

> ''۱) بامعنی آوازیں لفظ کی سطح تک محدود رکھنا۔
> لسانیات کی اس شاخ کو ہم مارفولوجی کہتے ہیں۔
> ۲) بامعنی آوازیں دو لفظ یا اس سے زیادہ (جملے تک) کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
> لسانیات کی اس شاخ کو نحو (Syntax) کہتے ہیں۔''۹۹

اسی طرح مارفیم کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر اقتدار حسین بیان کرتے ہیں:

> ''مارفیم (تشکیلیہ):
>
> لسانیات میں مارفیم ایک بنیادی اکائی ہے۔ زبان کا وہ چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا جو بامعنی ہو۔ اس کے دو حصے ہیں: (۱) چھوٹی سی چھوٹی اکائی۔ (۲) بامعنی ہونا۔
>
> آزاد مارفیم: وہ مارفیم جن کو ادا کرنے یا بولنے کے لیے کسی دوسرے مارفیم کا سہارا لینا ضروری نہیں ہے۔
>
> پابند مارفیم: وہ مارفیم جو بغیر کسی سہارے کے استعمال نہیں ہوتے وہ پابند مارفیم کہلاتے ہیں۔''۱۰۰

اس ضمن میں معنی کی اقسام بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر اقتدار حسین رقم طراز ہیں:

> ''لسانیات میں لغوی معنی نہیں لیے جاتے۔ ایک لسانی ٹکڑا کئی طرح سے جانچا جاسکتا ہے۔ آزاد مارفیم کے معنی تو لغوی معنی ہوتے ہیں۔ پابند مارفیم کے معنی لغت میں

> نہیں ہوتے۔ مارفیم کے معنی کی کئی اقسام میں یعنی قواعدی معنی، مارفیمی معنی، نحوی معنی، اسلوبیاتی معنی وغیرہ۔“[۱۰۱]

مزید وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر اقتدار حسین خاں بیان کرتے ہیں:

> ”مارفیم کسی زبان میں چھوٹے سے چھوٹی اور بامعنی اکائی ہے۔ دوسری طرف صوت رکن کسی لفظ میں آواز یا آوازوں کا وہ مجموعہ ہے جو ایک سانس میں ادا کیا جاتا ہے۔ ان آوازوں کو 'یک نفسی مجموعہ' یا 'صوت رکن' کہتے ہیں۔ صوت رکن میں کم از کم ایک مصوتہ ضرور ہوتا ہے۔“[۱۰۲]

درج بالا تمام تر بحث سے ایک بات واضح ہوتی ہے ہندوستان میں اس سے قبل جس قدر بھی اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے کام ہوا ہے، اس میں زبان کا حوالہ تو ضرور ہے لیکن لسانیات کے حوالے سے اور بالخصوص لسانی ساخت کے حوالے سے کچھ قابلِ قدر کام نہیں ہوا۔ ڈاکٹر اقتدار حسین خان نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان تمام امور کو نہ صرف بخوبی بیان کیا ہے بلکہ ”تشکیلیات“ کے حوالے سے بحث اسے اردو میں جدید لسانی مباحث کی حامل بھی ٹھہراتی ہے۔

لسانیات کے بنیادی اصول (۱۹۸۵ء):

اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے ڈاکٹر اقتدار کا ایک اور قابلِ قدر کارنامہ ہے جو کہ جولائی ۱۹۸۵ء میں ہی ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ کی طرف سے منظرِ عام پر آیا، ”لسانیات کے بنیادی اصول“ ہے۔ اس تصنیف کا تعارف مسعود حسین خان نے تحریر کیا ہے۔ آٹھ (۸) ابواب پر مشتمل یہ تصنیف ”اردو صرف و نحو“ کی طرح خالصتاً لسانی مباحث پر مشتمل ہے جس میں لسانیات کیا ہے، صوتیات، فونیمیات، صرف، مارفو فونیمیات، نحو، تبادلی قواعد اور تاریخی لسانیات کے ابواب قائم ہیں۔ مجموعی طور پر اس تصنیف میں ڈاکٹر موصوف نے لسانیات کی تمام سطحات یعنی صوتیات، تجز صوتیات اور صرف و نحو کا خوش اسلوبی سے جائزہ لیا ہے جبکہ آخر میں لسانیات کے جدید نظریے اور قواعدِ اردو کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ علاوہ ازیں اصطلاحاتِ لسانیات کی فہرست بھی پیش کی ہے۔ بغور مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ 'لسانیات کے بنیادی اصول' درحقیقت 'اردو صرف و نحو“ کا دوسرا حصہ ہے۔

''لسانیات کے بنیادی اصول'' کے پہلے باب ''لسانیات کیا ہے'' میں زبان اور سائنس کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اقتدار حسین خاں بیان کرتے ہیں:

> ''زبان روایتی خود اختیاری صوتی علامتوں کا نظام ہے جو انسان اظہار کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لسانیات میں زبان خاص معنی میں استعمال ہوتی ہے یعنی زبان آوازوں یا اصوات کے مجموعے کی ترتیب ہے۔ لسانیات میں انسان کے منہ سے نکلی آوازیں اہم ہیں۔ اس میں اشاروں کی زبان یا تحریر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ انسان کے منہ سے ادا ہونے والے تمام کلمے وہ ایک لفظ ہو یا پورا جملہ اہمیت کا حامل ہے۔ تحریر کی نسبت تقریر کو ہی ہر شعبہ میں اہمیت دی جاتی ہے۔ لسانیات ایک خالص سائنس ہے اور اس کی تحقیق بھی سائنسی طریقے سے کی جاتی ہے۔''۱۰۳

بعد ازاں ڈاکٹر اقتدار حسین نے لسانیات کی مختلف شاخوں کا ذکر انتہائی سادہ اور آسان طریق پر کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے لسانیات کا دوسرے علوم کے ساتھ ربط بھی ظاہر کیا ہے اور اسے سماجی علوم کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ چند ایک اقتباسات اس بیان کی دلیل کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ صوتیات کی مختلف شاخوں کو ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اقتدار حسین بیان کرتے ہیں:

> ''صوتیات: لسانیات کی وہ شاخ ہے جس میں کسی زبان کی آوازوں کے مخارج کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کی تین ذیلی شاخیں ہیں:
>
> (الف) سمعیاتی صوتیات: کسی بھی انسان کے منہ سے جو آواز نکلتی ہے اور ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں، اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔
>
> (ب) سماعی صوتیات: کان کے پردے پر آوازیں ٹکراتی ہیں اور تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے، اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔
>
> (ج) تلفظی صوتیات: انسان کے منہ سے جب آواز خارج ہوتی ہے تو اعضا کی حرکت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔''۱۰۴

اسی طرح انہوں نے لسانیات کے حوالے سے کسی بھی زبان کے اہم اجزا یعنی مصوتے اور مصمتے پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اپنی تصنیف میں ڈاکٹر اقتدار حسین نے نوام چومسکی کا خاص حوالہ دیا ہے جو اس بات کا غماز ہے کہ

ان کی نظر مغرب میں ہونے والے لسانی مباحث پر کافی گہری تھی۔ چنانچہ ''تبادلی قواعد'' کا ذکر کرتے ہوئے وہ نوام چومسکی کے کام کا گہرا مطالعہ پیش کرتے ہیں:

> ''تبادلی قواعد: لسانیات میں قواعد کی بڑی اہمیت ہے۔ سب سے پہلے نوام چومسکی نے اپنی کتاب (Syntictic Structure) میں اس کی وضاحت کی ہے۔ اس نے ۱۹۵۷ء میں تبادلی قواعد کا خاکہ پیش کیا تھا۔ وہ زبان کے جملے کو دو خاص گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ (۱) مغز جملے (۲) غیر مغز جملے۔ مغز جملے زبان میں محدود تعداد میں ہوتے ہیں اور غیر مغز جملے ان مغز جملوں میں ہی چند تبدیلیاں کر کے بنائے جاتے ہیں۔ مغز جملے سادہ ہوتے باقی تمام جملے ان ہی کی مدد سے بنائے جاتے ہیں۔۔۔۔
>
> ۱۹۶۵ء میں چامسکی نے اپنی کتاب (Aspects of the Theory of Syntax) میں ۱۹۵۷ء کے نمونہ میں کچھ تبدیلیاں کیں اور اس میں معنیات کا حصہ شامل کیا گیا۔''۵۰؎

تاریخی لسانیات کے عنوان سے قائم کردہ باب ''لسانیات کے بنیادی اصول'' کا آخری باب ہے جس میں ڈاکٹر اقتدار حسین خاں نے زبان میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور زبانوں کے آپس میں رشتے، شجرے اور نسل کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے اور اس کے بعد انہوں نے تدریسِ زبان کے اصولوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مجموعی طور اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے ڈاکٹر اقتدار حسین کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں اور ان کی اہمیت اس حوالے سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اردو میں اس موضوع پر بہت کم کتب دستیاب ہیں۔

اردو کی لسانی تشکیل (۱۹۸۵ء):

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کا شمار ہندوستان میں عصرِ حاضر کے محقق اور ماہرِ لسانیات میں ہوتا ہے۔ ''اردو کی لسانی تشکیل'' ان کی اہم تصنیف ہے جو ۱۹۸۵ء میں پہلی دفعہ اشاعت سے ہم کنار ہوئی۔ مرزا خلیل بیگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات سے وابستہ اور ڈاکٹر مسعود حسین خان کے شاگرد ہیں۔ ان کی لسانی مباحث کے میدان میں خدمات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''لسانی

رشتے'' کا انتساب ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے نام کرتے ہوئے انھیں ماہرِ زبان شناس قرار دیا ہے۔

''اردو کی لسانی تشکیل'' جن لسانی مباحث پر مشتمل ہے، ان میں ہند آریائی اور اردو کے تحت اردو زبان کا تعلق قدیم ہند آریائی زبانوں سے جوڑتے ہوئے ہندوستان کی قدیم زبانوں سے اردو تک کے سفر کو بیان کیا ہے اور ان زبانوں کی تشکیل، ارتقا اور اثرات پر بحث کی ہے۔ اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے نظریۂ آغازِ زبانِ اردو کے تحت اردو زبان کے آغاز پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اردو چونکہ محض ایک جگہ پیدا ہوئی، نہ پلی بڑھی اور نہ ہی اس کی نشو و نما ایک جگہ پر ہوئی، بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کرتے ہوئے اس پر مختلف اثرات مرتب ہوئے اور اس نے بھی اپنے اثرات دیگر زبانوں پر مرتب کیے۔ اس حوالے سے شمالی ہند اور جنوبی ہند میں اردو کے خاص مراکز قائم ہوئے جن سے متعلق مرزا خلیل بیگ نے تفصیلی بحث پیش کرتے ہوئے دکنی اردو کے لسانی امتیازات کو بیان کیا ہے۔ مذکورہ تصنیف کے دیگر موضوعات میں اردو کا بولیوں کے ساتھ رشتہ، اردو اور ہریانوی کا لسانیاتی رشتہ، اردو اور برج بھاشا کا لسانی رشتہ، اردو لفظیات، عربی و فارسی زبانیں کے علاوہ اردو رسمِ خط پر بھی تفصیلی بحث ملتی ہے۔

مرزا خلیل احمد بیگ نے مذکورہ تصنیف میں محض اردو یا برصغیر کی زبانوں کے حوالے سے بحث نہیں کی بلکہ دنیا کی دیگر زبانوں کا بھی اختصار سے تذکرہ کیا ہے۔ تاہم یہ تذکرہ اس سے قبل بھی ماہرینِ لسانیات زبانوں کے خاندان کے حوالے سے دنیا بھر کی زبانوں کی تقسیم کرتے رہے ہیں۔ دنیا کے لسانی خاندان کے بارے میں مرزا خلیل احمد بیگ فرماتے ہیں:

> ''لسانیاتی ادب میں لسانی خاندان کے لیے ''خاندان السنہ'' کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی رہی ہے۔ ایک ممتاز امریکی ماہرِ لسانیات وِنفرڈ لیہمن (Winfred P. Leh'mann) نے دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی نسلی بنیادوں پر (یعنی ان کی پیدائش کے اعتبار سے) درجہ بندی کی ہے اور انھیں سات لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں:
>
> ۱۔ ہند یورپی (Indo-European)
> ۲۔ افریقی ایشیائی (Afro-Asian)

۳۔ چینی تبتی (Sino-Tibetan)

۴۔ الطائی (Altaic)

۵۔ دراویدی (Dravidian)

۶۔ آسٹرو ایشیائی (Austro-Asiatic)

۷۔ فنو اُگرک (Finno-Ugric)“ ۱۰۶؎

درج بالا بیان کردہ تمام زبانوں کا رشتہ ایک ہے اور ان کی صوتیات بھی ایک جیسی ہیں اس حوالے سے دیکھا جائے تو یورپ اور ایشیا کی بعض زبانیں صوتی حوالے سے ایک دوسرے سے ملتی جلتی محسوس ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیل احمد بیگ کے مطابق یورپ کی قدیم زبان یونانی (Greek)، ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت اور ایران کی قدیم فارسی میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ہند یورپی خاندان میں بھی گیارہ زبانیں پائی جاتی ہیں جن کے درمیان کافی ربط دکھائی دیتا ہے۔ ہند آریائی، ہند یورپی خاندان کی بہت اہم شاخ ہے جو آریہ لوگوں کی زبان ہے اور اردو کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔ اردو کی پیدائش کے لسانیاتی عمل کے بارے میں مرزا خلیل بیگ اپنے استاد ڈاکٹر مسعود حسین خان کے نظریہ پر روشنی ڈالتے فرماتے ہیں:

> ”اردو زبان کی تاریخ وسیع تر معنوں میں ہند آریائی کی تاریخ ہے، جسے قدیم ہند آریائی، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کا زمانہ ۱۵۰۰ ق م سے لے کر ۱۰۰۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ جب ہندوستان کی جدید ہند آریائی زبانیں لسانی ارتقا کے عمل میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔“ ۱۰۷؎

مجموعی طور پر ”اردو کی لسانی تشکیل“ میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے اردو زبان کے آغاز اور تشکیل و ارتقا کے حوالے سے اہم لسانی مباحث پیش کیے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس ضمن میں پیش کردہ اہم نظریات کا موازنہ کر کے دیگر محققینِ لسانیات کی تحقیقی کاوشوں کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ۲۵۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ہندوستان میں ہونے والے اردو کے لسانی مباحث کے حوالے سے اہم اضافہ ہے۔

ہندآریائی اور اردو(۱۹۸۶ء):

سید حمید الدین قادری شرفی کی تصنیف کردہ ''ہندآریائی اور اردو'' ۱۹۸۶ء میں الیاس ٹریڈرس، حیدر آباد (آندھرا پردیش) سے شائع ہوئی۔ اس تصنیف کی ابتدا میں سید حمید الدین نے لسانیات کی تعریف اور اس کے شعبوں کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ زبان کی ابتدا کے بارے میں پیش کیے گئے قدیم نظریات پر نظر ڈالی ہے۔ بعد ازاں صوت، لفظ، لفظ کی تشکیل، وضعِ اصطلاحات، تحریر کا ارتقا، رسمِ خط، زبانوں کی تقسیم اور ان کے خاندان جیسے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے ان پر جامع بحث کی ہے۔ اسی طرح آگے بڑھتے ہوئے اردو زبان کی طرف نظر اٹھائی ہے اور اردو کی ابتدا کے بارے میں نظریات پیش کیے ہیں۔ اس ضمن میں ہندآریائی خاندان کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ اردو زبان کی مختصر اور جامع تاریخ بیان کرتے ہوئے دکن اور گجرات میں اردو، ہندوستانی (قدیم اردو)، لسانیاتی اصطلاحات جیسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

لفظ جو اظہارِ بیان کی بنیادی اکائی کے طور پر کام کرتا ہے، اس کی پیدائش اور اہمیت کے بارے میں مختلف ماہرینِ لسانیات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سید حمید الدین بھی لفظ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ملفوظ آوازوں کا نام زبان ہے۔ آواز خاص معنوی علامت کے طور پر لفظ میں ڈھلتی ہے۔ اس طرح کی کئی آوازیں ایک زبان کی صورت میں منضبط ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں ہر آواز اپنا ایک مفہوم، ایک شناخت اور ایک علامت رکھتی ہے۔ آواز میں تغیر و تبدل کی راہیں بھی طے کرتی ہے۔ ان کے معنی کبھی کبھی جگہ چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ تاہم کسی بھی زبان کا سارا دارومدار ملفوظ آوازوں پر ہی ہوتا ہے۔ گویا الفاظ بامعنی آوازیں ہیں۔''[۱۰۸]

جیسا کہ ہم پڑھتے آئے ہیں کہ زبان مختلف صوتی علامتوں کا مجموعہ ہوتی ہے جن میں مفرد آوازوں کی ترکیب ہوتی ہے۔ یہ وہ آوازیں ہوتی ہیں جو انسان اپنے منہ سے نکالتا ہے۔ یہی ہزاروں آوازیں مل کر لفظ بنتی ہیں۔ سید حمید الدین کے مطابق اسی طرح تمام حروفِ تہجی کے ملاپ سے الفاظ اور الفاظ کے ملاپ سے جملے اور جملوں کے

ملاپ سے زبان ظہور میں آتی ہے۔ یہ آواز ہی ہے جو اصل میں حرف کی صورت پاتی ہے اور انہیں حروف کی ترکیب سے لفظ متشکل ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ لفظ حقیقت میں کئی آوازوں کے مجموعے کا نام ہے۔

زبان کی تقسیم کی بات کی جائے تو ماہرینِ لسانیات نے عموماً ان کی تقسیم خاندانوں کی بنیاد پر اور خصوصیات کی بنا پر کی ہے۔ تاہم سید حمید الدین نے اس سے آگے بڑھتے ہوئے انہیں قواعدی اور خاندانی زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ بعد ازاں قواعدی تقسیم کو مزید ذیلی حصوں میں تقسیم کرتے ہیں جن میں

۱۔ یک لفظی (Monosyllabic)
۲۔ ترکیبی (Organic)
۳۔ اشتقاقی (Darivative)
۴۔ تحلیلی (Analatic)

شامل ہیں۔ ''ہند آریائی اور اردو'' میں سید حمید الدین نے ان چار طریقوں سے زبان کی بناوٹ کا اصول بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق زبانیں ہمیشہ سے ہی ارتقا کی منزل میں رہتی ہیں۔ ان میں کاٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے اور وہ مسلسل ارتقائی منازل طے کرتی رہتی ہیں۔ بعد ازاں مصنف نے زبانوں کے خاندان کے بارے میں بڑی تفصیل سے مباحث جمع کیے ہیں اور اس ضمن میں مختلف ماہرین لسانیات کے نظریات کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

مجموعی طور پر ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ''ہند آریائی اور اردو'' اردو زبان و لسانیات کے طالب علم کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ باوصف یہ کہ مذکورہ تصنیف چند پچھلی کتابوں کا تسلسل ہے پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ''ہند آریائی اور اردو'' کے تفصیلی مطالعے سے باور ہوتا ہے کہ سید حمید الدین کی مذکورہ تصنیف میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر اقتدار حسین خان اور ڈاکٹر نصیر احمد خان کی اسی موضوع پر لکھی گئی کتب کا تسلسل ہے۔ خاص طور پر اس میں محی الدین قادری زور کی تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' سے کافی حوالے دیے گئے ہیں۔

عام لسانیات (۱۹۸۵ء):

ڈاکٹر گیان چند جین کا شمار نامور محققین، مورخین، ناقدین اور کسی حد تک ماہرینِ لسانیات میں ہوتا ہے۔ جہاں تک لسانی حوالے کا تعلق ہے تو اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے ''عام لسانیات'' کے نام سے ان کی تصنیف قومی کونسل برائے فروغ زبانِ اردو، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آیا۔ اس تصنیف کا مختصر پیش لفظ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا تحریر کردہ ہے جس میں انہوں نے انسان اور حیوان میں بنیادی فرق زبان اور شعور کا قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے انہوں علم کو دو بنیادی شاخوں یعنی باطنی علوم اور ظاہری علوم میں تقسیم کرتے ہوئے پیغمبروں، صوفیوں، سنتوں اور شاعروں کی خدمات کو سراہا ہے۔ بعد ازاں لفظ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> ''علوم داخلی ہوں یا خارجی بنیادی کردار بولے جانے والے لفظ نے ادا کیا ہے۔ یہی بولا ہوا لفظ ایک نسل سے دوسری نسل تک علم منتقل کرنے کا ذریعہ رہا ہے۔''[۱۰۹]

گیان چند جین کی یہ کاوش چوبیس ابواب پر مشتمل ہے جن میں لسانیات کی تعریف اور حدود وامکان کو بیان کرنے کے ساتھ لسانیات کے مطالعے کے فوائد بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اسی طرح زبان کی ماہیت اور اس کے مختلف روپ بیان کرتے ہوئے اس کے مختلف اجزا یعنی صوتیات، فونیمیات، مارفیمیات (صرف)، نحو، معنیات کا تفصیلی مطالعہ باب در باب کیا ہے۔ ان اجزا سے متعلق بعد ازاں لسانی تبدیلی، لسانی مماثلت، مارفیمی تبدیلی، نحوی تبدیلی، معنوی تبدیلی اور ذخیرہ الفاظ کی تبدیلی کے ابواب قائم کرتے ہوئے ان تمام تر لسانی تبدیلیوں اور ان میں شامل مباحث کو بیان کیا ہے۔

''عام لسانیات'' میں ہمیں بہت سی انگریزی تصانیف کے حوالے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ''لسانیات'' کی طرف اردو میں بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ خاص طور پر لسانی مباحث کے حوالے سے اردو کا دامن ہنوز تشنہ دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے مذکورہ تصنیف میں ایچ۔ اے گلیسن جونیر کی تصنیف ''توضیحی لسانیات'' (Descriptive Linguistis) (جس کا ترجمہ ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی نے کیا تھا) اور آر۔ ایچ رابنس کی کتاب "General Linguistics: An Introductory Survey"

(مطبوعہ ۱۹۶۱ء) سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس حوالے سے خاص طور اہمیت اس بات کی ہے کہ ساسئیر کی تصنیف "A Course in General Linguistics" (اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی، یہ اس کا انگریزی متن ہے) کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ اسی طرح ''عام لسانیات'' کا ایک اہم موضوع 'ریاضیاتی لسانیات' ہے جس میں ڈاکٹر گیان چند جین بیان کرتے ہیں:

> ''یہ دراصل لسانیات کا کوئی علیحدہ شعبہ نہیں بلکہ لسانیات میں ریاضی کے قاعدوں اور طریقوں کے اطلاق کو کہہ سکتے ہیں۔ ریاضی کی صحت اور قطعیت دیکھ کر بہتوں نے زبان کا بھی اسی انداز سے تجزیہ کرنا چاہا۔ ریاضی سے متاثر ہونے والا پہلا بڑا ماہر لسانیات زیلگ ہیرس (Zellig M. Harris) ہے۔ یہ پہلے آئن سٹائن کا پی اے تھا۔ اس نے اپنی کتاب (Structural Linguistics) میں جملوں کو ایک (Set) گروہ کے لیے کوئی قواعدی اصول دریافت کیا۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کے لیے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ مختلف سیٹوں کے بیچ ایک مشترک اصول دریافت کیا جا سکتا ہے جو اس پوری زبان کی ساخت کے بارے میں صحیح ہوگا۔ چامسکی نے ہیرس سے متاثر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ نوام چامسکی کا طریقہ بھی ریاضی سے تحریک لیتا ہے۔''[۱۱۰]

صرف یہی نہیں، لسانی مطالعے کے اور بھی بہت سے شعبے ہیں جن پر گیان چند نے قلم اٹھایا ہے۔ مذکورہ تصنیف ۹۱۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں لسانیات، اس کی شاخوں اور شعبوں کے حوالے سے کافی اہمیت کا حامل مواد مل جاتا ہے۔ چنانچہ لسانیات کی مبادیات سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ لازمی ہے۔ علاوہ ازیں ''عام لسانیات'' میں اطلاقی لسانیات کی دو اہم شاخیں، زبان سکھانے کے طریقے اور اسلوبیات جیسے مضامین بھی اپنی جگہ پر اہمیت کے حامل ہیں جن پر گیان چند نے مفصل بحث کی ہے۔

بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ (۱۹۸۸ء):

نصرت پبلشرز، لکھنؤ سے شائع ہونے والی شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی تصنیف ''بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ'' ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آئی جس میں بھٹاچاریہ نے بنگال کی زبانوں کا اردو سے رشتہ جوڑا ہے۔ اس کتاب کا پہلا باب ''لسانیات اور اردو زبان'' ہے جو اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے چند پہلوؤں کا احاطہ

کرتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مذکورہ تصنیف میں تین بنیادی موضوعات ہیں یعنی لسانیات، اردو زبان اور لسانیات اور بنگالی زبانوں کا اردو زبان سے تعلق۔ لسانیات کی تعریف کرتے ہوئے مصنف بیان کرتے ہیں:

> ''لسانیات آوازوں کے مطالعہ کا نام ہے۔ آوازیں جو لفظ کی بنیاد ہیں۔ لفظ کبھی کبھی
> ایک واحد آواز اور اکثر و بیشتر ایک سے زیادہ آوازوں کے ملنے پر بنتے ہیں۔۔۔
> آوازوں کی بنیاد پر لفظ بنا تو زبان کی پہلی اینٹ تیار ہو گئی یعنی لفظ وہ واحد یا کئی
> آوازوں کا مرکب ہے جسے فکرِ انسانی نے کوئی معنی عطا کیا ہے۔''[۱۱۱]

زبان کی تعریف کرتے ہوئے بھٹا چاریہ پروفیسر ڈاکٹر سکمار سین نے کا بیان قلمبند کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے بنگلہ کے ایک جملے میں صرف نو الفاظ استعمال کیے ہیں جن کا مختصر اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

> ''زبان کئی لوگوں کے سمجھ میں آجانے والی انسانی آوازوں کا نام ہے۔''[۱۱۲]

بنگالی زبانوں پر اردو کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بھٹا چاریہ بیان کرتے ہیں کہ آوازوں کا مطالعہ (صوتی علامات) صوتیات کے تحت دیکھا جاتا ہے۔ کسی خاص آواز کو نکالنے کے لیے انسانی اعضا کی مدد لی جاتی ہے۔ مثلاً زبان، منہ، ناک اور پھیپھڑوں کا عمل۔ الفاظ کسی بھی زبان کی بنیاد ہیں جو زمان و مکان کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ درحقیقت اس کتاب میں بولی اور زبان کے فرق کو ظاہر کرنے کے لیے باقاعدہ بحث کی گئی ہے جو ۱۸۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس کے مطابق ہر بڑی زبان ارتقا کی منزلوں میں وہاں کی علاقائی بولیوں سے بھی اثر لیتی ہے اور پھر ایک نئی زبان وجود میں آتی ہے۔ اس حوالے سے مذکورہ تصنیف کا باب ''اردو پر بولیوں کا اثر'' اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے بنگلہ زبان کا دیگر زبانوں سے تعلق پیش کیا گیا ہے جو کچھ یوں ہے:

سنسکرت	پراکرت	بنگلہ	اردو/ہندی
بدھُو	بہُو	بَوُ	بہُو
دوہی	دہی	دَئی	دہی
پراستر	پہوتھر	پاتھر	پتھر
اشٹھ	آٹھ	آٹ	آٹھ/آٹ

> ہر زبان کو ایک بنیادی بولی کی ترقی یافتہ شکل تسلیم کیا جاتا ہے جس پر اردو گرد کے علاقوں کے اثرات ہوتے ہیں یعنی زبان کی بنیادی اینٹ یا کوئی نہ کوئی اصل جڑ ہوتی ہے۔''[۱۳]

مجموعی طور پر مذکورہ تصنیف میں بھٹاچاریہ نے بنگال کا اردو زبان کے ساتھ ربط پیش کیا ہے اور اس ضمن میں اردو اور بنگلہ کے لسانی رشتہ کو تفصیلی انداز میں پیش کر کے اہم مباحث کا اضافہ کیا ہے۔

اردو لسانیات (۱۹۹۰ء):

جواہر لال یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی خدمات انجام دینے کے دوران ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے ''اردو لسانیات'' کے عنوان سے ایک کتاب پیش کی جسے اردو محل پبلی کیشنز، نئی دہلی نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔ مذکورہ تصنیف میں ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے اردو فونیمیات، اردو فونیم تقسیمات، اردو میں مرکب الفاظ کی ساخت، کرخنداری اردو کی صوتی ساخت، صوتی اصطلاحات، اردو آوازیں، حروف اور ان کی ذیلی شکلیں، اردو مصوتوں کا صوتی نظام اور رسمِ خط وغیرہ جیسے موضوعات پر سیر حاصل مباحث پیش کیے ہیں جبکہ علم لسانیات کے بارے میں ان کا نظریہ کچھ یوں ہے:

> ''کسی علم کو سائنس کہنے کے لیے تین چیزیں بنیادی طور پر دیکھی جاتی ہیں یعنی صراحت، معروضیت اور تنظیم یا با قاعدگی۔ ان کے بغیر سائنس کا تصور نہیں ابھرتا۔ زبان کا سائنٹی فک مطالعہ انہیں تین بنیادی چیزوں سے عبارت ہے۔ اس لیے ہم لسانیت کو ایک سائنس کہہ سکتے ہیں۔ زبان کے مطالعے میں صراحت Explicitness کی ضرورت کو مختلف بنیادوں کے تعلق سے دیکھا جا سکتا ہے۔''[۱۴]

ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے لسانیات کے شعبے میں ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کی اسناد حاصل کی تھیں، اس حوالے سے ان کا لسانیاتی مطالعہ یقیناً وسعت کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لسانیات کے مسائل کا ادراک کرتے ہوئے انہوں نے مذکورہ تصنیف بڑے سلیس انداز میں تحریر کی ہے جو اردو زبان اور لسانیات کے طالب علموں کے مفید اور ناگزیر نظر آتی ہے۔

''معنیات'' لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے۔ کسی بھی لفظ کے معنی میں تغیر ضرور پایا جاتا ہے۔ علاوہ

ازیں اس میں جغرافیائی، ثقافتی اور عمرانی نقطۂ نظر اور علاقائی رسوم و رواج کا اثر بھی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نصیر احمد خاں بیان کرتے ہیں:

> ''زبان میں اَن گنت الفاظ ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ ساخت کے علاوہ ایک دوسرے کے مقابلے میں معنی کے اعتبار سے پہچانے جاتے ہیں۔ زبانوں میں عموماً ایک معنی کے لیے کئی الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں جہاں محض ایک لفظ کے ذریعے ایک سے زیادہ معنی پیش کیے جاتے ہیں۔''[115]

چنانچہ معنیات کو پرکھنے کے لیے ''لغتیات'' کا علم استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی زبان کے الفاظ پر بحث کرنے کے لیے لغات کا علم بھی لازمی ہے۔

'کرخنداری اردو کی صوتی ساخت' کے عنوان سے ڈاکٹر نصیر احمد خاں کا مقالہ ''اردو لسانیات'' کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس کی اہمیت اس حوالے سے ہے کہ اس موضوع پر شاید ہی کسی لسانی کتاب میں بحث کی گئی ہو، چنانچہ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''کرخنداری اردو کی چند اہم بولیوں میں سے ایک سماجی بولی ہے جو ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں جامع مسجد کے اطراف کے علاوہ پرانی فصیل کے اندر کے ان محلّوں میں بولی جاتی ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔۔۔۔ اردو بولنے والے دو گروپ اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں۔ کرخنداری اردو بولنے والوں کے ایک مخصوص طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے اردو کی سماجی بولی کہلاتی ہے۔''[116]

حقیقت یہ ہے کرخنداری اردو ایک Dialect یعنی سماج کی بولی ہے۔ جیسے ہی جیسے پیشہ وروں کی زبان Register کہلاتی ہے، اسی طرح مقامی بولی Dialect کہلاتی ہے۔

اردو رسمِ خط، اردو مصوتے اور مصمتے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے لسانیات کی دیگر شاخوں پر بھی سیر حاصل بحث مذکورہ تصنیف میں کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان شاخوں کا دیگر علوم سے ربط بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو رسمِ خط کے حوالے سے ڈاکٹر نصیر احمد کا نقطۂ نظر یہ ہے:

> ''اردو زبان کا صوتی نظام ہند آریائی (مغربی ہندی) دراوڑی، ہند ایرانی (فارسی)

> اور سامی (عربی) جیسے دنیا کے چار بڑے خاندانوں کی زبانوں سے عبارت ہے۔ ان آوازوں کو جس رسمِ خط سے ظاہر کیا جاتا ہے، وہ دراصل عربی و فارسی رسمِ خط ہے جسے چند تبدیلیوں اور اضافوں کے بعد ہم نے اردو زبان کے مطابق بنایا ہے۔ اس رسمِ خط کے اردو میں لکھنے کے تین طریقے رائج ہیں جنہیں نسخ، نستعلیق اور شکستہ جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔“[۱۱۷]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسمِ خط کے حوالے سے یہ مباحث ہمیں دیگر اور قدیمی ماہرینِ لسانیات کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے ان قدیم اور مقامی ماہرینِ لسانیات کے نظریات اور تصانیف سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی کتب کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کی مدد سے ہر موضوع کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات (۱۹۹۲ء):

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تصنیف ”ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی ساختیات“ ۲؍ جون ۱۹۹۲ء میں دہلی یونیورسٹی سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ جلد ہی اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے پاکستان میں بھی ۱۹۹۴ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز نے شائع کر دیا۔ اگرچہ مذکورہ تصنیف بنیادی طور پر فلسفیانہ مباحث پر مشتمل ہے، تاہم ساختیات کی اصطلاح بنیادی طور پر لفظ کی ساخت سے بحث کرتی ہے۔ اس حوالے سے یہ لسانی مباحث کی ذیل بھی شمار کی جاتی ہے۔ اس کی فہرست میں سے ساختیات اور ادب، لسانیاتی فکر سے رشتہ، ساختیات کی لسانیاتی بنیادیں، لانگ (لسان)، پارول (تکلم)، صوتیات اور ساخت کا عمل، تصورِ لسان اور ثنویتِ لفظ و معنی جیسے موضوعات خاص طور پر لسانی مباحث کی ذیل میں ہی آتے ہیں۔ ساختیات کو بطور ذہنی تحریک تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بیان کرتے ہیں:

> ”ساختیات ایک ایسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی کہ تمام انسانی فلسفوں میں ارتباط پیدا کر سکے۔ یہ ایک اعتقادی ضرورت تھی۔ انسان کو ہمیشہ ایک ”اعتقاد“ کی ضرورت رہی ہے۔ خواہ اس کا معیار کچھ بھی ہو۔ اس سے قبل مارکسزم نے اس ضرورت کو پورا کرنے کا خواب دکھایا تھا۔۔۔۔ مارکسزم اور ساختیات میں

> یہ فرق نظر میں رہنا چاہیے کہ مارکسزم بہر حال ایک آئیڈیالوجی ہے۔ جب کہ ساختیات فقط ایک فلسفہ، اصول اور طریقہ کار ہے۔ بطور طریقہ کار ساختیات کی فکری نہج رہی ہے کہ ایک نظام کے تحت لا کر تمام سائنسوں میں ربطِ باہمی پیدا کیا جائے۔''۱۱۸

گوپی چند نارنگ نے جدید لسانیات کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مطابق نوام چامسکی کے تصورِ زبان کے امکانات کو ایک خاص وضع سے منظم کرنے اور ان کو بروئے کار لانے کی خلقی صلاحیت ضرور رکھتا ہے۔ انسان کسی نہ کسی طرح آفاقی گرامر میں شریک ضرور ہے۔ اپنی زبان کو ضرورت کے مطابق تخلیق کرتا ہے جس سے ترسیل کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔ کسی بھی زبان کی گرامر اگرچہ ہمیشہ سے ہی خشک اور سنجیدہ موضوع سمجھا جاتا رہا ہے تاہم یہ کسی بھی زبان کو سمجھنے کی ابتدائی سیڑھی ہے۔ اس ضمن میں لیوی سٹراس کا حوالہ دیتے ہوئے گوپی چند نارنگ بیان کرتے ہیں:

> ''صوتیات کے جدید علم کی خصوصیات خاص اس کا آفاقیت کے نقطۂ نظر سے منظم ہونا اور اس کا ساختیاتی ہونا ہے۔ جس عہد میں ہم رہ رہے ہیں اس کا تمام سائنسی علوم سے یہ تقاضا ہے کہ فلسفے کی اصطلاح میں ذریت کو ساختیت اور انفرادیت کو آفاقیت کے تصور سے بدل دیا جائے۔ یہ رجحان کیمیا، حیوانیات، نفسیات، معاشیات وغیرہ ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ جدید صوتیات اس معاملے میں تنہا نہیں ہے۔ یعنی ہماری کاوشیں وسیع تر سائنسی تحریک کا حصہ ہیں۔''۱۱۹

اس حوالے سے دیکھا جائے تو ساختیاتی لسانیات کے ماہرین صوتیاتی انقلاب برپا کر چکے ہیں اور اس ضمن میں علمِ بشریات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ادبی حوالے سے ساختیات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اساطیر، دیومالا اور قصے کہانیوں اور رہن سہن، خورد و نوش اور آرائش وغیرہ ثقافتی انسانیات کے زمرے میں آتے ہیں۔ رشتوں کا نظام ایک تجریدی عمل ہے اور اس کے ارتباط و تضاد سے ہی نئے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے مطابق معنویات کا عمل جاری و ساری رہتا ہے اور یہی معنی ساخت کہلاتے ہیں۔

ثقافتی انسانیات (Cultural Anthropology) میں زبان کا جامع لسانی نظام موجود ہے اور

اس کے اندر لفظوں کا عمل بھی دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مذکورہ تصنیف میں بیان کیا ہے کہ زبان دنیا کے نظامِ نشانات میں سے محض ایک نظام ہے کیونکہ زبان کی نظریاتی بنیاد نشانیات یعنی Semiology ہے۔ اس طرح ساختیات اور نشانیات کی نظریاتی بنیاد ایک ہو جاتی ہیں۔

’’ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات‘‘ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گوپی چند نارنگ نے اردو ادب میں لسانیات اور ساختیات و پس ساختیات کے حوالے سے اہم کام کیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ انہوں نے مغرب سے استفادہ کرتے ہوئے مغربی مصنفوں کی کتب کو اردو میں ترجمہ کر دیا ہے لیکن اس سے مذکورہ تصنیف کی اہمیت میں کچھ خاص کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو تنقید کی نئی جہات سے روشناس کرایا ہے۔ اس کی بدولت اردو ادب کو سماجی سائنسوں کے ساتھ لا کھڑا کیا ہے اور آج زبانوں کا علم بطور سماجی سائنس کے ہو رہا ہے۔

اردو زبان کا آغاز (۱۹۹۳ء):

ڈاکٹر خورشید احمد صدیقی کی تصنیف کردہ ’’اردو زبان کا آغاز (مختلف نظریے اور حقائق)‘‘ ۱۹۹۳ء میں شجع پبلی کیشنز، جموں کشمیر سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کے دیباچے سے یہ بات علم میں آتی ہے کہ اس کی تکمیل ۱۹۸۶ء میں ہو چکی تھی لیکن چھ سال بعد یعنی دسمبر ۱۹۹۲ء میں اشاعت کے لیے دوبارہ تیار ہوئی اور ۱۹۹۳ء میں بالآخر اشاعت سے ہمکنار ہو گئی۔

’’اردو زبان کا آغاز‘‘ اس حوالے سے انفرادیت کی حامل ہے کہ اس میں اردو زبان کے آغاز اور پیدائش کے متعلق اب تک بیان کردہ تمام نظریات کو مرتب کر دیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی ترتیب کی گئی ہے، بلکہ ان پر ناقدانہ نگاہ بھی ڈالی ہے۔ یوں دراصل یہ لسانی مباحث پر بحث کی کتاب ہے۔ اس کی فہرست میں درج ذیل محققینِ لسانیات کے نظریات پیش کیے گئے ہیں:

۱۔ مولانا محمد حسین آزاد کا نظریہ برج بھاشا ’’آبِ حیات‘‘ (۱۸۸۰ء)

۲۔ مولانا نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ ’’دکن میں اردو‘‘ (۱۹۲۳ء)

۳۔ حافظ محمود شیرانی کا نظریہ ’’پنجاب میں اردو‘‘ (۱۹۲۸ء)

۴۔ محی الدین قادری زور کا نظریہ ’’ہندوستانی لسانیات‘‘ (۱۹۳۲ء)

۵۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا نظریہ سندھ میں اردو ’’نقوشِ سلیمانی‘‘ (۱۹۳۹ء)

۶۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی کا نظریہ ’’ہند آریائی اور ہندی‘‘ (۱۹۴۲ء)

۷۔ پروفیسر مسعود حسین خان کا نظریہ ’’مقدمہ تاریخ زبانِ اردو‘‘ (۱۹۴۸ء)

۸۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نظریہ ’’اردو زبان کا ارتقا‘‘ (۱۹۵۶ء)

۹۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا نظریہ ’’تاریخ ادبِ اردو‘‘ (جلد اول: عہدِ قدیم) پنجاب سے تعلق ۱۹۷۵ء

۱۰۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کا نظریہ کھڑی بولی کے حوالے سے ’’اردو کی زبان‘‘ ۱۹۶۳ء

ان کے علاوہ ’’مختلف نظریے‘‘ کے عنوان سے میر امن، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر بارنلے، ڈاکٹر گریرسن کی لسانی خدمات اور اردو زبان کے حوالے سے نظریات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خان بیان کرتے ہیں:

> ’’۱۸۸۰ء میں سب سے پہلے ہیورنلے نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کی ساخت اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ہندوستان میں آریہ دو مختلف گروہوں میں داخل ہوئے ہوں گے۔‘‘[۱۲۰]

مجموعی طور پر ڈاکٹر خورشید حمرا کے خیالات کا مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ وہ زبانوں کی پیدائش کے نظریات کے حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے نظریہ سے زیادہ متاثر ہیں۔ مغربی ہندی، مدھیہ دیش کی خاص زبان ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی مغربی ہند کو مدھیہ دیش کی خاص زبان قرار دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر خورشید حمرا کے مطابق اردو مدھیہ دیش کی زبان ہے اور یہ مدھیہ دیش ہی میں پیدا ہوئی۔ ان کے مطابق مختلف ماہرینِ لسانیات نے اردو زبان کے آغاز کے متعلق جو نظریات پیش کیے ہیں، ہر ایک نے اپنا نقطۂ نظر دیا ہے، اس لیے اس ضمن میں مصنفہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اردو مدھیہ دیش میں پیدا ہوئی اور اس کی پیدائش کا زمانہ ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک مقرر ہے۔ دلیل کے طور پر مصنفہ کا بیان ہے کہ تقریباً تمام ماہرینِ لسانیات اس زمانے کی تائید کرتے ہیں۔ بعد ازاں اس ضمن میں انہوں نے مختلف ماہرین کے نظریات کو بھی پیش کیا ہے۔ یوں مجموعی طور پر یہ لسانی مباحث تقابلی لسانیات پر مشتمل دکھائی دیتی ہے جس سے بہت سے نظریات کی حقیقت اور اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اردو زبان کی تاریخ (۱۹۹۵ء):

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کا شمار لسانیات کے اہم ماہرین کے طور پر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی تصنیف ''اردو زبان کی تاریخ'' ۱۹۹۵ء میں پہلی دفعہ شائع ہوئی۔ اس کتاب کا انتساب بھی پروفیسر مسعود حسین خان کے نام کیا گیا ہے۔ ''اردو زبان کی تاریخ'' پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ کتاب ایک مرتبہ کتاب ہے جس میں محی الدین قادری زور (اردو کی ابتدا)، پروفیسر مسعود حسین خان (اردو کی ابتدا سے متعلق چند مشاہدات) اور پروفیسر گیان چند جین (اردو کے آغاز کے نظریے) جیسے ماہرینِ لسانیات کے مضامین شامل ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کے مضمون ''اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے: ایک تنقیدی جائزہ'' سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مختلف لسانی نظریات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

''اردو زبان کی تاریخ'' میں درج بالا مضامین کے علاوہ دکنی اردو پر لسانی مباحث بھی پیش کیے ہیں اور اردو اور ہندی کے لسانی رشتے پر روشنی ڈالنے کی بھی کوشش کی ہے جبکہ آخر میں اردو سماجی اور تہذیبی قدر و قیمت کا تعین بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اپنی جگہ تاہم اس میں تعصب اور جانبداری کے واضح آثار دکھائی دیتے ہیں۔ مرزا خلیل بیگ اپنے استاد پروفیسر مسعود حسین خان کے نظریات کو من و عن قبول کرتے ہوئے ان کے مقابلے میں دیگر تمام نظریات اور ان نظریات کے حامل افراد کی تحقیقی کاوشوں کو رد کر دیتے ہیں جس کا اندازہ اس بیان ہوتا ہے:

> ''انہیں (پروفیسر مسعود حسین خاں کو) شیرانی اور ڈاکٹر زور کے اس نظریے سے ذرا بھی اتفاق نہیں کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ انہوں نے دونوں محققین کے اس نظریے کی اپنے مضمون ''اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ'' میں سخت تنقید کی ہے اور قدیم اردو (بالخصوص دکنی اردو) کے تحریری مواد کے لسانیاتی تجزیے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان کا ''مولد و منشا'' امیر خسرو کی ''حضرت دہلی'' اور اس کے نواح کی بولیاں ہیں۔ قدیم اردو کی وہ تمام خصوصیات جنہیں مرہٹی، پنجابی یا برج بھاشا سے منسوب کیا جاتا رہا ہے، اس تجزیے کے بعد ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق دہلی کے نواح کی دو بولیوں کھڑی بولی اور ہریانی سے ہے۔''[۱۲]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیقی طریقہ کار کی بجائے محض پروفیسر مسعود حسین خان کے نظریات کی تائید کر دی گئی ہے۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کے مطابق لسانیاتی نقطہ نظر سے اردو، ہندی، کھڑی بولی ایک ہیں۔ اردو کھڑی بولی کا وہ روپ ہے جس میں عربی، فارسی الفاظ کسی قدر زیادہ ہیں اور سنسکرت الفاظ بہت کم ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر شوکت سبزواری دونوں اردو اور کھڑی بولی کو ایک جانتے ہیں۔ دونوں کے نظریات میں محض اس قدر بُعد ہے کہ شوکت سبزواری اردو کا وجود پہلے اور کھڑی بولی کا وجود بعد میں بیان کرتے ہیں جبکہ گیان چند جین کھڑی بولی کو اردو پر زمانی تقدم دیتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیل بیگ کے مطابق گیان چند کی رائے ہی درست ہے۔ اپنے ایک مضمون ’اردو کا لسانی ارتقا شمالی ہند میں‘ میں ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ فرماتے ہیں:

> ’’اردو ایک ہند آریائی زبان ہے۔ شمالی ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے آغاز کا سلسلہ ۱۵۰۰ قبل مسیح میں آریوں کی داخلۂ ہند سے شروع ہوتا ہے۔ آریوں کی ہندوستان میں آمد کے سبب سے سے پہلے جس زبان کی نشو ونما ہوئی، اسے ’ویدک سنسکرت‘ کہتے ہیں جس کے قدیم ترین نمونے رگ وید میں ملتے ہیں۔ یہی زبان شستہ و شائستہ اور منضبط ہو کر ’کلاسیکی سنسکرت‘ کہلائی جسے پانِنی نے اپنی اشٹا دھیائی کے ذریعے قواعد کے اصولوں میں جکڑ کر جامد بنا دیا۔۔۔۔ اس زبان کو علمائے لسانیات ’پراکرت‘ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔‘‘[۱۲۲]

مجموعی طور پر ’’اردو زبان کی تاریخ‘‘ میں جہاں خلیل بیگ نے لسانی مباحث کا تذکرہ کیا ہے، وہیں لسانی مباحث کا تقابلی جائزہ لینے کی کوشش بھی کی ہے۔ تاہم ان کے نظریات اور خیالات پروفیسر مسعود حسین خان کے افکار کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔

لسانیات کیا ہے (مترجمہ: ۱۹۹۷ء):

ڈاکٹر نصیر احمد خان نے ۱۹۹۷ء میں ڈیوڈ کرسٹل کی تصنیف Waht is Linguistic کا ترجمہ ’’لسانیات کیا ہے؟‘‘ کے عنوان سے بڑی صحت کے ساتھ پیش کیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ لسانی مباحث کی ذیل میں خاص طور پر اس طرح موضوعات کے متعلق اردو میں ذخیرہ مواد بہت کم ہے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے مغربی زبانوں سے تراجم کیے جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کوشش ڈاکٹر نصیر احمد خان نے ڈیوڈ کرسٹل کی

تصنیف کا ترجمہ کر کے کی ہے۔ اس میں شامل مضامین میں ان میں لسانیات کیا نہیں ہے؟، لسانیات کیا ہے؟، لسانیات کے فوائد، برطانوی یونیورسٹیوں میں لسانیات کا نصاب وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ باب اول سے ترجمہ شدہ ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے ڈاکٹر نصیر احمد خان کے دونوں زبانوں پر عبور کا علم ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہیں لسانی مسائل اور اصطلاحات کا علم بھی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> ''لسانیات ایک ایسا لفظ ہے جس کی اکثر غلط تعریفیں ہوتی رہتی ہیں۔ پہلی بار اس لفظ کو سن کر لوگ یہ نہیں کہتے کہ لسانیات کیا ہے؟ بلکہ پوچھتے ہیں کہ لسانیات (Linguistics) کیا چیزیں ہیں؟ گویا یہ لفظ (Linguistics) بہت سی اشیا کے مجموعے کا نام ہے جس کو بآسانی جائزہ لینے کی خاطر یکجا کر دیا گیا ہے۔ جیسے کسی نمائش کی تصویریں وغیرہ۔ لوگوں کا یہ طرز عمل حیرت کی بات نہیں کیونکہ ریاضیات کی طرح اسے غیر مادی تصور نہ کر کے وہ لسانیات کے لفظ کو ایک کار یا موٹر کی طرح کوئی مادی چیز سمجھتے ہیں۔''[۱۲۳]

اس اقتباس سے جہاں ڈاکٹر نصیر احمد کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ لسانیات کے ضمن میں جن مسائل کا سامنا ہمیں اپنے ماحول اور اپنی زبان یعنی اردو کے حوالے سے درپیش ہے، وہی مسائل مغربی زبان اور ماحول میں بھی موجود ہیں اور یہ اس وقت تک موجود رہیں گے جب تک ''لسانیات'' کو بطور سائنس اور غیر مادی علم کے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

لسانیات درحقیقت زبان کا سائنسی مطالعہ ہے۔ زبان کا تعلق انسان سے ہے اور ماہر لسانیات وہ ہوتا ہے جو تقریباً ایک زبان کو خوب سمجھتا ہو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ایک سے زیادہ زبانوں کا ماہر ہو۔ ''لسانیات کیا ہے؟'' میں لسانیات کے چار الگ موضوعات ذکر یوں کیا گیا ہے:

> ''(الف) تقابلی علمِ زبان یا علم زبان یا زبان کی تاریخ کا مطالعہ یا جس نام سے بھی ہم پکارتے ہوں۔ (ب) کئی زبانوں پر دسترس حاصل کرنے یا کثیر زبانیت (Poliglottism) (ج) ادبی تنقید یا دوسرے موضوعات جیسے بولنے کی تربیت وغیرہ اور (د) قواعد کا روایتی مطالعہ جو ہمارے زیادہ تر سکولوں میں پچھلی ایک صدی

سے رائج ہے۔''۱۲۴؎

مجموعی طور پر ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے لسانیات کی مبادیات کو آسان بنانے کے لیے عمدہ ترجمہ کیا ہے اور اہم لسانی مباحث کو اردو میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہ ڈیوڈ کرسٹل کا کارنامہ ہے لیکن اردو میں اسے متعارف کروانے کا سہرا بہرحال ڈاکٹر نصیر احمد خان کے سر ہی ہے۔

لسانی رشتے (۱۹۹۷ء):

''لسانی رشتے'' ڈاکٹر گیان چند کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جو ۱۹۹۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ بعد ازاں گیان چند کی دیگر کتب کی طرح اس کتاب کی اہمیت کو بھی مدِ نظر رکھتے ہوئے پاکستان سے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی نے شائع کیا۔ اس ضمن میں پہلی اشاعت ۱۹۹۷ء میں ہوئی۔ ''لسانی رشتے'' میں جن موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، ان میں اردو زبان کا پس منظر اور آغاز کے ساتھ ساتھ دکن کے لسانی رشتے، اردو اور ہندی، ہندوستان میں زبان کا مسئلہ، اردو ہندی یا ہندوستانی شامل ہیں۔ ان موضوعات کے عنوانات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نے اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے نظریات کو بیان کیا ہے تاہم اس ضمن میں انہوں نے مختلف ماہرین و محققین کے لسانی نظریات و مباحث کا تقابلی جائزہ لینے کی کوشش بھی کی ہے۔ اردو کی پیدائش کے حوالے سے گیان چند کھڑی بولی کو اہمیت دیتے ہیں اور اس ضمن میں دیگر محققین کی کاوشوں کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ ان کے مطابق:

> ''اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ ا۔ کھڑی بولی کا آغاز ۲۔ کھڑی بولی کے اردو روپ دھارنے کا زمانہ۔ ڈاکٹر زور، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری نے بنیادی زبان کھڑی بولی کے آغاز کی جستجو کی ہے، جبکہ میر امن، سرسید محمد حسین آزاد، محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کھڑی بولی کے اردو روپ کی تشکیل پر توجہ مرکوز کی ہے۔''۱۲۵؎

ڈاکٹر گیان چند نے اسی حوالے سے ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی کا حوالہ بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی کے مطابق:

> ''تاریخی اور لسانیاتی اعتبار سے اردو، ہندی یا سنسکرت زدہ کھڑی بولی کا ترمیم شدہ

> مسلم روپ نہیں۔ سچ اس کے برعکس ہے۔ فارسی زدہ ہندوستانی، جو دلی میں محض دربار کے حلقوں میں پیدا ہوئی۔ (اسے پہلے ہم اس کا آغاز دکن کی دکنی بولی اور جنوبی ہند کی مسلم سلطنتوں احمد نگر، بیجاپور، برار، بیدر اور گولکنڈہ میں پاتے ہیں) اسے ہندوؤں نے اختیار کیا۔ چونکہ عربی، فارسی الفاظ ان کے لیے مصرف تھے۔ انہوں نے دیوناگری لپی کو اختیار کر کے بہت زیادہ سنسکرت زدہ لفظیات کو لیا اور باہر کے فارسی، عربی الفاظ سے پرہیز کیا۔“۲۶؎

اس بیان سے گیان چند کے تعصب کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سنیتی کمار چیٹر جی کے نظریات کو محض ہندی یا ہندوستانی کو اردو پر برتری دینے اور الگ زبان قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح اردو کا تعلق بلاواسطہ طور پر دکن سے جوڑتے ہوئے، اس قبیل کے محققین کے نظریات کو تسلیم کیا ہے تا کہ پنجاب سے اردو کے نظریات کو رد کیا جا سکے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر گیان چند نے ”لسانی رشتے“ میں یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان کی دو شکلیں ہیں۔ ایک لپی اور دوسرا دخیل الفاظ۔ ہندی دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے۔ اس لیے سنسکرت کے الفاظ بہت زیادہ ہیں۔ اردو نے ایرانی لپی میں تحریر کے باعث بہت سے الفاظ عربی اور فارسی سے مستعار لیے ہیں۔ اس طرح ہندی اور اردو کی ایک ہی تاریخ ہے۔ کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اردو زبان سے ملتی ہے۔ اسی لیے ہندی اور اردو ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ اسی طرح کی کوششیں ڈاکٹر سہیل بخاری اور دیگر محققین بھی کر چکے ہیں اور ہندی اور اردو کو ایک ہی زبان کے دو مختلف روپ کے طور پر بیان کر چکے ہیں۔ اس حوالے سے گیان چند کے کام کی اہمیت ثانوی رہ جاتی ہے۔

اردو کا ابتدائی زمانہ (۱۹۹۹ء):

مذکورہ کتاب کا مکمل عنوان ”اردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی تاریخ و تہذیب کے حوالے سے)“ ہے جو شمس الرحمان فاروقی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور ۱۹۹۹ء میں پہلی بار الٰہ آباد سے شائع ہوئی۔ شمس الرحمان فاروقی کی حیثیت کو پرکھا جائے تو ہندوستان کی تاریخ، تہذیب اور تمدن کے حوالے جا بجا دکھائی دیں گے۔ تخلیق، تنقید، تحقیق ہر میدان میں انہوں نے تہذیبی و تمدنی حوالے سے اپنے نظریات کو بیان کیا ہے۔ ”اردو کا ابتدائی زمانہ“ بھی اس

ضمن میں ان کی شخصیت کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتی ہے۔

”اردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی تاریخ و تہذیب کے حوالے سے)“ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ جس میں اردو زبان کو جدید طریقے سے جانچنے کی کامیاب کاوش دکھائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں شمس الرحمان فاروقی سنیتی کمار چیٹر جی کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”ہند، ہندو، ہندی۔ یہ تین ہمارے لیے ایک ہیں۔“ [۱۲۷]

اس بیان کا جواب شمس الرحمان فاروقی ان الفاظ میں دیتے ہیں:

> ”اردو صرف مسلمانی زبان ہے، الگ بھاشا نہیں، اردو کی فارسی / عربی لپی (رسم خط)
> کو ہٹاؤ، اردو اپنا سچا روپ۔ ہندی۔ پراپت (حاصل) کر لے گی۔“ [۱۲۸]

مجموعی طور پر شمس الرحمان فاروقی نے اپنے انداز میں اردو کی ابتدا کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کرتے ہوئے اسے کسی خاص علاقے یا خطے سے قرار نہیں دیا بلکہ اردو کے بطور زبان بولے جانے کے حوالے سے اس تہذیبی میراث کی حمایت کی ہے۔ چونکہ وہ ادب کے ترجمان ہیں، انہوں نے عالمی ادب کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ مغرب و مشرق سے اچھے تراجم بھی پیش کیے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا یہ خیال قابلِ قدر ہے کہ اردو کا ادبی اور لسانی سماج دنیا میں واحد سماج ہے جو اپنی زبان کے املا اور رسم الخط کے اعتبار سے اپنے آپ کو مجرم بھی محسوس کرتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس جرم ہے کہ اردو واقعی ’فوجی‘ اور ”لشکری“ زبان نہ ہو۔

اردو افعال (۲۰۰۰ء):

۲۰۰۰ء میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی نے ”اردو افعال“ کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس کی مصنفہ سونیا چرنیکووا ہے۔ مسز سونیا چرنیکووا کا تعلق روس سے ہے۔ انہوں نے بطور ریسرچ سکالر روس سے بھارت آ کر ”اردو کے صیغے“ کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں بھی ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ ”اردو افعال“ میں انہوں نے جدید لسانیاتی اصولوں کے مطابق اہم کام کیا ہے جس کا پیش لفظ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے تحریر کیا تھا۔ سونیا چرنیکووا کے مطابق:

> ”لسانیات میں زمانہ افعال کے ان صیغوں کا نام ہے جو یہ دکھاتے ہیں کہ کام بولنے

> کے وقت سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ماضی کے صیغے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کام بولنے کے وقت سے پہلے ہوا ہے۔ زمانہ مستقبل کے صیغے یہ دکھاتے ہیں کہ کام بولنے کے وقت کے بعد کیا عمل میں آئے گا۔ حال کے صیغوں معنی نکالنا سب سے مشکل ہوتا ہے۔ ان سے ہمیشہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کام بولنے کے وقت میں ہو رہا ہے۔“[۱۲۹]

اردو ہندی قواعد کی کتب میں ہمیشہ اس بات پر توجہ دی جاتی رہی ہے کہ امدادی افعال اس کے معنوں میں بھی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ اصل فعل کے مادے کے بعد امدادی افعال کا آنا اس بات پر منحصر نہیں ہوتا کہ بولنے والا سب سے پہلے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اس کام پر توجہ ہی مبذول کرانی ہے یا بتانا ہے کہ یہ کام کب عمل میں آیا۔ اسی طرح مذکورہ تصنیف میں اردو گرامر اور صیغوں پر کام کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر ”اردو افعال“ ایک غیر ملکی اور غیر زبان کے فرد کی تصنیف ہے جس میں اردو سیکھنے کے ابتدائی قواعد اور صرف و نحو پر اختصار سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقامی طلبہ سے زیادہ یہ ان افراد کے لیے زیادہ موزوں دکھائی دیتی ہے جو دوسرے ملک سے تعلق رکھتے ہیں اور اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔

ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب (۲۰۰۵ء):

ہندوستان میں لسانی نقطۂ نظر سے یہ بحث ہمیشہ جاری رہی ہے کہ اردو اور ہندی ایک زبان ہے یا دو زبانیں ہیں۔ بسا اوقات اردو کو مسلمانوں کی اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا گیا حالانکہ بنیادی طور پر دونوں زبانوں میں فرق رسم الخط کا ہے یا ذخیرہ الفاظ کا۔ یعنی ایک زبان کا رسم الخط فارسی ہے اور دوسری کا دیوناگری اور اسی طرح ایک کے ذخیرہ الفاظ میں عربی، فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں دوسرے میں سنسکرت کے۔ اسی تناظر میں ڈاکٹر گیان چند نے ”ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب“ کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ تصنیف ۳۱۱ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ڈاکٹر گیان چند نے معروف ماہرینِ لسانیات کے مذکورہ موضوع سے متعلق مضامین کو یکجا کر دیا ہے۔ ان ماہرینِ لسانیات میں سے سید احتشام حسین، ڈاکٹر ابو محمد سحر، آل احمد سرور اور مسعود حسین خان کے نام زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند کی مذکورہ تصنیف یعنی ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' پر الزامات لگتے رہے ہیں کہ انہوں نے اردو پر تعصّبانہ نظریہ قائم کیا ہے اور ہندی زبان کو اس سے اہم قرار دیا ہے۔ مذکورہ تصنیف کا تفصیلی مطالعہ اس بات کا غماز ہے کہ جن ماہرینِ لسانیات کے نظریات پیش کیے گئے ہیں، ان کی اکثریت اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیتی ہے جیسے سید احتشام حسین بیان کرتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں۔''[۱۳۰]

جبکہ ڈاکٹر ابو محمد سحر مذکورہ نظریہ کے متعلق مزید وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> ''اگر چہ اردو اور ہندی لسانیاتی مفہوم میں دو زبانیں نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت میں اس وقت انہیں دو الگ الگ زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے۔''[۱۳۱]

اسی طرح پروفیسر آل احمد سرور اپنے مضمون ''نئے ہندوستان کی تعمیر میں اردو کا حصہ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''اردو زبان ایک آریائی اور ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی بنیاد کھڑی بولی پر رکھی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اس میں اردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہندی اور اردو دو مستقل جداگانہ زبانیں نہیں ہیں۔''[۱۳۲]

البتہ مسعود حسین خاں کسی حد تک ڈاکٹر گیان چند کے نظریہ کی حمایت کرتے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر گیان چند کا نظریہ مسعود حسین خان کے نظریے کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسعود حسین خان کا مضمون ''اردو کا المیہ'' ۱۵/جون ۱۹۷۱ء میں مجلّہ ''ہماری زبان'' میں شائع ہوا جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

> ''چونکہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں، اس لیے اس میں ترجمے کا پردہ کم سے کم حائل رہتا ہے۔''[۱۳۳]

ڈاکٹر گیان چند بھی اسی نظریہ کی حمایت کرتے ہیں کہ اگر چہ لسانی نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہے، تاہم موجودہ زمانے میں ان کا رسم الخط ایک دوسرے سے مختلف ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں کا ادب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو گیا ہے۔ اس لیے اب لسانیاتی حوالے سے انہیں یکجا شمار کرنا درست نہیں ہے۔

اردو زبان اور لسانیات (۲۰۰۷ء):

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جہاں اردو زبان و ادب کے دیگر شعبوں یعنی ادبی تنقید، اسلوبیات، ساختیات اور ادبی تاریخوں کے حوالے سے خدمات انجام دیں، وہیں انہوں نے لسانیات کے حوالے سے بھی قابلِ قدر کام کیا۔ ''اردو زبان اور لسانیات'' اس حوالے سے ان کی اہم تصنیف ہے جو ۲۰۰۷ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اس تصنیف میں انہوں نے اردو زبان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ لسانیات کا تعارف اور اردو میں ہونے والے لسانی مباحث کا جائزہ لیا ہے۔ اردو زبان کے حوالے سے ان کے درج ذیل اقتباس سے انہوں نے اردو زبان کی اہمیت کو جتانے کی کوشش کی ہے:

> ''اردو کو محض اردو کہنا، اسے محض ایک زبان کہنا، اسے آٹھویں شیڈول کی درجہ بندی تک محدود رکھنا، اردو کے ساتھ بے انصافی ہی نہیں پوری ہندوستانی تہذیب، ایک ہزار برسوں کی تاریخی، باہمی میل ملاپ اور امیدوں اور ولولوں کی توہین ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا ایک سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اردو محض زبان نہیں، ایک طرزِ زندگی، ایک اسلوبِ زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے اور وہ شکل دی ہے جسے آج ہم اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔''[۱۳۴]

''اردو زبان اور لسانیات'' گوپی چند نارنگ کی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ انہوں نے مختلف مضامین کو جمع کر کے انہیں ترتیب دے دیا ہے۔ البتہ یہ مضامین اردو زبان، اردو کے لسانی مباحث اور جدید ادب کو سمجھنے کے لیے بہت معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ لسانی حوالے سے اس میں ساختیات، اردو زبان اور لسانیات، اسلوبیات، اردو املا اور رسم الخط جیسے موضوعات پر تفصیلی مواد اور بحث ملتی ہے۔

باب کے مجموعی مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو کی لسانی تشکیل میں پاکستان کی مختلف علاقائی زبانوں نے اپنا اپنا کردار ادا کیا اور ان زبانوں پر بھی اردو زبان کے اثرات کسی نہ کسی حد تک رونما ہوئے۔ یہ تمام تر مقامی زبانیں ہمیں اس قابل بناتی ہیں کہ ہم یہ جان سکیں کہ ان تمام زبانوں کی بنیاد خواہ مختلف ہو، ان کے قواعد و انشا کے اصول بھی قدرے مختلف سہی، اس کے باوجود کچھ نہ کچھ (تھوڑے یا زیادہ) الفاظ آپس میں اشتراک رکھتے ہیں۔ اس لیے اردو زبان کے حوالے سے جب بھی علم لسانیات یا علمِ زبان کے مباحث پیش کیے جائیں گے تو اِن زبانوں کا مطالعہ کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔

اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے پاکستان میں کافی کام ہوا ہے۔ اگر چہ اس کی مجموعی مقدار کسی زبان میں ہونے والے لسانی مباحث کے حوالے سے خاصی کم ہے، تاہم بعض محققین، ناقدین اور ماہرینِ لسانیات نے بعض ایسے مرقعے اس ذیل میں پیش کیے جنھیں دیگر زبانوں کے لسانی مباحث کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ ایسے مواد کی مقدار کم سہی لیکن معیاری ضرور ہے۔ بعض کتب کے مطالعہ سے باور ہوتا ہے کہ انھیں انگریزی سے من وعن ترجمہ کیا گیا ہے لیکن کہیں بھی اس بات کی نشاندہی نہیں کی گئی بلکہ یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ خود مترجم کی طبع زاد کاوش ہے۔ اگر ان پر ترجمے کا لیبل لگا دیا جائے تو ان کا درجہ کم تر نہ ہوتا کیونکہ کچھ کتابیں اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے ایسی ہیں جنھیں براہِ راست دیگر زبانوں سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح مغربی افکار بہت سی لسانی کتب میں نظریاتی سطح پر اختیار کیے گئے۔ ان مغربی افکار کی بدولت اردو میں بھی لسانی مباحث کے موضوعات میں اضافہ ہوا اور پاکستان سے وابستہ ماہرینِ لسانیات نے ثابت کیا کہ وہ محض مغربی ناقدین سے متاثر ہو کر ان کے نظریات کو بیان ہی نہیں کر دیتے بلکہ ان کے ضروری اور اہم اجزا کی تشریح و توضیح بھی کرتے ہیں اور ان میں ترمیم اضافہ کر کے اپنی قابلیت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ اگر چہ پاکستان میں تحقیقی و تنقیدی اور تعمیری سرگرمیوں کے مواقع محدود ہیں تاہم ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری، خلیل صدیقی ایسے نام ہیں جنھوں نے لسانیات کے میدان میں خاطر خواہ کارنامے انجام دیے اور اہم کتب اس حوالے سے پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ بعض افراد نے ایک ایک، دو دو کتب بھی تحریر کی ہیں جن میں مولوی عبدالحق، ابو اللیث صدیقی، عین الحق فریدکوٹی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر عبدالسلام وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح

بعض قومی سطح کے اداروں نے لسانیات کے شعبے کی سرپرستی کی اور ایسے افراد کی حوصلہ افزائی کی جنھوں نے لسانیات پر اسنادی مقالہ جات تحریر کیے۔ اس حوالے سے سب سے اہم ادارہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کا ہے۔ بہت سی کتب اس ادارے نے شائع کر کے اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے کام کی سرپرستی کی۔ اسی طرح انجمن ترقی اردو اور مجلس ترقی ادب کے ساتھ ساتھ معمولی حد تک نیشنل بک فاؤنڈیشن کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان ایک وسیع و عریض مملکت ہے اور وہاں تحقیقی کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی بھی کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں زبان و ادب کو بھی کسی طور پر کم تر خیال نہیں کیا جاتا بلکہ برابر کی حد تک حصہ دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پر تحقیقی کام پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے۔ تاہم لسانیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں ہونے والا کام پاکستان سے مقدار میں کچھ زیادہ تو ہوگا لیکن معیار میں وہ پاکستان میں ہونے والے کام سے بہت بہتر اور آگے نہیں دکھائی دیتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے ماہرینِ لسانیات نے اردو زبان سے باہر نکل کر بھی کچھ پیش رفت کی ہے اور بین الاقوامی سطح پر لسانیات کے باب میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ایسے افراد میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر گیان چند جین اور گوپی چند نارنگ کے نام قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے اردو لسانیات کے حوالے سے بیش قیمت سرمایہ مہیا کیا۔ ان کے علاوہ سنیتی کمار چیٹر جی، ڈاکٹر اقتدار حسین خان، ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر شجاعت سندیلوی اور ڈاکٹر نصیر احمد خاں کے کام کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں بھی لسانیات کے شعبہ میں مغرب سے رہنمائی لینے کے ساتھ ساتھ مغربی نظریات اور کتب کو اردو کے قالب میں ڈھال کر لسانی مباحث میں اہم اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے لسانیات کے شعبے کی خاصی سرپرستی کی اور لسانی مباحث پر مشتمل کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد برصغیر کے اردو بولنے والے دونوں بڑے حصوں نے لسانیات کے میدان میں اپنے قدم بھرپور طور پر جمانے کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں مقابلے کی فضا بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے کسی ایک خطے کی خدمات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے بہتر ہے کہ دونوں کی خدمات کو سراہا جائے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ابھی اس شعبے میں بہت سے مسائل بحث طلب اور حل طلب ہیں جن کے متعلق امید کی جا سکتی ہے کہ آنے والے وقتوں میں خاطر خواہ کام ہو سکے گا۔

حواشی

۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، ''پاکستانی قومیت کی تشکیلِ نو''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۲

۲۔ فرید کوٹی، عین الحق، ''اردو زبان کی قدیم تاریخ''، لاہور: اورینٹ ریسرچ سنٹر، ۱۹۷۹ء، ص ۹۳

۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ''زبان اور اردو زبان''، کراچی: حلقہ نیاز و نگار، ۱۹۹۵ء، ص ۳

۴۔ ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند''، تیرھویں جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۲۱

۵۔ قاسم محمود، سید، ''انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا''، کراچی: شاہکار بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۸ء، ص ۳۷۸

۶۔ جاوید، ڈاکٹر انعام الحق، مرتبہ: ''پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول ۱۹۹۷ء، ص ۷

۷۔ مسعود حسین خاں، ڈاکٹر، ''مقدمہ تاریخ زبانِ اردو''، لاہور: اردو مرکز، ۱۹۶۶ء، ص ۴

۸۔ وارث سرہندی، ''زبان و بیان'' (لسانی مقالات)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، جون ۱۹۸۹ء، ص ۹

۹۔ شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو''، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور: کتاب نما، طبع چہارم ۱۹۷۲ء، ص ۲۹۶۔۲۹۸

۱۰۔ سندھی، ڈاکٹر میمن عبدالمجید، ''لسانیاتِ پاکستان''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول مارچ ۱۹۹۲ء، ص ۱۹

۱۱۔ گی، سلیم خان، ''پنجابی زبان دا ارتقا''، لاہور: عزیز پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص ۳۷

۱۲۔ فرید کوٹی، عین الحق، ''اردو زبان کی قدیم تاریخ''، ص ۱۰۴۔۱۲۱

۱۳۔ غلام الانا، ''سندھی زبان کی اصل نسل''، حیدر آباد: زیب ادبی مرکز، ص ۳۸۔۳۹

۱۴۔ سندھی، ڈاکٹر میمن عبدالمجید، ''لسانیاتِ پاکستان''، ص ۲۴۹

۱۵۔ مقبول بیگ، مرزا، ''قواعد پنجابی زبان''، لاہور: پنجابی تحقیقاتی مرکز، ۱۹۷۳ء، ص ۸۱

۱۶۔ عباسی، شاہ محمد، ''پشتو زبان اور ادب کی تاریخ: ایک جائزہ''، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵

۱۷۔ ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند''، تیرہویں جلد، ص ۳۲

۱۸۔ احسن، عبدالشکور، مرتبہ: ''پاکستانی ادب'' (بلوچی ادب از محمد سردار خان بلوچ)، لاہور: ادارہ تحقیقاتِ پاکستان دانش گاہِ پنجاب، ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۶

۱۹۔ کوثر، ڈاکٹر انعام الحق ''بلوچستان میں اردو''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۱۸۔۳۱۹

۲۰۔ سندھی، ڈاکٹر میمن عبدالمجید، ''لسانیاتِ پاکستان''، ص ۳۷۴

۲۱۔ Grierson, G.A., "Linguistic Survey of India", vol.i, part-ii, pg.34

۲۲۔ سعید، سعید احمد، ''تاریخ ضلع رحیم یار خان''، رحیم یار خان: مطبع ندارد، ۱۹۸۱ء، ص ۲۶۱

۲۳۔ قریشی، حسین احمد، ''پنجابی ادب کی مختصر تاریخ''، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۴ء، ص ۱۷

۲۴۔ فارغ بخاری، سید، مقالہ: ہندکو ادب، مشمولہ: ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند''، چودھویں جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء، ص ۱۰۵۔۱۰۶

۲۵۔ ''ہفت زبانی لغت''، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۴ء، ص ۲۵۱۔۲۵۵

۲۶۔ یوسف بخاری، محمد، ڈاکٹر سید، ''کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ''، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۲۸۔ عبدالحق، مولوی، ''اردو زبان میں اصطلاحات کا مسئلہ''، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۴۹ء، ص ۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۵۱

۳۰۔ عشرت رحمانی، مرتبہ: ''اردو ادب کے آٹھ سال''، لاہور: کتاب منزل، س۔ن، ص ۲۰۲

۳۱۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ''اردو زبان کا ارتقا''، ڈھاکہ: یونیورسٹی آف ڈھاکہ، طبع اول جولائی ۱۹۵۶ء، ص ۶۰

۳۲۔ ایضاً، ص ۹۱

۳۳۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’اردو زبان کا ارتقا‘‘، ص ۹۱

۳۴۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’اردو زبان کا ارتقا‘‘، ص ۱۰۵

۳۵۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’داستانِ زبانِ اردو‘‘، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۰ء، ص ۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۸

۳۷۔ ایضاً، ص ۳

۳۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ’’اردو کی زبان‘‘، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۶۳ء، ص ۲۱

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۳

۴۰۔ خلیل صدیقی، ’’زبان کا مطالعہ‘‘، مستونگ: قلات پبلشرز، ۱۹۶۴ء، ص ۷

۴۱۔ ایضاً، ص ۶۹

۴۲۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’اردو لسانیات‘‘، کراچی: انجمن ترقی اردو بورڈ، اشاعت اول ۱۹۶۶ء، ص ۷

۴۳۔ ایضاً، ص ۸

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۲

۴۵۔ میر امن، ’’باغ و بہار‘‘، مرتبہ: ممتاز حسین، کراچی: اردو ٹرسٹ، ۱۹۵۸ء، ص ۱۳

۴۶۔ Bailey, T. Grahamme, "Studies in North Indian Languages", London: Lund Co. Ltd., 1938, pg.1

۴۷۔ اصلاحی، شرف الدین، ’’اردو سندھی کے لسانی روابط‘‘، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، بار اول ۱۹۷۰ء، ص ۳

۴۸۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’اردو لسانیات‘‘، ص ۳۹

۴۹۔ اصلاحی، شرف الدین، ’’اردو سندھی کے لسانی روابط‘‘، ص ۳

۵۰۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ’’اردو کا روپ‘‘، لاہور: آزاد بک ڈپو، مارچ ۱۹۷۱ء، ص ۹

۵۱۔ صدیقی، ڈاکٹر ابو اللیث، ’’جامع القواعد‘‘ (حصہ صرف)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، طبع دوم ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۷

۵۲۔ ایضاً، ص۱۷۲

۵۳۔ فرید کوٹی، عین الحق، ”اردو زبان کی قدیم تاریخ“، ص۱۹۱

۵۴۔ ایضاً، ص۱۸۸۔۱۸۹

۵۵۔ ایضاً، ص۲۰۰

۵۶۔ محمد باقر، ڈاکٹر، ”اردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں)“، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ص۳

۵۷۔ ایضاً

۵۸۔ ایضاً، ص۴

۵۹۔ غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر، ”جامع القواعد“ (حصہ نحو)، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۲۰۰۳ء، ص ۷

۶۰۔ ایضاً، ص۱۳

۶۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ”تاریخ ادب اردو“، لاہور: مجلس ترقی ادب، مارچ ۲۰۰۵ء، ص۲۲۔۲۳

۶۲۔ خلیل صدیقی، ”زبان کا ارتقا“، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء، ص۵

۶۳۔ ایضاً، ص۱۱

۶۴۔ ایضاً، ص۱۹

۶۵۔ قادر، ڈاکٹر سی۔ اے، پروفیسر، ”فلسفۂ جدید اور اس کے دبستان“، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، جون ۱۹۸۱ء، ص۱۶۱

۶۶۔ محمد یوسف بخاری، ڈاکٹر سید، ”کشمیری اور اردو کا تقابلی مطالعہ“، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، طبع اول ستمبر ۱۹۸۲ء، ص۲۳۵

۶۷۔ ایضاً، ص۲۵۱

۶۸۔ ایضاً، ص۲۶۶

۶۹۔ خلیل صدیقی، ”لسانی مباحث“، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص۵

۷۰۔ ایضاً، ص۱۴۸

۷۱۔ ایضاً، ص۳۰۰

۷۲۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ''اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء، ص ۸

۷۳۔ ایضاً، ص ۸

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۳

۷۵۔ سندھی، ڈاکٹر میمن عبدالمجید، ''لسانیاتِ پاکستان''، ص ۲۱

۷۶۔ ایضاً، ص ۲۲

۷۷۔ خلیل صدیقی، ''آواز شناسی''، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷

۷۸۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، ''عمومی لسانیات: ایک تعارف''، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵

۷۹۔ محبوب عالم خان، ڈاکٹر، ''اردو کا صوتی نظام''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء، ص ۲۴

۸۰۔ ایضاً، ص ۳۱

۸۱۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۸۲۔ بدایونی، ضمیر علی، ''جدیدیت اور مابعد جدیدیت''، کراچی: اختر مطبوعات، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۹۔۲۴۰

۸۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲

۸۴۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۸۵۔ سہیل عباس بلوچ، ڈاکٹر، ''بنیادی اردو قواعد''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء، ص ۳

۸۶۔ ایضاً، ص ۱۹

۸۷۔ ایضاً، ص ۳۸۱

۸۸۔ نیّر، ڈاکٹر ناصر عباس، ''لسانیات اور تنقید''، اسلام آباد: پورب اکادمی، جنوری ۲۰۰۹ء، ص ۲۱۰

۸۹۔ ادیب، مسعود حسن رضوی، سید، ''اردو زبان اور اس کا رسم الخط''، لکھنؤ: دانش محل، بار اول جولائی ۱۹۴۸ء، ص ۷

۹۰۔ مسعود حسین خاں، ڈاکٹر، ''مقدمہ تاریخ زبان اردو''، ص ۷

۹۱۔ احتشام حسین، سید، ''اردو کی کہانی''، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۵۶ء، ص ۱۶

۹۲۔ احتشام حسین، سید، ‘‘اردو کی کہانی’’، ص ۲۷۷

۹۳۔ ایضاً، ص ۲۹۔۳۰

۹۴۔ ایضاً، ص ۲۶۳

۹۵۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر، ‘‘اردو زبان اور ادب’’، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۳ء، ص ۲۵۔۲۶

۹۶۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۹۷۔ اقتدار حسین خان، ڈاکٹر، ‘‘اردو صرف ونحو’’، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء، ص ۵

۹۸۔ ایضاً، ص ۹

۹۹۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۲۔۱۴

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۱۵۔۱۶

۱۰۳۔ اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، ‘‘لسانیات کے بنیادی اصول’’، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء، ص ۱۱

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۱۰۴۔۱۱۲

۱۰۶۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا، ‘‘اردو کی لسانی تشکیل’’، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۸ء، ص ۱۲

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۷۱

۱۰۸۔ شرفی، حمید الدین قادری، سید، ‘‘ہند آریائی اور اردو’’، حیدرآباد (آندھرا پردیش): الیاس ٹریڈرس، ۱۹۸۶ء، ص ۶۳

۱۰۹۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، ‘‘عام لسانیات’’، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۸۵ء، ص ۳۔۴

۱۱۰۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، ''عام لسانیات''، ص ۶۳۸

۱۱۱۔ رنجن بھٹاچاریہ، شانتی، ''بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ''، لکھنؤ: نصرت پبلشرز، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء، ص ۱۱

۱۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۱۳۔ ایضاً، ص ۷۴

۱۱۴۔ نصیر احمد خاں، ڈاکٹر، ''اردو لسانیات''، نئی دہلی: اردو محل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۲۳۔۲۴

۱۱۵۔ ایضاً، ص ۶۲

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۱۷۔ ایضاً، ص ۲۴۵

۱۱۸۔ نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند، ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۳۵

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۳۸۔۳۹

۱۲۰۔ خورشید حمرا صدیقی، ڈاکٹر، ''اردو زبان کا آغاز''، جموں کشمیر: شیخ پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹

۱۲۱۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا، ''اردو زبان کی تاریخ''، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱

۱۲۲۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۱۲۳۔ نصیر احمد خاں، ڈاکٹر، مترجم: ''لسانیات کیا ہے؟''، مصنف: ڈیوڈ کرسٹل، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۷ء، ص ۹

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۲۵۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، ''لسانی رشتے''، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، ص ۹۲

۱۲۶۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۲۷۔ فاروقی، شمس الرحمان، ''اردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی تاریخ و تہذیب کے حوالے سے)''، کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۱ء، ص ۵۰

۱۲۸۔ فاروقی، شمس الرحمان، ’’اردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی تاریخ و تہذیب کے حوالے سے)‘‘، ص ۵۱

۱۲۹۔ سونیا چرنیکووا، ’’اردو افعال‘‘، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰

۱۳۰۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، ’’ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب‘‘، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳

۱۳۱۔ ایضاً، ص ۲۶۱۔۲۶۲

۱۳۲۔ ایضاً، ص ۲۶۲

۱۳۳۔ ایضاً

۱۳۴۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، ’’اردو زبان اور لسانیات‘‘، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۔۱۸

باب پنجم

لسانی تشکیلات

خصوصی مطالعہ

اردو لسانیات کا دقیق مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ اردو تنقید کی طرح اردو لسانیات میں بھی بہت سے نظریات و افکار مغرب کی مرہونِ منت ہیں۔ مغرب سے زبان کی پیدائش کے بارے میں اور زبان کی تشکیل کے بارے میں خیالات اخذ کیے گئے۔ مغربی تراجم کی بدولت اردو میں لسانی مباحث کے میدان میں اہم پیش رفت ہوئی اور ان تراجم کی بدولت اردو لسانیات میں مزید تحقیق و تنقید کے در وا ہوئے۔ اگرچہ لسانیات کے میدان میں ہم نے بہت سے نظریات و افکار مغرب سے مستعار لے رکھے ہیں البتہ اردو زبان کی پیدائش، ارتقا، نشو و نما اور دیگر نظریات خالصتاً اردو کے محققین کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ اسی طرح اردو قواعد پر ابتدائی طور پر اگرچہ مستشرقین نے کام کیا اور قواعد کی کتب ترتیب دیں تاہم ان کتب کی بنیاد پر مقامی ماہرینِ زبان اور ماہرینِ لسانیات نے محنت اور کاوش سے کام لیتے ہوئے ان کو درجہ استناد بخشا۔ یوں مجموعی طور لسانیات ہی ایسا شعبہ کہلا سکتا ہے جس میں ہمارے اپنے ماہرین و محققین نے نسبتاً زیادہ کارہائے نمایاں انجام دیے اور غیروں سے نسبتاً کم فیض اکتساب کیا۔ اسی طور پر مقامی شعرا و ادبا نے لسانی سطح پر ایک نئے باب کا آغاز کیا اور اردو میں ''لسانی تشکیلات'' کی بحث کا آغاز کیا۔

لسانی تشکیلات (Canon) سے وابستہ افراد نے لفظ اور معنی کے سلسلے میں نت نئے نظریات پیش کیے۔ ان کے بنیادی خیال یہ تھا کہ پرانے الفاظ نئے خیالات، احساسات اور جذبات کو درست طور پر بیان کرنے سے عاری ہیں۔ اس لیے نہ صرف نئے الفاظ تشکیل دیے جا سکتے ہیں بلکہ پرانے الفاظ کو بھی نئے معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔ لسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ''معنیات'' لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے جس کے مطابق کسی بھی لفظ یا جملے کے معانی سو فیصد اپنا مفہوم ادا نہیں کر سکتے۔ ہر شاعر یا مصنف لفظ کے معنی کو اپنے تناظر میں دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ لسانی تشکیلات میں الفاظ اشیا کی نمائندگی کی بجائے بطور مرکب ترکیبی تصور کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں بحران پیدا کرنے والے موضوع کو رد کیا جاتا ہے اور اس بحث پر غور کیا جاتا ہے کہ فکر کے لسانی اور قبلِ لسانی عناصر کس طرح لسانی تشکیلات کے دامن میں سمٹ جاتے ہیں۔ یہی وہ مباحث ہیں جو نئے ادب کی

ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق لغوی اور ثانوی مفہوم کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر لفظ کا ثانوی مفہوم ادا نہیں کیا جا سکتا۔ جب کسی بھی لفظ کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے تو اس کے مفہوم میں فرق ضرور آ جاتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی زبان میں لفظوں کی تعداد کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ اگر ان میں اضافہ کرنے یا توازن پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو زبان بحال نہیں رہ سکتی۔ یعنی لفظ اور اس کے معنی میں توازن پیدا کرنے کے لیے شعوری کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۹۵۱ء سے ادب میں نئے مباحث نے جنم لینا شروع کیا۔ لاہور میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۵ء تک نئے شعرا کی اکثریت نے جدیدیت اور نئی شاعری جیسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ اسی حوالے سے کراچی میں صفدر میر نے نئی شاعری کے حوالے سے مضمون تحریر کیا تو تمام نئے شعرا نے بھی اپنا اپنا حصہ ڈالنا شروع کر دیا۔ مبارک احمد اور جیلانی کامران نے بھی اس گروہ میں شمولیت اختیار کر لی اور نئے شعرا میں شامل ہو گئے۔ اس ذیل میں افتخار جالب، وزیر آغا، تبسم کاشمیری، انیس ناگی اور ڈاکٹر سعادت سعید کے نام خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے لسانی تشکیلات (Canon) کے تحت نہ صرف اپنے خیالات کا اظہار کیا بلکہ اس ضمن میں عملی طور پر اپنی شاعری اور نثر میں اسے برت کر بھی دکھایا۔ لسانی تشکیلات پر کام کرنے والے ناقدین کا کہنا ہے کہ میرا جی اور فرائڈ نے شعوری نفسیات کے فروغ کو جنم دیا ہے اور شعور کی رو ہی لسانی تشکیلات کا نقطۂ آغاز ہے۔ افتخار جالب اپنی تصنیف ’’لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر‘‘ میں لسانی تشکیلات کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> ’’اس میدانِ کارزار میں شمس الرحمان فاروقی نے اپنی انتھالوجی ’’نئے نام‘‘ اور رسالے ’’شب خون‘‘ کے ذریعے مبارزت طلبی کی۔ جیلانی کامران کی کتاب ’’نئی نظم کے تقاضے‘‘، افتخار جالب کا ’’لسانی تشکیلات‘‘ کا سلسلہ مضامین، انیس ناگی کی دو کتابیں ’’شعری لسانیات‘‘ اور ’’نیا شعری افق‘‘، سید سجاد کی مرتبہ انتھالوجی ’’نئی نظمیں‘‘، افتخار جالب کے مرتب کردہ مضامین کا مجموعہ ’’نئی شاعری‘‘، سلیم احمد، اختر احسن، عارف امان، عزیز الحق، فہیم جوزی، سعادت سعید، تبسم کاشمیری، سہیل احمد خاں، آزاد کوثری اور امجد اسلام امجد کے مضامین اور کتابیں اسی دور کی جدلیاتی

> صورتِ حال سے جہت لیتی ہیں۔ ابھی نئی شاعری کی کنسالیڈیشن ہو رہی تھی کہ قمر جمیل نے کراچی سے ''نثری نظم'' کا دھاوا بولا۔۔۔۔ جس کے ہراول دستے میں احمد ہمیش، قمر جمیل، محمد سلیم الرحمٰن اور عباس اطہر ہی پر مشتمل تھا اور آخر اس میں راشد بھی شامل ہو کر لندن جا بسے اور ہم ہیں کہ ۱۹۷۶ء سے کراچی ہی میں ہیں۔''[۱]

لسانی تشکیلات میں کسی بھی لفظ کی Meaning to Meaning جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لسانی تشکیلات اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ کسی بھی لفظ یا جملے کا مفہوم بیان کرنے کے لیے ہم معنیات سے مدد لیتے ہیں لیکن معنیات کا مفہوم ہر انسان یا ہر زبان کے لیے علیحدہ ہوتا ہے۔ اسی لیے لسانی تشکیلات میں معنیات کو اپنے تناظر میں پرکھا جاتا ہے اور اسی وجہ سے نئی شاعری میں معنیات اور نشانیات کا چرچا پایا جاتا ہے۔ افتخار جالب بیان کرتے ہیں:

> ''شعر و ادب میں 'زبان' موضوع اور ہیت کی علاحدگی کو تحلیل کر دیتی ہے۔ جیسی زبان ہوگی ویسے ہی معنی ہوں گے۔ جس نوعیت کے مفاہیم ہوں گے، اسی قسم کی زبان ہوگی۔ ایک ذرا زبان کو تبدیل کیجیے پھر دیکھیے کہ موضوع کی کیا شکل بنتی ہے۔ زبان کی یہی قدرت موضوع اور ہیت کو لسانی تشکیلات میں جذب کر لیتی ہے۔ ڈی۔ آر لینگ اور ڈی۔ جی کوپر نے کہا ہے کہ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ انسانی حقیقت، جس میں ہم رہتے ہیں، اپنے جوہر میں مبہم ہو۔ مبہم حقائق اس وقت واضح ہوتے ہیں جب ہم کسی شخص کو مختلف تناظروں اور تصورات کے حوالہ جات سے دیکھیں۔''[۲]

لسانی تشکیلات جدیدیت ہی کا موضوع ہے اور جدیدیت کے پس منظر کے حوالے سے نسیم نیشوفوزا اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''مختلف مقامات پر جدیدیت کے نام مختلف ہوتے جاتے ہیں۔ برلن میں جدیدیت کا نام ''نورومانیت'' ہے۔ ویانا میں اس کا نام ''تاثریت'' ہے۔ پیرس میں اس کا نام ''علامت پسندی'' ہے، نیویارک میں اس کا نام ''اظہاریت پسند تجریدیت'' ہے،

> مصوری میں جدیدیت کا نام ''سرئیل ازم''، ''ڈاڈاازم'' ہے۔ شاعری میں اس کا نام کنکریٹ شاعری ہے۔ فکشن میں اس کا نام ''شعور کی رو'' ہے، ڈرامے میں اس کا نام ''مہملیت کا تھیٹر'' ہے، فلسفے میں اس کا نام ''وجودیت اور مظہریت'' ہے، بہر حال عصرِ جدید کی کرب انگیز حسیت کا دوسرا نام ''جدیدیت'' ہے۔''[۳]

لسانی تشکیلات میں لفظ کے معنی سیاق وسباق کے اندر ہوتے ہیں یا اس سے باہر بھی وجود رکھتے ہیں۔ کسی بھی لفظ کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں جو لفظ سیاق وسباق سے باہر ہوتا ہے، وہ لغاتی مفہوم کا حامل ہوتا ہے اور جو لفظ سیاق و سباق میں پیوست ہوتا ہے، اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے۔ انیس ناگی ''شعری لسانیات'' میں فرماتے ہیں:

> ''اردو کے نئے شعرا نے معانی کا Stress بدل دیا ہے۔ نئی شعری تخلیقات سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذہن کو از سرِ نو لیس کرنے کی ضرورت ہے۔ جب شاعر کا ذہنی افق، جذباتی اور لسانی محاورہ بدل گیا ہو، تخلیق کا انداز معانی کے غیر مروجہ اسلوب کی نشاندہی کرتا ہو تو اس صورت میں شعری نظام کے ادراک کے لیے ذہن کی انتقادی صلاحیتوں کو از سرِ نو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔''[۲]

اس طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انسان کا لسانی اظہار اس کے تجربات کی وجہ سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ہر زبان اپنی بقا کے لیے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتی ہے۔ الفاظ میں یہ رجحان پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے حجم سے زیادہ معانی کے اظہار پر قدرت رکھتے ہوں یعنی الفاظ اپنی سکت سے زیادہ معانی کا بوجھ اٹھا سکتے ہوں، یہی لسانی تشکیلات کا منشور ہے۔

اردو میں لسانی مباحث کے حوالے سے لسانی تشکیلات (Canon) سے متعلق نظریات بلاشبہ ایک اہم اضافہ ہیں جنہوں نے نہ صرف اردو شعر و ادب کو ایک جدید جہت سے آشنا کیا بلکہ لسانی نقطۂ نظر سے بھی اہم مباحث منظرِ عام پر آئے۔ ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی اپنے ایک مضمون ''نئی شاعری: ایک امتحان'' میں بیان کرتے ہیں:

> ''شاعری کے لیے مجرد اظہار کافی نہیں، لیکن مکمل وضاحت اور ابلاغ کی بھی ضرورت نہیں۔ نیا شاعر نیم روشنی (translucence) کا قائل ہے۔ اس کا نظریہ

> فن ارادی ابہام کو اہم ترین درجہ دیتا ہے کیوں کہ ابہام مختلف النوع تصورات، انسلاکات (associations) اور امکانات کو راہ دے کر ان میں ایک ڈرامائی تناؤ پیدا کرتا ہے جس سے شعر کے معنی کو جمالیاتی تونگری ملتی ہے۔ ''معنی'' سے نیا شاعر وہ ذہنی کیفیات بھی مراد لیتا ہے جو شعر سے پیوستہ ہوتی ہیں۔ نئے شاعر کی نظر میں معنی کوئی علیحدہ چیز نہیں جسے شعر پر اڑھایا جا سکے بلکہ معنی کو شعر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اسے موضوع بھی کہہ سکتے ہیں۔''[۵]

لسانی تشکیلات کے حوالے سے افتخار جالب کے مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں جو ''لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر'' کے عنوان سے شائع ہو کر منظر عام پر آئے۔ افتخار جالب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ لسانی تشکیلات الفاظ کی نمائندگی کی بجائے اشیا کو بطور مرکب پیش کرتی ہیں اور مباحث کے نئے دروازے کھولتی ہیں۔ الفاظ شعر و ادب کی بجائے کوئی وجود نہیں رکھتے جن سے لسانی شنویت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> ''لسانی تشکیلات اساسی طور پر شعر و ادب کی نیابت کرتی ہیں۔ مواد کو اس ہیئت میں دیکھنا رائج الوقت محاکموں سے نجات ہی نہیں دلاتا، بل کہ اس جوہرِ خاص کو بلا شرکتِ غیرے ممیز کرتا ہے جس کی منزہ شکل و صورت کی پہچان از خود ایک مسلک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مزید براں لسانی تشکیلات زبان کے تمام ذرائع سے فرداً فرداً تعرض کر کے انہیں آج کل کے سطحی اور اکہرے لسانی تار و پود میں ضم کرنے کی ضرورت کا وسیلہ بھی ہیں۔''[۶]

افتخار جالب صرف نئی شاعری کو ہی زیر بحث نہیں لاتے بلکہ اپنے ہاں ہونے والی شنویت زدہ تنقید پر بھی بحث کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ بیان کرتے ہیں:

> ''شدید انفرادیت کہ اَن گنت واقعات کی تخصیصی تجسیمی اکائی ہے، تشکیلی حقیقت کے تصور سے متحد ہو کر یوں طلوع ہوئی ہے کہ ابلاغ کی ضرورت از خود معرضِ تشکیک میں آ گئی ہے۔ طرفہ تماشا بن گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو میکانیت کے اصلِ اصول ارسطالیسی منطق کے زہر کا تریاق عراق سے نہیں، اپنی زندگی سے مہیا کرتے ہیں،

> لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مارگزیدہ لوگ اذیت سے نجات کے لیے تڑپتے ہوئے بھی محتسب کا وتیرہ اختیار کیے ہوئے ہیں کہ چاہتے ہیں کہ ناسور نکل جائے پر صغریٰ و کبریٰ کی لذت نہ جائے۔''[۷]

افتخار جالب کی لسانی تشکیلات کو جسے انہوں نے اپنی نظم، نظر، تنقید وغیرہ میں برتا ہے، اسے سمجھنا عام قاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ شاعری اور تنقید کا گہرا شعور بھی لازم ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انیس ناگی کی تصنیف ''نئے ادب کا معمار: افتخار جالب'' اہمیت کی حامل ہے جس میں نہ صرف لسانی تشکیلات پر اجمالی بحث کی گئی ہے بلکہ افتخار جالب کے بارے میں بھی مبسوط رائے پیش کی گئی ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ افتخار جالب کی خدمات پر روشنی ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر انیس ناگی بیان کرتے ہیں:

> ''افتخار جالب ایک بے حد پڑھا لکھا ادیب ہے اور جملہ جدید علوم پر اس کی نگاہ ہے۔ لسانی فلسفہ اور لسانیات اس کا مرکزی موضوع ہیں۔ وہ ادب میں زبان کی حاکمیت پر اصرار کرتا ہے کہ زبان ایک سٹرکچر ہے جو معنی کی تشکیل بھی کرتی ہے اور اسے دریافت بھی کرتی ہے۔ وہ زبان کے ریفریشیل تصور کی تردید بھی کرتا ہے۔ لفظ بذاتِ خود ایک شے ہے، تخلیقی عمل اس کی شیئت میں اضافہ کرتا ہے۔ لسانی ادراک اشیا کا کنسپشن ہے۔ اس اعتبار سے اسے نئی اردو تنقید میں فوقیت حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے علم المعانی، ساختیات اور ان سے متعلقہ موضوعات پر مباحث کا آغاز کر کے تحسین و تخلیق ادب میں زبان کو بنیاد بنایا۔''[۸]

مشہور ماہرِ لسانیات سائیسر (Saussure) کا خیال یہ ہے کہ زبان صرف لفظوں کے ذریعے نہیں بنتی بلکہ نظامِ نشانات (System of Signs) کے طور پر بھی کام کرتی ہے اور الفاظ ان نشانات کا محض نظر آنے والا سرا ہیں۔ یہ نظامِ نشانات تجریدی ہے اور لسانیات انہی اصولوں اور کلیوں کو دریافت کرتی ہے جس سے زبان کی کلی ساخت دریافت کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس حوالے سے لسانی نشان کو اس دوہرے رشتے کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے جو اس کے ''صوتی امیج'' اور ''تصور'' کے بیچ پایا جاتا ہے جبکہ نشان ان دونوں کا مجموعہ ہے یعنی نشان کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک اس کی آواز صوتی امیج، معنی تمثال اور تصورِ معنی رکھتی ہے۔ زبان میں لفظ معنی رکھتے ہیں کیونکہ لفظ

رشتوں کا جامع نظام رکھتے ہیں[۹]۔ لسانی تشکیلات کے ضمن میں پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ دراصل معنیات سے بحث کرتی ہے، اس لیے ڈاکٹر انیس ناگی علم المعانی کی تشریح کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> ''جملہ نئے علوم میں خصوصاً علم المعانی نے لفظ اور شے کے جو نئے رشتے دریافت کیے ہیں، ان کے پیشِ نظر شاعری اور ادب میں معنی کی حیثیت بدل گئی ہے۔ اس علم کا اولین نقش اہلِ یونان کے ادبیات میں ملتا ہے۔ ان کی تنقیدی لغت میں (Semiotics) کی اصطلاح دستیاب ہے۔ اہلِ یونان کے نزدیک یہ علم کی ایک بنیادی شق ہے۔ علومِ جدیدہ کی لغت میں اس کا متجانس علم المعانی ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کی رو سے لفظ اور شے کا تعلق دریافت کیا جاتا ہے۔ لفظ اور شے کا تعلق معنی کا خصوصی تصور ہے۔ اس علم نے اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرنے کے لیے نفسیات سے کافی تقویت حاصل کی ہے کہ لفظ اور شے کے تعلق کی دریافت ذہنِ انسانی کے خصوصی ادراک کا نتیجہ ہے۔''[۱۰]

اردو میں لسانی تشکیلات کے حوالے سے ہونے والے کام کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں خاطر خواہ مواد مل جاتا ہے۔ افتخار جالب کے علاوہ اس سلسلے میں وزیر آغا کی ''معنی اور تناظر''، ڈاکٹر انیس ناگی کی ''شعری لسانیات''، گوپی چند نارنگ کی ''اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ'' اور ''اردو تنقید کا اطلاقی تناظر''، ابوالکلام قاسمی کی ''شاعری کی تنقید'' اور ''معاصر تنقیدی رویے''، عتیق اللہ ''ترجیحات''، شمس الرحمٰن فاروقی کی 'شعرِ شعور انگیز'' اور ''لفظ و معنی''، ضمیر علی بدایونی کی ''جدیدیت اور مابعد جدیدیت'' اور ''مابعد جدیدیت کا دوسرا رخ''، قمر جمیل کی ''جدید ادب کی سرحدیں''، دیوندر اسر کی ''ادب کی آبرو'' اور ''نئی صدی اور ادب''، وہاب اشرفی کی ''مابعد جدیدیت''، رؤف نیازی کی ''مابعد جدیدیت''، اور 'صورت گر کچھ افسانوں کے'' بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں فہیم اعظمی، قاضی افضال حسین، شافع قدوائی، فہمیدہ ریاض اور فاطمہ حسن کے مضامین بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے اس ضمن میں کوئی باقاعدہ تصنیف تو پیش نہیں کی لیکن ان کے بعض رسائل اور دیباچوں کی شکل میں شائع ہونے والے مضامین خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں افتخار جالب اور انیس ناگی کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی نظریہ کو معنی کی بنیاد بنایا ہے جو عملی تنقید کا عروج ہے۔

ادب نظریے کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے ادب میں نئی لسانی تشکیلات نے جنم لیا۔ نثر اور نظم میں نئے تنقیدی نظریات خاص طور پر ادبی متن کے معنی کی تلاش میں ہے۔ جدیدیت، نفسیاتی تنقید، ثقافتی تشکیل اور مصنف کا لاشعور شخصی نہیں ہے۔ زبان، لسانیات اور ساختیات پر علامتوں کا اثر ہے اور وہ اصل میں لسانی اور ثقافتی ہوتی ہیں۔ کسی بھی ادب پارے کی تفہیم کے لیے معنیات اور نشانیات کا جاننا ضروری ہے۔ زبان اول و آخر سماجی ذریعہ ہے جبکہ 'معنی نما' اور 'تصور معنی' سماج کے اندر ہی ہوتا ہے۔ ماہرِ بشریات لیوی سٹراس، نقاد رولاں بارتھ، تاریخی فلسفی مائیکل فوکو، ماہرِ نفسیات لاکاں اور ادبی نقاد و فلسفی دریدا نے اپنے اپنے فکری نظام وضع کیے۔ سوسیئر کے بعد رومن جیکب سن، لوئس ہج، ہیلیم سلیو، نوم چامسکی جیسے ماہرینِ لسانیات کی فکر نے ساختیات کو متاثر کیا اور کئی ادبی تحریکیں (ساختیات، مابعد ساختیات، ردِ تشکیل وغیرہ) سوسیئر کے فکری نظام کی پیداوار ہیں۔ انسانی معنویت کا سرچشمہ یہی ادبی نظریہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس ضمن میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> ''ہرچند اردو تنقید ابھی ساختیاتی تنقید سے پوری طرح آشنا نہیں ہوئی، تاہم اپنے خاص حالات کے تحت اس نے ابھی ایک طرح کے امتزاج کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیے ہیں۔ وہ یوں کہ نصف صدی پر محیط اس نظریاتی آویزش کے بعد جو دائیں اور بائیں بازو کے ادیبوں میں جاری رہی ہے، اردو تنقید اب ایک امتزاجی جہت کو قبول کر رہی ہے۔''[۱۱]

اور یقیناً یہاں وزیر آغا کا اشارہ لسانی تشکیلات کی طرف ہے جسے وزیر آغا کے ساتھ ساتھ افتخار جالب، انیس ناگی، ڈاکٹر سعادت سعید، شمس الرحمان فاروقی اور گوپی چند نارنگ جیسے وسیع المطالعہ ناقدین کی بدولت جلد ہی قبولِ عام حاصل ہو گیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سعادت سعید کے نظموں کے مجموعے ''شناخت'' کے دیباچے کا درج ذیل اقتباس مطالعہ کے قابل ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> ''جدید دنیا میں رہنے کے باوجود کئی نثری نظم لکھنے والے قدیم انسان کے لامحدود آزادانہ اظہار اور علامتیت پسندی کی جہتوں کو اپنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ آزاد شاعری کرنے اور نثری نظم لکھنے والے علامت بناتے ہیں۔ ارنسٹ کیسیرر

> (Ernest Cassirer) کہتا ہے کہ انسان ایک علامتی جانور ہے۔ اس کی زبانیں، مذاہب، علوم اور فنون اس کے علامتی اظہار کی عکاسی کرتے ہیں۔ فرائڈین تحلیل نفسی (Fredian Psycho analysis) کے پیرو کاروں کے خیالات کو اپناتے ہوئے نثری نظم نگار بھی یہ سوچتے ہیں کہ علامات اور اشارات انسانی خیالات کی نہایت واضح اور خوبصورت شکلیں ہیں۔ بادلیئر کے خیال میں شاعروں کو خیالات کے اصل علامتی مفہوم تک پہنچنے اور ادراک کی غاروں میں چھپی اصل حقیقت کو پانے کی کوشش کرنا چاہیے۔''[۱۲]

ہمارے جدید شعرا نے لسانی تشکیلات کے میدان میں بہت سے کارنامے انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید بھی اس میدان میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ بھی اپنی شاعری میں علامتوں اور تشبیہوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح کسی بھی زبان کے حروف تہجی اس زبان کی علامتیں ہیں اور جو اصوات ہم اپنے منہ سے نکالتے ہیں، ان کو تحریر میں لانے کے لیے ان علامتوں کا استعمال کرتے ہیں جبکہ شاعر حضرات معنیات کو واضح کرنے کے لیے اشاروں کنایوں کا استعمال کرتے ہیں۔

افتخار جالب شعر کو شاعر کا عمل اور اس کا قول قرار دیتے ہوئے نظری اور عملی تنقید میں فرق محسوس نہیں کرتے۔ وہ ادب میں علامت اور استعارے کے ذریعے بات کرتے ہیں اور نئی لسانی تشکیلات یعنی معنی کے معنی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ افتخار جالب کے دیگر ہم عصر شعرا جنہوں نے علامت نگاری اور استعاروں کے استعمال سے نئی شاعری کو فروغ دیا، ان میں زاہد ڈار، محمد سلیم الرحمان، ذوالفقار احمد، تبسم کاشمیری، سعادت سعید، انور ادیب، فہیم جوزی، سید سجاد، سرمد صہبائی، شائستہ حبیب، نسرین انجم بھٹی، آفتاب اقبال، شمیم احمد شمیم، عذرا عباس، سارہ شگفتہ، افضال احمد سید کے نام ایسے ہیں جنہوں نے عمدہ نظمیں تحریر کیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید افتخار جالب کی تنقیدی کاوشوں کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں بیان کرتے ہیں:

> ''افتخار جالب کہ جنہیں نئی شاعری کی تحریک کا بانی قرار دیا گیا ہے، فکر و فلسفہ کی عصری تحریکوں سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کو لسانیات سے گہرا شغف تھا۔ مختلف متون کی تلازماتی تعبیریں انہیں مرغوب تھیں۔ ان تنقیدی مضامین کو اگرچہ نظری مضامین

> سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن ان میں عملی تنقید کی پہلوداریاں موجود ہیں۔ اپنے نظریات کی تشکیل و تعبیر کے لیے وہ تنقید، شاعری اور فکشن کے متون سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، فیض احمد فیض اور ن۔ م راشد کے حوالوں سے اپنے بنیادی مضامین کے نظری زاویوں کی تزئین کر چکے ہیں۔ ظفر اقبال، عباس اطہر، انور سجاد، عذرا عباس اور کئی دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے اقتباسات سے بھی ان کے مضامین مزین ہیں۔ افتخار جالب کی نظری اور عملی تنقید میں استقرائی منطق کے استعمال سے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی اسی انداز نظر کو اپنی مرتب کردہ کتاب ''نئی شاعری'' بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی نئی شاعری کی تحریک کے خلاف لکھنے والوں کے مضامین بھی شائع کیے ہیں اور ان میں سے نظری زاویوں کا انتخاب قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔''[۱۳۱]

افتخار جالب کی طرح گوپی چند نارنگ نے ساختیات، پس ساختیات اور ردِ تشکیل جیسے موضوعات کو آسان بنانے میں اہم کام کیا ہے۔ انہوں نے گلوبلائزیشن کے اس دور میں اردو ادب کی تنقید کو نئے زاویے اور فکر سے روشناس کرایا ہے جس کی بدولت ''نشانیات'' کی ارتقائی منازل کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ انہوں نے نئے تنقیدی نظریات قائم کرتے ہوئے مشرقی شعریات کا تقابلی مطالعہ کر کے نئے معنی وا کیے ہیں۔ مشرقی شعریات کے حوالے سے انہوں نے سنسکرت، عربی، فارسی شعریات کی تفہیمِ نو میں تاریخی قدم اٹھایا جس سے اردو تنقید میں نئی جہت پیدا ہوئی۔ مناظر عاشق ہرگانوی اپنی تصنیف ''گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی'' میں بیان کرتے ہیں:

> ''گوپی چند نارنگ نکتہ رس ہیں اور بیباک نظریہ ساز ہیں۔ اردو تنقید کے فلسفی ناقد ہیں کیونکہ ان کا اپنا اندازِ نظر ہے جو اپنی شناخت اور دبستانِ فکر رکھتے ہیں۔ ماہرِ لسانیات اور ادبی تنقید کے تازہ فکر اور تنوع پسند ناقد ہیں۔ جدید اور قدیم ادب میں نئی معنویت تلاش کرنے والے یکتا ناقد ہیں۔۔۔۔ ساختیاتی فکر میں گہری بصیرت پیدا کر کے انہوں نے تنقید کے نئے دبستانوں کو اردو میں باضابطہ طور پر روشناس کرایا

> ہے۔ ساختیاتی فکر سے ان کی مراد نشانیات (Semiology) کے جملہ فکری
> ضابطے ہیں جن کا اثر نئی ادبی تھیوری نے قبول کیا ہے۔‘‘[۱۲]

اس حوالے سے گوپی چند نارنگ کی تصنیف ’’جدیدیت کے بعد‘‘ خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے جس میں انہوں نے لسانیات اور ساختیات کے ہمراہ معنیات کے حوالے سے نظریات قائم کیے ہیں۔ علاوہ ازیں مغرب کے لسانی فلسفی نقادوں کے تراجم کر کے نئے مباحث کے در وا کیے ہیں۔ انہوں نے لسانیات کو میکانکی معنی میں نہیں بلکہ فلسفۂ لسان کے معنی میں بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک ساختیات کو اتنی نسبت لسانیات کے میکانکی اصول و قواعد سے نہیں ہوتی جتنی معنیات کے فلسفے سے ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ زبان و ادب کا بنیادی کام یہی ہے کہ ابلاغ کی ترسیل ممکن ہو سکے۔ جدیدیت کے بعد ساختیات اور ردِ تشکیل دونوں متوازی انداز میں سامنے آئے۔ اب نشانیات ہو، ساختیات، پس ساختیات یا ردِ تشکیل، یہ سب نئے نظریے کی جہات ہیں جن کے بعد شعری لسانیات میں معنیات پر زیادہ توجہ صرف ہوئی جو قاری پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

افتخار جالب اور گوپی چند نارنگ کے ہمراہ اس میدان میں ڈاکٹر وزیر آغا کا بھی نام آتا ہے جنہوں نے نئے تنقیدی نظریہ ’’ساختیات اور سائنس‘‘ پر مکمل کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں مغربی فلسفی نقادوں کے نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل کی تصنیف ’’ادب اور عصری حسیت‘‘ بھی اس ذیل میں اہم اضافہ ہے جس میں انیس اور دبیر کا تقابلی مطالعہ جدید مباحث کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ طارق سعید کی تصنیف ’’اسلوب اور اسلوبیات‘‘ میں بھی لسانی تشکیلات کے حوالے سے چند مضامین مرتب کیے گئے ہیں جبکہ احمد سہیل کی تصنیف ’’ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید‘‘ میں خاص طور پر ترجمے کے حوالے سے بحث کی گئی ہے کہ ترجمے میں معنویت اور متن کی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں وژن دریافت کیا جاتا ہے۔ ترجمے میں زبان اور الفاظ کو ترجمہ کی ہوئی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے جس میں اصل یا قریب ترین معنویت ہوتی ہے۔ تاہم ترجمے میں لسانی مشابہت بھی ضروری ہے جس سے معانی دریافت کیے جاتے ہیں۔ اسی میدان میں ایک نیا اور اہم نام ناصر عباس نیر کا ہے جنہوں نے جدیدیت اور ساختیات کیا ہے کے عنوان سے مقالے مرتب کیے ہیں جبکہ حال ہی میں ان کی اس ذیل میں ایک اور تصنیف ’’لسانیات اور تنقید‘‘ بھی منظرِ عام پر آئی ہے۔ ناصر عباس نیر مغربی تنقید سے متاثر ہوئے ہیں اور ادب میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی طرح نئے نظریات پر بحث کر رہے ہیں۔

مجموعی طور پر فی زمانہ نئے لسانی نظریات جنم لے رہے ہیں اور ماہرینِ لسانیات لسانی تشکیلات میں معنی کے معنی جاننے کی کوشش میں پیہم مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کا لسانی اظہار اس کے تجربات کی وجہ سے آئے روز تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے لفظ میں معنی کے اظہار کی صلاحیت زیادہ ہونی چاہیے۔ اگر الفاظ اشیا کا قائم مقام ہونے کی بجائے کثیر المعانی ہوں گے تو خیالات، جذبات، احساسات اور ادراک کا اظہار بہتر ہو سکے گا۔

حواشی

۱۔ افتخار جالب، ’’لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر‘‘، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱ء، ص ۱۴

۲۔ ایضاً، ص ۷۵

۳۔ اشتیاق احمد، مرتبہ: ’’جدیدیت کا تنقیدی تناظر‘‘، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۶ء، ص ۷۹

۴۔ انیس ناگی، ’’شعری لسانیات‘‘ لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۲

۵۔ فاروقی، شمس الرحمان، ’لفظ و معانی‘‘، کراچی: مکتبہ دانیال، باردوم، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۵۔۱۲۶

۶۔ افتخار جالب، ’’لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر‘‘، ص ۱۵

۷۔ افتخار جالب، ’’لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر‘‘، ص ۷۵

۸۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، ’’نئے ادب کا معمار: افتخار جالب‘‘، لاہور: حسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۔۲۰

۹۔ طاہرہ صدیقہ، مقالہ: ’سوسیئر کے لسانی افکار‘، مشمولہ: راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، شمارہ ۲۰۱۰ء، ص ۳۶

۱۰۔ انیس ناگی، ’’شعری لسانیات‘‘، ص ۷

۱۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، مقالہ: ’اکیسویں صدی کا تصور (بیسویں صدی میں)‘، مشمولہ: راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، شمارہ ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۱

۱۲۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ’’شناخت‘‘ (نظمیں)، لاہور: مکتبہ نسیم، باراول ۲۰۰۷ء، ص ۸۔۹

۱۳۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، مقالہ: ’بیابانِ جنوں: نئی شاعری کی عملی تعبیر‘، مشمولہ: تحقیق نامہ، لاہور: جی سی یونیورسٹی، شمارہ ۷، جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۶

۱۴۔ ہرگانوی، مناظر عاشق، ڈاکٹر، ’’گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی‘‘، نئی دہلی: ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۷

باب ششم

اردو لسانیات: ماحصل

اُردو میں ابھی تک لسانی تحقیق پہلے تاریخی مرحلے پر ہے اور بہت کم تقابلی اور جدید لسانیات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ روایتی تحقیق جو ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زور، حافظ محمود شیرانی اور نصیر الدین ہاشمی سے شروع ہوتی ہے اور وحید الدین سلیم، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر شوکت سبزواری سے چل کر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ وغیرہ تک آتی ہے۔ ابھی تک ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تحقیقی کاوشوں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ ڈاکٹر زور نے ۱۹۲۹ء میں ''ہندوستانی صوتیات'' کے موضوع پر مقالہ پی ایچ - ڈی - لکھا اور دورِ جدید میں اگرچہ ڈاکٹر انور شبنم دل نے لسانیات کے تحقیقی موضوعات پر توجہ دلائی ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جدید لسانیات کے حوالے سے شمالی ہند میں ہند آریائی زبانوں کے ارتقاء کے موضوع پر بات شروع کی تھی یا پھر ڈاکٹر سہیل بخاری نے ''اُردو کا صوتی نظام'' اور ڈاکٹر محبوب عالم نے ''اُردو کا صوتیاتی نظام'' جیسی کتابیں پیش کی ہیں لیکن یہ مطالعے بھی زیادہ سے زیادہ دوسری منزل تک کی کوششیں قرار پاتے ہیں۔

اُردو لسانیات میں تحقیق کرنے کی بہت حد تک گنجائش موجود ہے صرف اُردو کے توضیحی مطالعے کو لیں تو بھی کئی برسوں بعد ایک آدھ تحقیقی مضمون سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ اور دیگر محققین نے چند تاریخی اور تقابلی مطالعے پیش کیے ہیں، تاہم اُردو میں لسانیاتی تحقیق کا ڈسپلن وضع کرنے کے لیے ابھی مزید کام کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر جامعاتی تحقیق میں لسانی تحقیق کا فقدان ہے۔

زبان میں تلفظ کی جانے والی آوازیں عام صوتیات کا موضوع ہیں۔ تکلمی صوتیات آوازوں کی لہروں کا تجزیہ سمعی فونیات کا موضوع ہے جو بولنے والوں کے ہونٹوں سے سننے والوں کے کانوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ فونیات کی اس شاخ میں آوازوں کی لہروں رفتار اور نوعیت کو سمجھنے کے لیے کی مدد لی جاتی ہے۔ فونیات کی تیسری قسم گوشی فونیمیات ہے۔ جو آوازوں کو سنتے وقت کان کے اندرونی نظام سے بحث کرتی ہے اور انھیں

پہچاننے کے لیے کان اور دماغ کے تعلق کا جائزہ لیتی ہے۔ آوازوں کے سائنٹفیک مطالعے کے ضمن میں ایک قابل ذکر بات تکلمی صوتیات کی ہے کیوں کہ یہی وہ علم ہے جو کسی آلے کی مدد کے بغیر آوازوں کی ادائیگی، ان کی تقسیم درجہ بندی اور توضیح و تجزیہ پیش کرتا ہے۔

لسانیات میں ہم زبانی بولی جانے والی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں لکھی ہوئی زبان کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سطح پر ہم صرف آوازوں (Speech Sounds) کا ہی مطالعہ کرتے ہیں۔ کسی زبان کی آوازوں کا مطالعہ ہم تین زاویوں سے کرتے ہیں۔ (الف) سمعیاتی صوتیات' (ب) سماعی صوتیات' (ج) تلفظی صوتیات'۔ زبانوں کے لسانی رشتے اُردو کے حوالے سے سندھی' پنجابی' پشتو' کھوار' ہندکو' سرائیکی' پہاڑی' بلوچی کے تعلق پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن یہ سارا کام عموماً لسانی یا لغوی بنیادوں پر ہوا ہے۔ لسانیاتی حوالے باقی ہیں۔ آریائی اور غیر آریائی زبانوں کے شجرے میں ان کی جگہ کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ برصغیر کی تمام بولیوں، مشرقی ہندی، بہاری، راجستھانی، پنجابی، گجراتی، مرہٹی، عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، یونانی، پرتگالی، ولندیزی، اطالوی وغیرہ کی لفظیات کا شمار کریں۔ بعض ایسی تحریریں لیں جو ہندی یا عربی، فارسی الفاظ کا تناسب دکھائیں ان الفاظ کا تعدد استعمال دریافت کریں اور پھر یہ دکھائیں کہ جملے میں مرکزی معنی کی ترجمانی کس زبان کے الفاظ کر رہے ہیں یا کونسی زبان زیادہ تر سامنے آ رہی ہے۔

جدید لسانیات میں قواعد کا فن بہت ترقی کر گیا ہے۔ لسانیاتی قواعد روایتی قواعد سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لیے ہمیں قواعد کا جائزہ لیتے وقت لسانیات کے صرف و نحو سے، تحقیق کے ساتھ مطالعہ کرنا پڑے گا وہ ایک دوسری الگ دنیا ہے۔ اہلِ یورپ کی طرح اہلِ ہند نے بھی ''اُردو قواعد'' پر کام کیا۔ مولوی فتح محمد جالندھری کی ''مصباح القواعد'' قابل توجہ رہی ہے۔ شعبہ لسانیات مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے علی گڑھ سے ''شمالی ہند کی اُردو کی تاریخی قواعد (۱۶۰۰ء تا ۱۸۱۰ء)'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ اُردو لسانیات میں اُردو کی بعض اصوات کے پہلو بہ پہلو ان کی اشکال و علامات بھی زیر بحث آ گئی ہیں۔ اُردو صوتیوں پر شاید اس لیے کہ علم اصوات نہیں بلکہ صوتیات بالکل جدید فن ہے۔ بہت کم لکھا گیا ہے اس فن کی روشنی میں اُردو کی ملتی جلتی یعنی متشابہ آوازوں پر بھی ایک خاصی طویل بحث اس میں شامل کر دی گئی ہے۔ پاکستانی زبانوں کے قواعد، صوتیات، سماجی لسانیات، نفسیاتی لسانیات اور ادبی تقابلی جائزے اور شعر و سخن کے حوالے سے بہت سا کام انجام دیا جا سکتا

ہے۔ پاکستانی زبانوں کے اشتراک کے حوالے سے مجموعی طور پر بعض ایسی تحقیقات سے واسطہ پڑتا ہے جن میں مشترک الفاظ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ جیسے اُردو سائنس بورڈ لاہور کی شائع کردہ ''ہفت زبانی لغت'' پروفیسر پریشان خٹک کی ''اُردو پشتو کے مشترک الفاظ'۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ پنجابی، سندھی، بلوچی، سرائیکی، پشتو، ہندکو اور دیگر پاکستانی زبانوں کے باہمی تقابل کا جائزہ لیا جائے۔ اس حوالے سے عام معلومات گریرسن کی (Linguistic Survey of India) سے مل جاتی ہیں۔ لسانیاتی تحقیق کا بنیادی نمونہ ڈاکٹر انور شبنم دل کی کتاب Pakistani Linguistics سے مل جائے گا پھر عین الحق فریدکوٹی کی Pre-Aryan Origions of Pakistani Languages کو کسی حد تک دیکھا جاسکتا ہے۔

''اخبار اُردو'' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے شمارہ دسمبر ۲۰۰۴ء میں نیشنل یونیورسٹی FAST لاہور کی بعض لسانی تحقیقات اُردو، پنجابی اور سندھی کے حوالے سے شائع کی گئی ہیں۔ ان کا جائزہ اور مطالعہ مفید ہوگا۔ ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی کی کتاب ''لسانیاتِ پاکستان'' میں پاکستانی زبانوں پر صوبہ وار الگ الگ مضامین دیئے گئے ہیں۔

اُردو اور کسی ایک پاکستانی زبان کے تقابلی مطالعے میں ڈاکٹر مہر عبدالحق کی ''ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق' معرکے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی کتاب ''اُردو سندھی کے لسانی روابط'' میں اُردو اور سندھی زبانوں کا الگ الگ جائزہ لینے کے علاوہ حروف و حکایت کے اشتراک، صوتیات کے اشتراک، صوتی تغیرات، معنیات، تشکیلیات، صرف و نحو، ذخیرہ الفاظ وغیرہ کو ہندی، عربی، فارسی، انگریزی، یونانی، ترکی اور قدیم زبانوں کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔

جتنی زیادہ اصوات جس زبان میں مستعمل ہوں وہ اسی زبان سے متعلق ہو جاتی ہیں۔ ہر زبان کے اصوات بھی تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ میں کسی بھی زبان کی صوتی خصوصیات یکساں رہیں لازمی نہیں ان کی رغبت بدلتی رہتی ہے۔ کان اصوات کو حدوں میں لاکر پابند کرتے ہیں ہم بیک وقت کئی آوازیں سنتے ہیں لیکن ہمارے کان ان اصوات کو ان کے مفاہیم کے ساتھ بہت تھوڑی مقدار میں قبول کرتے ہیں جن سے ہماری واقفیت ہوتی ہے۔ ملفوظ آوازوں کا نام زبان ہے آواز خاص معنوی علامت کے طور پر لفظ میں ڈھلتی ہیں۔ اس طرح کئی آوازیں ایک زبان کی صورت میں منضبط ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں ہر آواز اپنا ایک مفہوم ایک

شناخت اور ایک علامت رکھتی ہے۔

لسانیات سائنس ہے۔ سائنس کو دو شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، طبعی اور تاریخی۔ نباتات، حیاتیات، ارضیات وغیرہ۔ اور معاشیات، بشریات، عمرانیات وغیرہ تاریخی سائنس سمجھی جاتی ہیں۔ فرانز بوپ نے سب سے پہلے لسانیات کو سائنسی حیثیت دی۔ اس کے بعد شلیخر نے لسانیات کو مستقل طبعی سائنس قرار دیا ہے۔ اس کے بعد اس مؤقف کا سب سے بڑا نمائندہ میکس مولر ہے۔ جس نے بڑے جوش وخروش سے اس کی حمایت کی۔ اس نے اپنے مضامین اور لیکچروں میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ ''لسانیات'' طبعی سائنس ہے۔ ارضیات، نباتات اور حیوانات کے مطالعہ کی نہج ایک ہی ہے۔ ''لسانیات'' بھی کم وبیش اِسی نہج کو اختیار کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے لسانیات اور ان علوم میں بڑی گہری مماثلت ہے۔ اصوات' الفاظ' زبانیں' زبانوں کے زمرے' گروہ' ذیلی خاندان' خاندان۔ ان کے باہمی رشتے، توارث، اخذ و استفادہ، ماحول کے اثرات، الفاظ اور زبانوں کی تخلیق و تشکیل، ان کے نمو پانے کے طریقے، ان کے انحطاط کی صورتیں ان سے ضابطوں اور قاعدوں کا استنباط۔ اِسی لیے لسانیات فی نفسہ ایک طبعی سائنس ہے۔

طبعی سائنس کے تین مدارج ہوتے ہیں۔ تجربی' تقسیمی اور نظری۔ لسانیات کے بھی یہی تین مدارج ہیں۔ پہلے درجے میں یہ علم بھی تجربی حیثیت رکھتا تھا اور مختلف زبانوں کے تجزیاتی مطالعہ تک محدود رہا اس کے بعد زبانوں کی تقسیم اور گروہ بندی کے سلسلے میں صوریاتی تجزیے' صوریاتی گروہ بندی' ارتقائے لسان کے مدارج سے بحث ہوتی رہی، پھر عام اصول اور نظریے مدون کرنے کی منزل آئی۔ اس منزل پر دوسرے طبعی علوم کی طرح لسانیات میں بھی فلسفہ کا رنگ و آہنگ پیدا ہوا۔ ولیم وھٹنے لسانیات کو تاریخی سائنس سمجھتا ہے۔

صوتیات تکلمی آوازوں کی سائنس ہے۔ یا علمی نقطۂ نظر سے تلفظ کا فن ہے۔ صوتیات زبان کی سائنس ہے عام طور پر ریاضیات، فلکیات اور طبعی سائنسوں کی طرح ایک سائنس ہے۔

آر-ایچ-رابنس لکھتے ہیں:

> ''صوتیات لسانیاتی ترسیل کا عالمگیر ذریعہ ہے جو تمام نارمل انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ ماسوائے (گونگے، بہرے اور پاگل) انسانوں کے، اور تکلم کا سائنسی مطالعہ صوتیات کہلاتا ہے۔''[۲]

جدید لسانیات میں روایتی گرامر (جیسے کلاسیکل زبان کے طالب علم پڑھتے ہیں) اور بشریات جو اپنے آپ کو معاشرتی سائنس دان سمجھتے ہیں اور وہ انسانی علوم کا حصہ ہیں۔ مقامی بولیوں اور سماجی لسانیات کے محقق کو ان کی مدد کے لیے زیادہ اطلاع کار درکار ہوتے ہیں جو قوم، مذہب، عمر، جنس اور پیشے کے اعتبار سے مختلف ہوں۔ اطلاع کار کی تربیت کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے کام کا مقصد اور اہمیت سے آگاہ ہو سکے۔ مواد کی فراہمی کے طریقے معروضی اور سائنسی ہوں۔ شان الحق حقی کی ''فرہنگ تلفظ'' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

معنیات کا تعلق زبان کے اشاروں اور علامتوں سے ہوتا ہے۔ ایک ہی زبان میں تبدیلی مختلف علاقوں میں ہوجاتی ہے اسے عام بولیات کا نام دیا جاتا ہے۔ کسی بھی زبان کے متن اور اسلوب میں اس علاقے کے رویوں میں جو فرق آتا ہے اسے نفسیاتی لسانیات کا نام دیتے ہیں۔ زبان اور معاشرے کے درمیان تعلق کو معاشرتی لسانیات کہا جاتا ہے۔ آخر کار زباندانی، لغتیات، قواعد اور معنیات کسی بھی زبان میں وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ کسی بھی زبان کا یک زمانی مطالعہ اس کے تاریخی مطالعے سے مختلف ہوتا ہے۔ زبان کے ارتقاء کا علم تاریخی لسانیات کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> ''لسانیات اپنے وسیع مفہوم میں سماجی علم ہے۔ زبان سماجی تشکیل ہے' لسانیات اس تشکیل کی نوعیت اور اس میں مضمر و کارفرما قوانین اور اس کے ارتقاء کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس علم کی نوعیت بالائی نظر میں وہی ہے جو بشریات، عمرانیات، تاریخ اور نفسیات کی ہے۔ مگر چوں کہ لسانیات کا معروضی یعنی زبان، ثقافتی، عمرانی اور ذہنی تشکیلات سے مختلف اور بعض صورتوں میں ان سب پر حاوی ہے۔ اس لیے لسانیات دیگر سماجی علوم کے مقابلے میں کچھ مختلف ہو جاتی ہے اور ان پر حاوی بھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ لسانیات، بشریات' عمرانیات' تاریخ اور نفسیات کے مقابلے میں تنقید کو اور طرح کی مدد فراہم کرتی ہے۔''[۲]

توضیحی و تجزیاتی لسانیات کی تدریس کو لازمی اور مستقل اہمیت دی جائے۔ اس وقت بعض جامعات میں ایم۔اے اُردو میں لسانیات کا ایک پرچہ ہوتا ہے لیکن اسے صرف اُردو زبان کے نظریوں تک محدود رکھا گیا ہے اس نصاب پر

جدید تقاضوں سے نظر ثانی کی جائے۔ آج کے دور میں لسانیات نے زبان کی تاریخی جائزوں کی سرحدوں سے باہر نکل کر ریاضی اور سائنس کی اعلیٰ منزلوں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ ان منزلوں تک پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان علمی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی حیثیت مستحکم کر رہی ہے۔ اس علم کے فروغ سے جو علمی، سائنسی اور قومی فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں ان کے لیے منصوبہ بندی کی جائے۔ تاکہ ملک اس کی برکات سے فائدہ اٹھا سکے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) کی طرز کا ایک ایسا ادارہ ہو جو لسانیات کے علمی مدارج کو فروغ دے۔ اس ادارہ کے تحت ایک ایسا مرکز ہونا چاہیے جس میں لسانیاتی تحقیق کو فروغ دیا جائے۔ عام دلچسپی لینے والوں کے علاوہ اساتذہ کو وظائف، ترقی اور مالی فوائد کے حوالے سے اس کی طرف بآسانی راغب کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادارہ ایسی کتابیں شائع کرے جن سے لسانیات اور اس کی افادیت عام لوگوں پر اُجاگر ہو سکے اور وہ اس میں دلچسپی لے سکیں۔ علمی و قومی نقطۂ نظر سے لسانیات کے فروغ کے لیے حکومت کی توجہ نہایت مؤثر ہو سکتی ہے۔ اس طرح علمی اور سائنسی ترقی اور قومی یکجہتی کی راہ میں اس کے توسط سے مفید اور بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اسکولوں میں زبانوں کے عمل خانوں کا بڑھتا ہوا استعمال صحیح سمت میں ایک اور قدم ہے۔ لسانیات کو سکولوں میں منظم طور پر کس طرح متعارف کرایا جائے۔ اگرچہ انگریزی کی تعلیم و تدریس کی قومی انجمن (National Association for the Teaching of English) جیسی تنظیموں میں اس موضوع پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک میکانکی کام میں ماہر لسانیات کی ضرورت پڑتی ہے یعنی تار ترسیل اور اس کے نظام کو دوسری مختلف شکلیں مثال کے طور پر ٹیلی فون ترسیل کے لیے صوتیات انتہائی اہم ہے۔ تکلمی آوازوں کی تصویر تیار کی جا سکتی ہے۔ اس کو پڑھنا بہت مشکل ہے اس مشین کو صوت اسپیکر گراف کہتے ہیں۔

امریکہ کی ایک عدالت نے آوازوں کی تصویروں سے حاصل کی ہوئی ایک گواہی کو تسلیم کیا ہے انہوں نے اسے صوت نشان کے نام سے پکارا ہے۔ اطلاقی لسانیات میں لسانیات اور تکلمی بگاڑ کے درمیان تیزی سے ترقی پانے والا تعلق ہے۔ لسانیات کی ایک شاخ اسلوبیات اور ساختیات بھی اہم ہیں۔

لسانیات کا مطالعہ عصرِ حاضر کے لیے بہت اہم موضوع تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر کسی بھی لفظ کی کثیر المعنویت کو سمجھنا مشکل ہے۔ اُردو میں لسانیات کا کام زیادہ نہیں ہوا۔ اُردو سے متعلق ذیل کی کتب قابل ذکر ہیں: محمود شیرانی: پنجاب میں اُردو، ڈاکٹر محی الدین قادری زور: ہندوستانی لسانیات اور انگریزی میں ہندوستانی

صوتیات، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اُردو، انگریزی میں اُردو لفظ کا صوتی اور فونیمی مطالعہ، ڈاکٹر شوکت سبزواری: اُردو زبان کا ارتقا، داستان زبان اُردو، اُردو لسانیات اور اُردو قواعد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: انگریزی میں کرخنداری اُردو، اُردو زبان اور لسانیات، ڈاکٹر گیان چند: لسانی مطالعے، عام لسانیات، کے ایس بیدی: تین ہندوستانی زبانیں، ڈاکٹر نصیر احمد خاں: اُردو لسانیات، ڈاکٹر اقتدار حسین خاں: لسانیات کے بنیادی اصول، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، اُردو کی لسانی تشکیل، اُردو زبان کی تاریخ، زبان اسلوب اور اسلوبیات، ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اُردو میں لسانیاتی تحقیق کے نام سے مختلف لوگوں کے مضامین کا مجموعہ مرتب کیا۔ دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے رسالہ اُردوئے معلّٰی کا لسانیات نمبر بھی قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا انگریزی میں اُردو لسانیات نمبر بھی قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے انگریزی میں اُردو لسانیات پر کئی قابل قدر مضامین شائع کیے جو Language جیسے وقیع رسالے میں آچکے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے علاوہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے لسانیات پر بہت سے مضامین لکھے جن میں انکے مخصوص بلکہ انوکھے نظریات سامنے آئے ہیں۔ ہندوستان میں کچھ اور حضرات بھی لسانیات پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں نعیم چودھری، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل اور ڈاکٹر عصمت جاوید شامل ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں مہر الانسا نے ’دکنی اُردو قواعد کا تجزیاتی مطالعہ‘ اچھا مقالہ لکھا ہے۔ وہیں کا دوسرا مقالہ رشید حسن کا ’اُردو اور برج قواعد کا تقابلی مطالعہ‘ ہے۔ دکنی پر ہندی میں ڈاکٹر بابو رام سکسینہ اور شری رام شرما نے بھی لکھا ہے۔ بہاوالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ڈاکٹر نعمت الحق کا مقالہ ’اُردو لسانیات تاریخ و تنقید کی روشنی میں‘ اچھا کام ہے۔ ہندوستان کے ماہرین لسانیات کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

قدیم انداز میں لکھنے والے: یہ علما بنیادی حیثیت سے تاریخی لسانیات کے پروردہ ہیں گو انھوں نے تجزیاتی لسانیات پر بھی کچھ کام کیا ہے۔ یہ انگلستان اور فرانس کی قدیم لسانیاتی روایات کے امین ہیں۔ ان میں سے کچھ باہر گئے ہیں اور کچھ نہیں گئے۔ ان میں ذیل کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی، ڈاکٹر سکمار سین، ڈاکٹر ایس ایم کاترے، ڈاکٹر سدھیشور ورما، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر دھریندر ورما، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر اودے نرائن تواری، ڈاکٹر وشوانا تھ پرشاد، ڈاکٹر ہردیو باہری۔

جدید انداز کے لکھنے والے: یہ بنیادی حیثیت سے تجزیاتی لسانیات کے آدمی ہیں۔ ہندوستان میں ۱۹۵۳ء سے موسم گرما لسانیات اسکولوں کا سلسلہ شروع ہوا جو راک فیلر فاؤنڈیشن، دکن کالج پونا اور یو جی سی کے

اشتراک سے منعقد ہوتے تھے۔ ان اسکولوں میں کچھ برسوں تک مقتدر امریکی ماہرین مثلاً فرنیکس ہے۔ لنگس والڈ، گلیسن، گمپرز اور کیلی وغیرہ پڑھانے آئے ہیں۔ انکے اثر سے ہندوستانی اساتذہ جدید لسانیات سے آشنا ہوئے۔ مختلف زبانوں کے اساتذہ امریکہ گئے اور وہاں سے لسانیات میں پی-ایچ-ڈی کی۔ ادھر ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں میں لسانیات کے شعبے کھلے۔ ان میں دکن کالج پونا ممتاز ہے۔ موسم گرما اسکول اور یونیورسٹیوں کے شعبوں نے مل کر ملک میں لسانیات کو فروغ دیا ان لکھنے والوں میں ذیل کے حضرات کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر اے ایم گھاٹگے، ڈاکٹر پی بی پنڈت، ڈاکٹر اشوک کیلکر، بی-ایچ کرشنا مورتی، شنمگم پلّے، وی آئی سیرامنیم، خوب چندانی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، کیلاش چندر بھاٹیا، رمیش چندر مہروترا وغیرہ۔ رویندر ناتھ شری واستو نے روس میں جا کر لسانیات کا درس لیا۔ انہوں نے ہندی کے ابتدائی مصمتی خوشوں اور اسلوبیات پر کام کیا ہے۔ اُردو کے مشہور ماہرین لسانیات میں کوئی بھی لسانیات میں ایم اے نہیں وہ سب بنیادی طور پر ادب کے استاد ہیں۔

مغرب میں جدید لسانیات کے مطالعے کی داستان کچھ اس طرح ہے۔ انیسویں صدی میں لسانیاتی دلچسپی کا مرکز ہند یورپی زبانیں تھیں ماہرین لسانیات زبانوں کے رشتے اور شجرے قائم کرتے تھے نیز قدیم زبانوں کی باز تشکیل کرتے تھے۔ گرم نے جب صوت قوانین وضع کیے تو بیشتر یہ مطابقتوں پر چسپاں ہوتے تھے لیکن بعض مشتسنیات رہ جاتے تھے۔ صوتیات کے میدان میں کافی کام کیا گیا۔ ان میں ہنری سویٹ اور آٹو جیسپرسن کے کام قابل ذکر ہیں۔ تاریخی یا عصریاتی مطالعے سے عصری مطالعے تک لے جانے والی اہم ترین شخصیت ساسور کی ہے۔ بیسویں صدی میں لسانیات کے کئی دبستان ہو گئے ان میں چار زیادہ اہم ہیں لیکن بعد میں کچھ اور شامل ہو گئے ذیل میں انکا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

جنیوا اسکول اور فرڈی نیڈ ڈی ساسور (Ferdinand de Saussure) (۱۸۵۷-۱۹۳۱ء) نے ۲۲ سال کی عمر میں لسانیات پر ایک عالمانہ کتاب شائع کی جس کے بعد وہ پیرس یونیورسٹی میں معلم ہو گیا جہاں اس نے لسانیاتی سوسائٹی میں فعال رول ادا کیا۔ ۱۸۹۱ء سے وہ جنیوا یونیورسٹی میں چلا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کے شاگردوں نے لکچروں اور یادداشتوں کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا جو ۱۹۱۵ء میں پیرس میں ’’عام لسانیات کا ایک نصاب‘‘ کے نام سے شائع ہوئی۔ ساسور جدید لسانیات کے ستونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس پر نو

قواعدین کے علاوہ امریکی اسکالر وھٹنے وغیرہ کا اثر تھا۔ اس نے نو قواعدین کے اس نظریے کو چیلنج کیا کہ زبان کا سائنٹفک مطالعہ عصریاتی ہی ہو سکتا ہے۔ اس نے عصری مطالعے پر زور دیا۔ پھر اس کے شاگرد چارلس بیلی اسلوبیات کا ماہر ہے اور نحوی مطالعے میں لسانیات اور نفسیات کے تعلق کی کھوج کی لیکن جنیوا اسکول اسلوبیات کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔

فرانسیسی اسکول: ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۱ء تک ساسور پیرس میں درس دیتا رہا۔ روسیلو ۱۸۹۱ء تا ۱۹۰۸ء پہلا ماہر ہے جس نے لسانیات کے مطالعے کے لیے آلات اور مشینوں کی مدد لی۔ ''زبان لسانی اور تاریخی تعارف'' پیرس میں ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ بریل نے معنیات پر کام کیا۔

روسی اسکول: یہ اسکول اتنا اہم نہیں جتنا جنیوا اسکول اسے تاریخی اعتبار سے سبقت حاصل ہے اس اسکول کے تین ذیلی دبستان ہیں۔

(الف) کزان اسکول: روس کی کزان یونیورسٹی میں پولینڈ کے عالم کرتنے ۱۸۴۵ء تا ۱۹۲۶ء پروفیسر تھے اور کرزیکی انکے نائب تھے۔ ساسور اس اسکول سے متاثر تھا۔

(ب) لینن گراد اسکول: کرتنے کے شاگرد شیربا (۱۸۸۰ء تا ۱۹۴۲ء) اس اسکول کے بانی ہیں۔ انھوں نے صوتیات پر بہت کام کیا۔ علم اللغات بھی شیربا کا کام ہے۔

(ج) ماسکو اسکول: اس اسکول کا اہم ترین نام فورشاف (۱۸۲۸ء تا ۱۹۱۲ء) کا ہے۔ یہ تقابلی لسانیات کے آدمی ہیں۔ لیکن انھوں نے بھی زبان کے عصریاتی اور عصری مطالعے کی دوہری شاخوں کا احساس کیا۔ روس کا کمیونسٹ ماہر لسانیات مار (۱۸۶۴ء تا ۱۹۳۴ء) بھی ماسکو سکول سے متعلق ہے۔ اس نے زبان کے ارتقاً کی مارکسی تاویل کی۔

پراگ اسکول: ساسور اور کرتنے سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے چیکوسلواکیہ کے دارالسلطنت پراگ کا حلقۂ لسانیات قائم کیا۔ اسی کی مرکزی شخصیت ٹروبزکی (Trubetzkey) (۱۸۹۰ء تا ۱۹۳۸ء) کی تھی۔ ٹروبزکی کی کتاب اصولِ لسانیات ۱۹۳۹ء ہے۔ یاکولس اور مورس ہارے کی (Foundation of Language) ۱۹۵۶ء میں آئی۔ ان کتابوں میں فونیم کے مقابلے کا ایک نیا نظریہ دیا گیا ہے کام آلات کی مدد سے کیا گیا ہے اور لسانیات کو بالکل طبیعات کے پاس لے جاتا ہے۔ پراگ اسکول میں صوتیات کے علاوہ

اسلوبیات پر بھی کام ہوا۔

امریکی اسکول: امریکہ میں لسانیات کا اتنا متنوع کام ہوا ہے اور وہاں اتنے کارکن ہیں کہ ان سب کو ملا کر ایک امریکی اسکول کا نام دینا مناسب نہیں۔ پھر بھی یورپ کے مقابلے میں امریکی نقطۂ نظر اور لائحہ کار مختلف رہا ہے۔ یورپ میں لسانی مطالعہ (Philology) سے ارتقا پاتا ہے۔ وہاں کے ماہرین ادبیات پر بھی نظر رکھتے تھے۔ امریکہ میں لسانیات کو سماجی سائنس مانا گیا ہے۔ امریکہ کے ابتدائی اساتذہ بشریات کے ماہر تھے۔ یورپی اور امریکی ماہرین میں ذیل کا فرق دکھائی دیتا ہے۔

۱۔ یورپ کے ماہرین ہند یورپی زبانوں بالخصوص کلاسیکی زبانوں کے ماہر تھے جبکہ امریکیوں کا تعلق ریڈ انڈین زبانوں سے تھا۔ اسطرح یورپ کے ماہرین دنیا کے قدیم حصے کی زبانوں پر مرکوز تھے اور امریکی جدید حصے پر۔

۲۔ یورپ کے ماہرین کا کام تاریخی اور تقابلی تھا۔ امریکی ماہرین کا تجزیاتی اور ساختی۔

۳۔ یورپ کے لکھنے والوں کے سامنے زبانوں کا بہت بڑا تحریری مواد موجود تھا۔ امریکی ماہرین کے سامنے ایسی زبانیں تھیں جن میں رسم الخط بھی نہیں۔ امریکی لسانیات میں تین بہت اہم کلاسیکی شاہکار لکھے گئے ہیں۔ فرانز بوآس (Franz Boas) کی Hand book of American Indian Languages, 1911 E.Sapir کی (Languages, 1921) اور بلوم فیلڈ کی (Language 1933) ان تینوں کتب نے امریکی لسانیات پر بہت اثر ڈالا ہے۔ انڈین زبانوں کو صوتیات، قواعدی زمروں اور معنوی زمروں کے تحت تجزیہ کیا۔ بوآس کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ Sapir اسکا شاگرد تھا۔ یہ ٹیوٹانک زبانوں کا ماہر تھا۔

لیونارڈ بلوم فیلڈ (۱۸۸۷ء تا ۱۹۴۶ء) کا خاص مطالعہ جرمانی زبانوں کا تھا۔ اسکی دلچسپی بھی بشریاتی لسانیات سے ہوگئی۔ یورپیوں کے برخلاف اس کی کوشش تھی کہ لسانیات کو دوسرے علوم سے آزاد سائنس بنا دیا جائے۔ اس نے ۱۹۱۴ء میں (Introduction to The Study of Language) شائع کی۔ جن میں معنی کی شرح کے لیے Windt کی نفسیات پر تکیہ کیا تھا۔ بلوم فیلڈ نے ۱۹۳۳ء میں اپنی کلاسیک (Language) شائع کی۔ اب کی بار وہ شعور سے برخلاف (Behaviourism) سے متاثر تھا۔

بلوم فیلڈ کی کتاب 'زبان' امریکی لسانیات کی بائبل کہی جاتی ہے۔ اس میں بلوم فیلڈ نے معنی کو رد کیا اور زبان کے میکانکی پہلو یعنی صورت پر زور دیا۔ بوآس نے کہا تھا کہ صوتی ہیت ہی کا صحیح مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ معنی ذہنوں میں رہتے ہیں اور استعمال میں بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن ہیئت دکھائی یا سنائی دیتی ہے اور مستقل ہے۔ بلوم فیلڈ نے بھی زبان کو علامات کا نظام قرار دیا۔

بلوم فیلڈ کو تجزیاتی لسانیات کا سب سے بڑا ستون کہہ سکتے ہیں۔ اس نے تجزیاتی لسانیات کے جملہ شعبوں صوتیات، فونیمیات صرف و نحو وغیرہ کا مطالعہ کیا لیکن اس کا خاص زور فونیمیات پر تھا۔ بلوم فیلڈ اسکول کو فونیمی اسکول بھی کہہ دیا جاتا تھا۔ پائک کی صوتیات اور فونیمیات اور نائڈا کی مارفالوجی مشہور ہے۔ پائک (Pike) نے لسانی تجزیے کی اپنی وضع کو (Lagmimics) نام دیا Tagmeme کی اصطلاح بلوم فیلڈ کی دی ہوئی ہے۔ امریکی ماہرین سپیر بلوم فیلڈ اسکول کو پیش کرتے ہیں جو تجزیاتی اور ساختی دبستان ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہارورڈ اسکول جدید تر ہے۔

ہارورڈ اسکول: دوسری جنگ عظیم کے بعد جیکب سن ہارورڈ یونیورسٹی میں آ گیا اور یہاں ہالے اور فانٹ کے ساتھ مل کر اس نے امتیازی اوصاف کے تجزیے کو رائج کیا۔ اس طرح یہ پراگ اسکول کی توسیع ہے۔ نوآم چامسکی نے بھی قواعد اور زبان کا نیا نظریہ پیش کیا۔ بلوم فیلڈ (Behaviourist) تھا۔ اس کے نزدیک معنی کی اہمیت ثانوی تھی۔ چامسکی معنی کی اہمیت تسلیم کرتا ہے۔ ہیرس (Harris) کی مشہور کتاب (Methods in Structural Linguistics) ہے۔ چامسکی نے ۱۹۵۶ء میں (Linguistic Structures) میں قواعد کا تشکیلی نظریہ پیش کیا۔ کیمبرج کے Katz اور Postal نے مزید تشریح کے ساتھ اپنی کتاب An Integrated Theory of Linguistics Disciplion میں پیش کیا چامسکی نے اپنے نظریے کی تکمیل پیش کی Aspect of The Theory of Syntax چامسکی نے نحو اور معنیات کو ملا دیا ہے۔ اسکی وضع کردہ قواعد کو تشکیلی گرامر یا تخلیقی گرامر کہتے ہیں۔ اس گرامر کے سہارے مشینی ترجمہ بھی ہو سکتا ہے۔ تاریخی لسانیات کے ماہرین کے مقابلے میں تجزیاتی لسانیات والے جدید تھے۔ اسی طرح بلوم فیلڈ اور ہاکیٹ وغیرہ کے مقابلے میں جیکب سن اور چامسکی لسانیات کے جدید ترین ذہن کو پیش کرتے ہیں۔ اور فلمور چامسکی سے بھی اگلا قدم اٹھا رہا ہے۔

برطانوی اسکول: برطانیہ میں پہلا بڑا جدید ماہر لسانیات ہنری سویٹ (Sweet) جس کی کتابیں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں شائع ہوئیں۔ اس نے انیسویں صدی میں صوتیات پر کئی کتابیں لکھیں۔ اس کی تاریخ زبان ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ دوسرا مشہور ماہر ڈینیل جونز ہے جس کی کلاسیکی کتاب "An Outline of English Phonetics" ہے۔ اسکا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ ایک اور ماہر لی میلنوسکی (Malinowski) ہے جس نے عمر کا کثیر حصہ انگلینڈ میں گزارا یہ بنیادی طور پر ماہر بشریات تھا اس نے جنوبی سمندر کے جزیروں کی زبان کا مطالعہ کیا تو اس نے اندازہ کیا کہ یورپی زبانوں میں لفظ بہ لفظ ترجمہ ممکن نہیں۔ صورت حال کا 'سیاق' (Context of Situation) یعنی زبان کے معنی اس کے استعمال مخصوص سیاق ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس نے ۱۹۳۵ء میں ایک کتاب شائع کی۔ وہ بہت بڑا ماہر لسانیات نہیں۔ لیکن اس سے پروفیسر (J. R. Firth) نے تحریک لی۔ فرتھ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۸ء تک لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ لندن میں یہ اسکول آف اورینٹل سٹڈیز میں شعبۂ صوتیات ولسانیات کے صدر رہو گئے۔ وہاں انھوں نے ۲۵ سال کے مطالعے کے بعد زبان کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جو ۱۹۵۷ء میں سامنے آیا۔ فرتھ کے مطابق ایک بار ایک ہی زبان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ آفاقی اصولوں کا قائل نہ تھا۔ اس کے جانشین ہالڈے (Halliday) نے نظامی قواعد Systematic Grammar کا نظریہ وضع کیا۔ لندن اسکول کو صوتی اسکول (Phonetic School) اور بلوم فیلڈ کے اسکول کو فونیمی (Phonological School) کہہ دیا جاتا ہے۔ لندن اسکول کا اہم ترین فرد پروفیسر فرتھ ہے۔ اس اسکول پر اسی کے گروہ کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

کوپن ہیگن اسکول: اس دبستان کو ڈنمارک کے علماء (Brondd) (۱۸۸۷-۱۹۴۲) اور جیم سیلوز (Hjel bows Mslev) نے قائم کیا۔ ڈی ساسور نے اصول بنایا تھا کہ زبان ایک ہیئت ہے مواد نہیں۔ یم سیلو کا نظریہ اس کی انتہائی شکل ہے۔ وہ منطق اور ریاضی سے متاثر تھا۔ اس نے اپنے مطالعے کو لسانیات کی بجائے (Glossematics) نام دیا۔ یونانی زبان میں (Glossa) کے معنی زبان کے ہوتے ہیں اور mathe کے معنی مطالعہ۔ H. J. Vldall کی شرکت میں لکھی ہوئی کتاب An Outline of Glassematics کوپن ہیگن سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ سال لسانیات کے لیے کتنا زرخیز تھا۔ اسی سال چامسکی اور فرتھ کی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ یم سیلو اس قدر فلسفیانہ اور نظریاتی ہے کہ امریکیوں کو اس کی عملی افادیت میں شبہ ہے۔ یم سیلو نے جدید

لسانیات میں گراں بہا اضافہ کیا۔ روایتی طور پر لسانیات کے چار اسکول مانے جاتے ہیں۔ پراگ اسکول، کوپن ہیگن اسکول، لندن اسکول اور امریکی اسکول۔ بوآس، سپیر، بلوم فیلڈ اور ہاکیٹ وغیرہ کو ایک اسکول کہنا درست ہے۔ لیکن روسی، سوئس یا برطانوی اسکول میں داخلی یکسانی نہیں۔ اسکولوں سے قطع نظر دیکھا جائے تو پچھلی صدی کے اہم ترین ماہرین لسانیات یہ ہیں۔ ساسور، بلوم فیلڈ، چامسکی، جیکب سن، فرتھ، ہیم سیلو دورِ حاضر میں بلوم فیلڈ کے بعد چامسکی، فرتھ اور ہیم سیلو نے زبان کے نئے نئے نظریے پیش کیے ہیں۔ جن کی اہمیت میں شبہ نہیں۔ ان میں چامسکی کی تشکیل یا قلب ہیئت کا نظریہ سب سے زیادہ وقیع ہے۔

تجزیاتی لسانیات کے معاملے میں اُردو زبان کی موجودہ حالت آڑے آرہی ہے۔ اُردو کسی وقیع ادارے کا ذریعہ تعلیم نہیں۔ کسی درس گاہ میں لسانیات کے شعبے نے اُردو کو اپنا ذریعہ تدریس نہیں بنایا۔ (ماسوائے نمل یونیورسٹی اسلام آباد) کے اُردو میں لسانیات پر جتنے لکھنے والے ہیں وہ سب بنیادی حیثیت سے ادبیات کے آدمی ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ لسانیات سے کسی قدر امید کی جاسکتی ہے۔

جدید لسانیات خالص نظریاتی شعبۂ علم ہے۔ دورِ حاضر کو مفید علوم کی ضرورت ہے۔ یہاں ادبیات اور انسانیات کے درس کی افادیت پر بھی انگلی اٹھائی جاتی ہے۔ لسانیات کے نظریات کو یہاں کون پوچھے گا۔ ملک کے کونسے مسائل اس سے حل ہوں گے۔ جہاں تک اُردو کا تعلق ہے۔ جب تک اُردو زبان کی حالت بہتر نہ ہوگی۔ اس میں لسانیات کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کو فروغ نہ ہوگا۔

جدید لسانیات میں تربیت یافتہ اشخاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام طلبہ اور اساتذہ کو سمر اسکولوں میں بھیج کر بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس سے کہیں بہتر ہوگا اگر ہم اپنی یونیورسٹیوں کے ایم اے (اُردو) کے نصاب میں جدید لسانیات کی تعلیم لازمی کردیں اور اس کے کم از کم ۲ پرچے ضروری ہوں نصاب کی اس ترتیب میں زبان کی تاریخ، مختلف نظریے، زبان کا ارتقا اور قواعد سے متعلق جو پرچہ عام طور سے ہماری یونیورسٹیوں میں رائج ہے، اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ وہی سارے موضوعات لازمی لسانیات کے اور تاریخ ادب کے پرچے میں بہت خوبصورتی کے ساتھ شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے ہمارے طلبہ میں لسانیاتی تحقیق کی اہمیت کا احساس پیدا ہوگا اور اُردو زبان کے فروغ میں عملی طور سے وہ حصہ بھی لے سکیں گے جو اُردو زبان کی بنیادی ضرورت ہے۔

جدید لسانیات کے عروج سے زبانوں کے علمی افق زیادہ تابناک ہو گئے ہیں۔ غیر تحریری زبانوں کو

تحریر کی دولت مل رہی ہے۔ بول چال کی یا گنوارو زبانیں، علم وفن میں عملی حصہ دار بن رہی ہیں۔ جس طرح جدید صنعتی تہذیب نے ذات زبان سے اس مخصوص میدان میں زبانوں کو مختلف طبقاتی درجوں میں انفرادیت اور اہمیت بخشی۔ ممکن ہے زبانوں سے متعلق سوچنے سمجھنے کا یہ عملی و سائنسی استدلال ہی دنیا کو کوئی عالمی زبان کا راستہ دکھائے جو موجودہ حالات میں ایک شاعرانہ تصور ہے۔

تمام جامعات میں زبانوں اور ادب کے شعبوں میں توضیحی و تجزیاتی لسانیات کی تدریس کو لازمی اور مستقل اہمیت دی جائے اس وقت بعض جامعات میں ایم اے اُردو میں لسانیات کا ایک پرچہ ہوتا ہے۔ لیکن اسے صرف اُردو زبان کے آغاز کے نظریوں تک محدود رکھا گیا ہے۔ اس نصاب پر جدید تقاضوں کی روشنی میں نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے۔ علمی و قومی نقطہ نظر سے لسانیات کے فروغ کے لیے حکومت کی توجہ نہایت مؤثر ہو سکتی ہے۔ اس طرح علمی اور سائنسی ترقی اور قومی یکجہتی کی راہ میں اسکے توسط سے مفید اور بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہے۔

جدید لسانیاتی مطالعہ اور تجزیہ کی ایک مؤثر اور مستقل کوشش انور شبنم دل نے ضرور کی ہے۔ جو "Linguistic Research Group of Pakistan" کے داعی اور اسکے سب سے فعال رکن بھی رہے ہیں۔ انھوں نے پاکستان میں جدید لسانیات کے مطالعہ کو فروغ دینے کی بڑی مثبت کوششیں کیں۔ کئی مطالعے کیے اور لسانی مطالعوں پر مشتمل کئی مجموعی مقالات شائع کیے۔ انھوں نے پاکستانی لسانیات کے مطالعہ کا جو ایک محدود لیکن مفید حلقہ تشکیل دیا تھا۔ اس سے وابستہ ماہرین لسانیات نے مختلف نوع کے تحقیقی و تجزیاتی مطالعے کیے۔ خود انور شبنم دل نے جدید لسانیاتی اصولوں اور طریق کار کی مدد سے اُردو جملوں کی ساخت کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ تصنیف کیا۔ انکی واحد انفرادی کوشش جو جدید لسانیاتی مطالعہ کے باب میں اُردو کے تعلق سے ہوئی۔ وہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے انجام دی۔

معروف ماہرین لسانیات پروفیسر فرتھ، پروفیسر ہارلے اور پروفیسر الفرڈ ماسٹر کے تعاون اور انکی نگرانی میں کیا۔ پاکستان میں جب ۱۹۵۶ء میں فورڈ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام کراچی میں زبانوں کی تدریس کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں پروفیسر فرتھ بھی مدعو تھے۔ اور لسانیات کی تعلیم، تدریس اور تحقیق کے لیے ایک مجلس بنی تو وہ اسکے صدر بنائے گئے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اس مجلس کا معتمد بنایا تھا۔ پاکستان میں لسانیات کی تعلیم و

تدریس اور تحقیق کا ایک جامع منصوبہ حکومت کے سرد خانے کی نظر ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی لسانیات سے دلچسپی اور وابستگی کو مزید تقویت اس وقت پہنچی جب وہ ۱۹۵۹ء میں کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) سے مطالعہ پاکستان کے شعبے میں ایک استاد کی حیثیت سے منسلک ہوئے۔ انھوں نے درس و تدریس کے فاضل اوقات میں لسانیات کے شعبہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا۔ انھیں اطلاقی لسانیات اور لسانیات میں مشینوں کے استعمال سے تعارف بھی حاصل ہوا۔ نیویارک میں لسانیات کی اعلیٰ ترین تجربہ گاہ (Hopskin Lab) میں جہاں امریکی محکمہ دفاع کے بہت سے منصوبوں پر کام ہوتا ہے اور وہاں عام طالب علم کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی، لیکن ڈاکٹر صاحب کو کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ہونے کی حیثیت سے یہ رعایت یا استحقاق حاصل تھا۔ شام کا زیادہ وقت اسی تجربہ گاہ میں گزرتا۔ وہ کولمبیا سے کراچی واپس آئے تو انھوں نے ایک چھوٹی سی تجربہ گاہ جامع کراچی شعبہ اُردو میں قائم کی۔ پاکستان میں لسانیات کی یہ واحد تجربہ گاہ ہے۔

جدید لسانیات کے تعلق سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب نے جو مقالے تصنیف کیے وہ بھی اپنی جگہ اُردو میں منفرد ہیں۔ مثلاً ''لسانی مطالعے میں شماریاتی امدادی طریقوں کا استعمال'' اور ''صوتی تغیرات'' اور پھر ''اُردو کا صوتی تکلم'' یہ مقالات اُردو میں اپنے موضوع کے تعارف اور جائزے میں اولین کوششیں ہیں جو جدید لسانیات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا توسیعی خطبہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ۱۹۶۶ء میں پیش کیا گیا تھا۔ ان کا تجزیاتی اور تحقیقی مطالعہ جو ترکی اور اُردو کی تشکیل کے مشترک عناصر کے باب میں ہے۔ یا ''جامع القواعد'' ایک مبسوط اور وقیع قواعد ہے۔ بنجمن شلزے کی تحریر کردہ ''ہندوستانی گرامر'' کا ترجمہ اور اس کی ترتیب اور اس پر تعلیقات اور ترقی اُردو بورڈ کراچی کے عظیم منصوبہ لغت کی تصحیح اور اس کی جلد اول پر ان کا مبسوط مقدمہ ان کی مزید وقیع کاوشیں ہیں، جو لسانی نقطۂ نظر سے بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

زبان، انسانی طرزِ معاشرت کا ایک اہم ترین اور با اوصاف جزو ہے، لہٰذا اس کو ہمیشہ انسانی زندگی کے تعلیمی شعبے میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ بہر حال حالیہ دور میں اس کی حیثیت بڑی حد تک بدل گئی ہے۔ پہلے زبان کی تدریس صرف چند مخصوص زبانوں تک محدود تھی جن میں ابتدا مغربی یورپ کی کلاسیکی اہمیت کی حامل زبانیں شامل تھیں۔ گذشتہ چند نسلوں کے دور میں انفرادی زبانوں کی تدریس کے بارے میں زبان کا ایک وسیع تر تصور، ذہنوں میں پیدا ہو چکا ہے۔ چونکہ سارے سماجی علوم اپنی اپنی جگہ پر ارتقا کی منزلیں طے کر رہے ہیں، لیکن

اپنے اپنے دائرہ عمل میں زبان کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

نفسیات‘ سماجیات اور عمرانیات وغیرہ علوم نے اپنے لیے ایک ایسی زبان ایجاد کر لی ہے جس کو انسانی طرزِ عمل اور شخصیت‘ سماج اور ثقافت سے میل کھاتا ہوا طریقہ؛ دونوں حیثیتوں سے برتا جا سکے۔ زبان تکنیکی مسائل میں بھی دخیل ہو گئی ہے اور مشینی علوم سے تعلق رکھنے والوں نے بھی انسانی طرزِ گفتگو کے بارے میں تحقیقات کرنا شروع کر دی ہے۔ زبان کی تدریس کے لیے ہمارے پاس مختلف نقطہ ہائے نظر سے، مسلم الثبوت تکنیکی ذرائع موجود ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ذریعہ، ان سارے طریقہ ہائے کار کی تکمیل کرتا ہے جو آج کے نظریاتی علوم اور عملی مسائل کو حل کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

توضیحی لسانیات وہ طریقۂ کار ہے جس کے تحت زبانوں کا مطالعہ، ان کی داخلی ساخت کے تحت کیا جاتا ہے۔ اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس کے تحت انسانی طرزِ گفتگو کے مختلف پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ اس طریقہ کار کا عام تدریسی مواد اور مختلف مسائل کو حل کرنے کے لیے اس کی صلاحیت؛ دوسرے طریقہ ہائے کار سے اس کا ایک مضبوط رشتہ قائم کر دیتی ہے۔ توضیحی لسانیات، ارتقاءِ زبان کے جدید تر دستور العمل کا ایک اہم تلازمہ بن گئی ہے۔ شاعر و ادیب‘ نقاد اور افسانہ نویس کا کام جہاں ادب کی خدمت کرنا ہے، وہیں پر ماہر زبان، زبان کے فروغ و ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ کسی بھی ادب کی ترقی سے پہلے زبان کی بنیادی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک زبان ترقی نہ کرے اس وقت تک ادب ترقی نہیں کر سکتا۔ لیکن زبان کی ترقی کا ادب کی ترقی سے معمولی تعلق ہے۔ اُردو کے لسانیاتی ادب پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ماہرینِ لسانیات کو اُردو زبان کی ترقی میں بہت بڑا کردار ادا کرنا باقی ہے۔

محمد حسین آزاد کا ’آبِ حیات‘ کا مقدمہ اُردو کے سارے لسانیاتی سرمائے کے لیے بھی مقدمے کا کام کرتا ہے۔ آزاد سے پہلے انشاء اللہ خان انشا نے دریائے لطافت لکھ کر جدید لسانی اصولوں کے پیشِ نظر اُردو کی بولیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔ حافظ محمود خاں شیرانی کی لسانی خدمات بھی سائنسی نقطۂ نظر کے تحت پہلی کوشش تھی ان کے علاوہ پنڈت کیفی‘ مولانا وحید الدین سلیم‘ ڈاکٹر عبدالحق‘ ڈاکٹر محی الدین قادری زور‘ پروفیسر عبدالقادر سروری‘ پروفیسر احتشام حسین‘ ڈاکٹر مسعود حسین خاں‘ ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی خدمات کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ پاکستان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری‘ ڈاکٹر سہیل بخاری‘ وارث سرہندی

اور سیّد قدرت نقوی کو لسانی تحقیق میں خاص مقام حاصل ہے۔ انڈیا میں کچھ اور نام ڈاکٹر نصیر احمد خاں، ڈاکٹر اقتدار حسین خاں پھر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے شاگرد، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ عصر حاضر کے اُردو کی لسانیاتی تحقیق کے سرخیل مانے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر حضرات نے ''تاریخی لسانیات'' پر زیادہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور کی ہندوستانی صوتیات (انگریزی)، ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی (A Phonetic and Phonological Study of a Word in Urdu) اس انگریزی کتابچے کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے بڑی صحت کے ساتھ کیا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کی کرخنداری اُردو، اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو اور ڈاکٹر گیان چند کے مضامین جواب کتابی صورت میں 'لسانی مطالعے' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ جدید لسانی اعتبار سے اُردو پر کام کرنے کی انفرادی کوششیں ہیں۔ ابھی انفرادی اور جماعتی لحاظ سے ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اُردو زبان کی ترقی کے سلسلے میں ماہرینِ زبان کو درج ذیل پہلوؤں پر کام کرنا چاہیے۔

۱۔ اُردو کا صوتی تجزیہ۔
۲۔ اُردو کا صرفی اور نحوی مطالعہ۔
۳۔ اُردو کی مختلف بولیوں کے جائزے۔
۴۔ اُردو زبان کی تدریس کا مسئلہ۔
۵۔ اُردو کے سماجی و ثقافتی پہلو۔
۶۔ ذولسانیات اور اُردو۔
۷۔ اُردو لغت کی تدوین۔

کسی زبان کے لسانی مطالعوں کے سلسلے میں صوتی تجزیہ ہی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جب تک ہم زبان کا صوتی مطالعہ نہ کریں، زبان کے دیگر پہلوؤں پر کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ آواز ہی سے زبان وجود میں آتی ہے۔ صرفی مطالعے میں بھی قدم قدم پر صوتی خصوصیات ہی کے تعین کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔ زبان کے رسمِ خط کے سلسلے میں بھی صوتی مطالعہ مددگار ثابت ہوگا۔ اُردو کی بنیادی آوازوں کا صحیح تعین نہیں ہوا ہے۔ بہت سے حروف کو ہم آوازوں کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ صوتی تجزیے کے بعد حروف و صوت میں امتیاز پیدا ہوگا اور زبان کے مطالعے کے سلسلے میں ایک سائنس کی کڑی ہمارے ہاتھ آجائے گی۔ اس طرح اُردو زبان کے صوتی مزاج کا بھی اندازہ ہوگا۔

اُردو قواعد کی جدید ترتیب بھی اتنا ہی اہم کام ہے جتنا کہ اُردو کی صوتیات کا مطالعہ۔ اُردو قواعد کے سلسلے میں خاص طور سے (Transformational Theory; A discriptive Theory of

(Grammar) کے پیشِ نظر زبان کا صرفی و نحوی مطالعہ ہونا چاہیے۔ ہم سائنسی لحاظ سے کوئی مستند قواعد کی کتاب پیش نہیں کر سکے جو زبان کے عمل کو دکھا سکے۔ اُردو کی مختلف علاقائی اور سماجی بولیوں کے جائزے، مثلاً دلّی کی اُردو، لکھنؤ کی اُردو، پنجابی اُردو، بمبئی کی اُردو، دکنی اُردو، میسوری اُردو، مدراسی اُردو، سندھی اُردو، بلوچی اُردو، سرحد کی اُردو، کشمیر کی اُردو، ہندکو اور اُردو، پہاڑی اُردو، جو علاقائی اعتبار سے مقامی بولیوں کے اثرات کے تحت الگ الگ بولیوں کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ ان کے تجزیاتی مطالعے بھی ضروری ہیں۔ تاکہ اُردو کی تمام بولیوں کو ان مطالعوں کے ذریعے محفوظ کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور نے اپنی انگریزی کتاب ''ہندوستانی صوتیات'' میں دکنی کا صوتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اور ڈاکٹر نارنگ نے اپنی مختصر کتاب (Karkhandari Urdu) لکھ کر اُردو بولیوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان ابتدائی کوششوں سے مدد لے کر اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ صوتی اعتبار سے اُردو کے معیار کے سلسلے میں ان بولیوں کی مشترکہ خصوصیات ہی کے پیشِ نظر کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے گا۔ اُردو سے متعلق ذولسانی مطالعہ بھی دل چسپ اور رنگا رنگ موضوع ہے۔ بولیوں کے سماجی مطالعوں میں بازاری اُردو، عورتوں کی زبان، مختلف پیشہ وروں کی زبان کے مطالعے بھی سماجی و لسانی مطالعوں کا اہم موضوع بن سکتے ہیں۔

اُردو میں لغت کی تدوین بھی بنیادی اور اہم ضرورت ہے۔ لغت نہیں ملے گی جو ہماری تمام تر ضروریات پر حاوی ہو۔ لفظ، اس کی تشکیل، اصل و نسل، اس کی قسم (اسم، صفت، فعل وغیرہ) تلفظ کی صحت کے سلسلے میں بھی تفصیلات ایک اچھی لغت کے ضروری اجزا ہیں۔ اس قسم کی لغت کی ترتیب میں ''دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری'' بطور نمونہ سامنے رکھنا چاہیے۔ تلفظ کی صحت کے سلسلے میں جونسن کی (The English Pronouncing Dictionary) کے طرز پر لغت کی تدوین ہونی چاہیے۔ لغت کی جدید ترتیب میں وہ سارے الفاظ شامل ہونے چاہئیں جو عام اُردو بول چال میں استعمال ہیں۔ خواہ وہ کسی زبان سے ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح سولہویں، سترھویں، اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں مستعمل ہونے والے الفاظ پر مشتمل زمانے کے مطابق لغتیں بھی مرتب ہونی چاہیں۔

لسانی تحقیق کے دو پہلو ہیں۔ اُردو میں اس نوع کی تحقیقات سے پہلے ان دونوں پہلوؤں کو علیحدہ رکھنا ضروری ہے۔ اوّل: لسانیات کا سرعت سے ترقی کرنے والے جدید علم کی حیثیت سے مطالعہ تاکہ اس کے ذریعے اُردو میں علمِ زبان کے طالب علم کے لیے زیادہ سے زیادہ مواد حاصل ہو۔ اس سلسلے میں علمِ زبان کے سارے پہلو،

مثلاً تجزیاتی، تاریخی، جغرافیائی (بولیوں کے مطالعوں کے ساتھ) لفظ و معنی کا تعلق، الفاظ کی تاریخ، تدریسِ زبان، اختلاطِ زبان اور اسلوبیات وغیرہ پیشِ نظر ہونے چاہیں۔ دوم: ہند آریائی گروہ کی تاریخی اہمیت اور اس کے پیشِ نظر، اُردو کے ساتھ دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے تفصیلی مطالعے۔ تا کہ اُردو کے، جدید ہند آریائی زبانوں سے لسانیاتی رشتے بھی بہ یک نظر ہمارے سامنے رہیں۔ انیسویں صدی کے ربع اوّل میں علمِ زبان کی سائنسی حیثیت تسلیم کر لینے کے بعد، اس نے تین تدریجی منزلیں طے کیں۔

پہلی منزل: اس دور میں زبانوں کے خاندانی رشتے اور اس کے قواعد کی تاریخی ترقی سے بحث کی گئی۔ فرانز بوپ، گریمم، میکس ملر اور روھشنے نے زبانوں کے خاندانی رشتے اور اس کی قواعد کی عہد بہ عہد ترقی کے سلسلے میں، سب سے پہلی مرتبہ اپنے مطالعے پیش کیے۔

دوسری منزل: اس دور کے اہم علما پال بریگمین اور رلیٹ ہیں، جنھوں نے پہلے پہلے صوتی اصولوں اور صوتی تغیرات کے لحاظ سے زبانوں کی تاریخ اور تشکیل سے متعلق نظریے قائم کیے۔ یسپرسن (Jesperson) اور ونیدرے (Vendreya) نے، جن میں اول ہالینڈ اور دوم فرانس کا رہنے والا تھا۔ اس عہد کے بنیادی نظریوں پر قائم رہتے ہوئے جنھیں پال بریگمین اور رلیٹ نے پیش کیا تھا؛ زبان کے سماجی و ثقافتی پہلوؤں پر بھی زور دیا۔

تیسری منزل: یہ علم اللسان کی جدید ترین منزل ہے جس کی ابتدا فونیم کے نظریے کے بعد رکھی گئی۔ اس نے قدیم تاریخی لسانیات کے ساتھ توضیحی لسانیات پر بھی زور دیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اس نے علمی اعتبار سے آزادانہ حیثیت حاصل کر لی اور قدیم تقابلی لسانیات کی محدود دنیا سے نکل کر نئی سمتیں اختیار کیں۔ اس کے چار دبستان پراگ، کوپن ہیگن، لندن اور امریکی مشہور ہیں۔ اُردو کے لسانیاتی ادب کو، علمِ زبان کے اس پس منظر میں دیکھے جانے کی ضرورت ہے۔

اُردو میں اچھے تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ یہ تحقیقی مقالات کچھ اس نوعیت کے ہیں۔ اُردو غزل کا ارتقا، اُردو تنقید کا ارتقا، اُردو افسانے یا ناول کا ارتقا، کچھ مقالے ادبی شخصیتوں پر حیات و خدمات کے حوالے سے لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ عصر حاضر کے موضوع پر مقالے لکھے جائیں اور زبان پر بھی تحقیقات کی جائیں۔ کم از کم پچاس فیصد اساتذہ اور طلباء کو لسانیاتی تحقیق کا کام اپنے ذمہ لینا ہوگا۔ جدید لسانیات میں تربیت یافتہ اشخاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایم اے اُردو کے نصاب میں جدید لسانیات کے لیے کم از کم

دو پرچے لازمی ہونے چاہیں۔ جس کی مثال (NUML) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوایجز کے نصاب میں لسانیات اور اُردو قواعد کے دو پرچے لازمی ہیں۔ اس طرح جدید لسانیات کا ایک پرچہ لازمی ہونا چاہیے۔ جس میں صوتیات، تونیمیات، معنیات اور صرف و نحو وغیرہ شامل ہو۔

انگریزی کی طرز پر اُردو لسانیات میں کام نہیں ہوا۔ صوتیات کے حوالے سے اُردو حروف تہجی کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے حروف تہجی کا صوتیاتی و لسانی مطالعہ کیا جائے۔ اس سے ہم کسی بھی ملک یا علاقے کی زمین کی نوعیت، آب و ہوا کی کیفیت اور اثرات، ثقافت موسم کی تفاوت کا جائزہ لے سکتے ہیں اور وہاں کے بسنے والوں کے خصائل اور ان کے رسم و رواج کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تمام چیزیں زبان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ وہاں کے سماجی، تاریخی اور جغرافیائی حالات سے خوب واقفیت رکھتا ہو تا کہ تحقیق میں مفید کام سرانجام دے سکے اور سوشیولنگوائسٹک فروغ پا سکے۔ لسانیات کی ایک شاخ سوشیولنگوائسٹک میں تحقیقی کام کا فقدان ہے۔ عصرِ حاضر کے لیے سوشیولنگوائسٹک ہی مختلف اقوام اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ سوشیولنگوائسٹک Criminology اور Terrorism جیسے مسائل پر قابو پانے میں مدد دے سکتی ہے۔ آخر پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ مطالعہ لسانیات ناگزیر ہے۔

حواشی

1. Original Text:

> "The only universal medium of linguistic communication among all normal human beings(i.e. excluding the deaf and dumb, some congenital idiots, etc.) is speech, and the scientific study of speech is known as Phonetics."

☆ R. H. Robins, "General Linguistics", 'An Introductory Survey', (London): Longmans, 2nd Edition, 1971, P. 82

۲۔ ناصر عباس نیّر، ”لسانیات اور تنقید“

"Journal of Research", Multan: Vol: 12, 'Faculty of Languages & Islamic Studies', BZU, 2007, P. 225

مآخذ و منابع

کتابیات

آزاد، محمد حسین، ''سخندانِ فارس''، لاہور: شیخ مبارک علی، طبع سوم ۱۹۵۶ء

آزاد، محمد حسین، ''آبِ حیات''، مرتبہ: تبسم کاشمیری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء

آزاد، محمد حسین، ''آبِ حیات''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

احتشام حسین، سید، ''اردو کی کہانی''، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۵۶ء

احتشام حسین، سید، ''اردو لسانیات کا مختصر خاکہ''، مرتبہ: آغا سہیل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، س۔ن

احسن، عبدالشکور، مرتبہ: ''پاکستانی ادب'' (بلوچی ادب از محمد سردار خان بلوچ)، لاہور: ادارہ تحقیقاتِ پاکستان دانش گاہِ پنجاب، ۱۹۸۱ء

احمد دین، بی۔اے، ''سرگذشتِ الفاظ''، لاہور: شیخ مبارک علی تاجر کتب، ۱۹۳۲ء

ادیب، مسعود حسن رضوی، سید، ''اردو زبان اور اس کا رسم الخط''، لکھنؤ: دانش محل، باراول جولائی ۱۹۴۸ء

ارسطو، ''بوطیقا''، مترجم: عزیز احمد، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء

اشتیاق احمد، مرتبہ: ''جدیدیت کا تنقیدی تناظر''، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۶ء

اصلاحی، شرف الدین، ''اردو سندھی کے لسانی روابط''، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، باراول ۱۹۷۰ء

اعجاز حسین، ڈاکٹر سید، ''مختصر تاریخ ادب اردو''، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۶ء

افتخار جالب، ''لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر''، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱ء

اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، ''اردو صرف ونحو''، پہلا ایڈیشن، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، جنوری مارچ ۱۹۸۵ء

اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، ''لسانیات کے بنیادی اصول''، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء

انجم رحمانی، ''برصغیر پاک و ہند میں خطاطی''، لاہور: عجائب گھر، ۱۹۷۸ء

انشا، انشاء اللہ خاں، ''دریائے لطافت''، لکھنؤ: انجمن ترقی اردو ہند، طبع اول ۱۹۱۶ء

انشا، انشاء اللہ خاں، ''دریائے لطافت''، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۲۵ء

انور سدید، ڈاکٹر، ''شمع اردو کا سفر''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

انیس ناگی، ڈاکٹر، ''شعری لسانیات''، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء

انیس ناگی، ڈاکٹر، ''نئے ادب کا معمار: افتخار جالب''، لاہور: حسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

باقر، آغا محمد، ''تاریخ نظم و نثر اردو''، لاہور: آزاد بک ڈپو، بار دہم ۱۹۵۸ء

بدایونی، ضمیر علی، ''جدیدیت اور مابعد جدیدیت''، کراچی: اختر مطبوعات، ۱۹۹۹ء

بلوم فیلڈ، لیونارڈ ''لینگوایج''، مترجم: موتی لال بنارسی داس، دہلی: دی پرنٹ، پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند''، چھٹی جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند''، تیرہویں جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء

''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند''، چودھویں جلد، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

جالندھری، فتح محمد خاں، مولوی، ''مصباح القواعد''، حصہ اول، رامپور: اشاعت خانہ رامپور، ۱۹۴۵ء

جاوید، ڈاکٹر انعام الحق، مرتبہ: ''پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان طبع اول ۱۹۹۷ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، مرتبہ: ''مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راؤ پدم راؤ''، کراچی: انجمن ترقی اردو، اشاعت اول ۱۹۷۳ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اول، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، جلد چہارم، لاہور: مجلس ترقی ادب، مارچ ۲۰۰۵ء

جین، گیان چند، ڈاکٹر، ''عام لسانیات''، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۸۵ء

جین، گیان چند، ڈاکٹر، ''لسانی رشتے''، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۳ء

جین، گیان چند، ڈاکٹر، ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب''، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء

چرنجی لال منشی، ''مخزن المحاورات''، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء

چیٹر جی، سنیتی کمار، ''انڈو ایرین اینڈ ہندی''، کلکتہ: فرما کے۔ ایل مکھوپادھیائے، ۱۹۶۰ء

چیٹر جی، ڈاکٹر سنیتی کمار، ''ہند آریائی اور ہندی''، مترجم: ''عتیق احمد صدیقی، دہلی: لبرٹی آرٹ پریس، ۱۹۷۷ء

چیٹر جی، سنیتی کمار، ''ہند آریائی اور ہندی''، مترجم: عتیق احمد صدیقی، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۱ء

حسینی، میر بہادر علی، ”قواعدِ زبان اردو“، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء

حمید الدین قادری شرفی، سید، ”ہند آریائی اور اردو“، حیدر آباد (آندھرا پردیش)، ۱۹۸۶ء

خضر سلطان، رانا، ”انگریزی ادب کا تنقیدی جائزہ (۶۰۰ء سے تا حال)“، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۵ء

خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا، ”اردو زبان کی تاریخ“، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء

خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر مرزا، ”اردو کی لسانی تشکیل“، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۸ء

خلیل صدیقی، ”زبان کا مطالعہ“، مستونگ: قلات پبلشرز، ۱۹۶۴ء

خلیل صدیقی، ”زبان کا ارتقا“، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء

خلیل صدیقی، ”لسانی مباحث“، کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

خلیل صدیقی، ”آواز شناسی“، ملتان بیکن بکس، ۱۹۹۳ء

خورشید حمرا صدیقی، ڈاکٹر، ”اردو زبان کا آغاز“، جموں کشمیر: شمع پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

داؤدی، خلیل الرحمٰن، مرتبہ: ”قواعدِ اردو زبان“، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء

دہلوی، سید احمد، ”علم اللسان“ دہلی: دفتر فرہنگِ آصفیہ، ۱۸۹۵ء

رشید حسن خاں، ”اردو املا“، دہلی: نیشنل اکادمی، ۱۹۷۴ء

رشید حسن خاں، ”اردو کیسے لکھیں“، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء

رنجن بھٹاچاریہ، شانتی، ”بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ“، لکھنؤ: نصرت پبلشرز، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء،

زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر سید، ”ہندوستانی لسانیات“، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، مارچ ۱۹۶۰ء

زورر، محی الدین قادری، ڈاکٹر سید، ”ہندوستانی لسانیات“، لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۱ء

زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر سید، ”اردو کے اسالیب بیان“، لاہور: مکتبہ معین الادب، پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۲ء

سدھیشور ورما، ڈاکٹر، ”آریائی زبانیں“، حیدر آباد (دکن): اعظم سٹیم پریس، ۱۹۴۲ء

سعادت سعید، ڈاکٹر، ”شناخت“ (نظمیں)، لاہور: مکتبہ نسیم، بار اول ۲۰۰۷ء

سعید، سعید احمد، ”تاریخ ضلع رحیم یار خان“، رحیم یار خان: مطبع ندارد، ۱۹۸۱ء

سکسینہ، رام بابو، ”تاریخ ادب اردو“، مترجم: مرزا محمد عسکری، لاہور: نیشنل بک ہاؤس، فروری ۱۹۶۹ء

سکسینہ، رام بابو، ’’تاریخ ادبِ اردو‘‘، مترجم: مرزا محمد عسکری، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۷ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، ’’اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ‘‘، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، ’’اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ‘‘، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

سلیم پانی پتی، وحید الدین، مولانا، ’’وضعِ اصطلاحات‘‘، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۵ء

سلیم پانی پاتی، وحید الدین، مولانا، ’’افاداتِ سلیم‘‘، لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، س۔ن

سلیم، مولانا وحید الدین، ’’وضعِ اصطلاحات‘‘، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، س۔ن

سندھی، ڈاکٹر میمن عبدالمجید، ’’لسانیاتِ پاکستان‘‘، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول مارچ ۱۹۹۲ء

سونیا چرنیکووا، ’’اردو افعال‘‘، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۲۰۰۰ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، ’’اردو کی زبان‘‘، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۶۳ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، ’’اردو کا روپ‘‘، لاہور: آزاد بک ڈپو، مارچ ۱۹۷۱ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، ’’اردو کی کہانی‘‘، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۵ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر، ’’اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ‘‘، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء

سہیل عباس بلوچ، ڈاکٹر، ’’بنیادی اردو قواعد‘‘، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء

شاہین، امیر اللہ خان، ڈاکٹر، ’’جدید اردو لسانیات‘‘، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۱ء

شرفی، حمید الدین قادری، سید، ’’ہند آریائی اور اردو‘‘، حیدرآباد (آندھرا پردیش): الیاس ٹریڈرس، ۱۹۸۶ء

شمس اللہ قادری، حکیم، ’’اردوئے قدیم‘‘، لکھنؤ: مطبع نول کشور، ۱۹۳۰ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’اردو زبان کا ارتقا‘‘، ڈھاکا: سٹی پریس، طبع اول جولائی ۱۹۵۶ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’داستانِ زبانِ اردو‘‘، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۰ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’اردو لسانیات‘‘، کراچی: انجمن ترقی اردو بورڈ، اشاعت اول ۱۹۶۶ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر، ’’اردو لسانیات‘‘، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء

شیرانی، حافظ محمود، ’’پنجاب میں اردو‘‘، لاہور: کتاب نما، ۱۹۷۲ء

شیرانی، حافظ محمود، ’’پنجاب میں اردو‘‘، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم ۱۹۹۸ء

شیرانی، حافظ محمود، ’’پنجاب میں اردو‘‘، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور: کتاب نما، طبع چہارم ۱۹۷۲ء

شیرانی، حافظ محمود، ’’مقالاتِ حافظ محمود شیرانی‘‘، جلد اول، مرتبہ: ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء

صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، مترجم: ’’ہندوستانی گرامر‘‘، مصنفہ: جُمن شلزے، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷

صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، ’’اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ‘‘، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول ۱۹۸۱ء

صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، ’’جامع القواعد (حصہ صرف)‘‘، لاہور: اردو سائنس بورڈ، طبع دوم ۲۰۰۴ء

صدیقی، ڈاکٹر عتیق احمد، مترجم: ’’توضیحی لسانیات: ایک تعارف‘‘، مصنفہ: گلیسن جونیئر، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۲ء

طارق سعید، ’’اسلوب اور اسلوبیات‘‘، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۸ء

عباسی، شاہ محمد، ’’پشتو زبان اور ادب کی تاریخ: ایک جائزہ‘‘، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۹ء

عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، مشمولہ: ’’جائزہ زبان اردو‘‘، مرتبہ: انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۰ء

عبدالحق، مولوی، ’’اردو زبان میں اصطلاحات کا مسئلہ‘‘، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۴۹ء

عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، ’’قواعدِ اردو‘‘، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۶ء

عبدالسلام، ڈاکٹر، ’’عمومی لسانیات: ایک تعارف‘‘، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء

عبدالقیوم، مرتبہ: ’’تاریخ ادب اردو‘‘، جلد اول، کراچی: ایجوکیشنل پبلشرز، ۱۹۶۱ء

عشرت رحمانی، مرتبہ: ’’اردو ادب کے آٹھ سال‘‘، لاہور: کتاب منزل، س۔ن

عصمت جاوید، ڈاکٹر، ’’نئی اردو قواعد‘‘، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء

عطش درانی، ڈاکٹر، ’’اردو اصطلاحات سازی‘‘، اسلام آباد: انجمن شرقیہ علمیہ، طبع اول مئی ۱۹۹۳ء

عطش درانی، ڈاکٹر، ’’جدید رسمیاتِ تحقیق‘‘، لاہور: اردو سائنس بورڈ، طبع اول، ۲۰۰۵ء

عطش درانی، ڈاکٹر، ’’اردو جدید تقاضے‘‘، نئی جہتیں، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء

غلام الانا، ’’سندھی زبان کی اصل نسل‘‘، حیدرآباد: زیب ادبی مرکز، س۔ن

غلام مصطفٰے خان، ڈاکٹر، ’’جامع القواعد‘‘ (حصہ نحو)، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۲۰۰۳ء

فاروقی، شمس الرحمان، ''اردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی تاریخ و تہذیب کے حوالے سے)''، کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۱ء

فاروقی، شمس الرحمان، ''لفظ و معانی''، کراچی: مکتبہ دانیال، بار دوم، ۲۰۰۹ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ''زبان اور اردو زبان''، کراچی: حلقہ نیاز و نگار، ۱۹۹۵ء

فرید کوٹی، عین الحق، ''اردو زبان کی قدیم تاریخ''، لاہور: اورینٹ ریسرچ سنٹر، مارچ ۱۹۷۹ء

قادری، حامد حسن، ''داستان تاریخ اردو''، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۴۱ء

قادری، ڈاکٹر محمد ایوب، ''اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ''، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، طبع اول ۱۹۸۸ء

قادر، ڈاکٹر سی اے، پروفیسر، ''فلسفۂ جدید اور اس کے دبستان''، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، جون ۱۹۸۱ء

قاضی جاوید، ''جدید مغربی فلسفہ''، لاہور: فکشن ہاؤس، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء

قریشی، حسین احمد، ''پنجابی ادب کی مختصر تاریخ''، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۴ء

کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، ''بلوچستان میں اردو''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

کیفی، برجموہن دتاتریہ، ''کیفیہ''، لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء

کیفی، برجموہن دتاتریہ، پنڈت، ''کیفیہ''، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۷۵ء

گلزار احمد، صوفی، مرتبہ: ''کشاف اصطلاحاتِ نفسیات''، نظر ثانی و اضافہ: محمد شمیم ہاشمی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء

گمی، سلیم خان، ''پنجابی زبان دا ارتقا''، لاہور: عزیز پبلشرز، ۱۹۹۱ء

گیان چند جین، ڈاکٹر، ''عام لسانیات''، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۳ء

گیان چند جین، ڈاکٹر، ''لسانی مطالعے''، نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء

محبوب عالم خان، ڈاکٹر، ''اردو کا صوتی نظام''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء

محمد باقر، ڈاکٹر، ''اردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں)''، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء

محمد یوسف بخاری، ڈاکٹر سید، ''کشمیری اور اردو کا تقابلی مطالعہ''، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، طبع اول ستمبر ۱۹۸۲ء

مسعود حسین خان، ڈاکٹر، ''اردو زبان اور ادب''، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۳ء

مسعود حسین خان، ڈاکٹر، ''مقدمہ تاریخ زبان اردو''، لاہور: ادارہ اردو مرکز، ۱۹۶۶ء

مسعود حسین خاں، ڈاکٹر، مشمولہ: ''مقدمات شعر و زبان''، حیدرآباد: شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء

مغنی تبسم، پروفیسر، ''ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور: حیات، شخصیت اور کارنامے''، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء

مقبول بیگ، مرزا، ''قواعد پنجابی زبان''، لاہور: پنجابی تحقیقاتی مرکز، ۱۹۷۳ء

ممتاز حسن، پروفیسر، ''ادب اور شعور''، کراچی: ادارہ نقدِ ادب، ۱۹۹۲ء

مہر، ڈاکٹر عبدالحق، ''پاکستانی قومیت کی تشکیلِ نو''، لاہور: مطبع ندارد

میرامن، ''باغ و بہار''، مرتبہ و مقدمہ: ممتاز حسین، کراچی: اردو ٹرسٹ، ۱۹۵۸ء

نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند، ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند، ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، بار سوم ۲۰۰۴ء

نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، ''اردو زبان اور لسانیات''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

نجمی، حکیم نجم الغنی خاں، ''بحر الفصاحت''، حصہ اول، مرتبہ: سید قدرت نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، مارچ ۱۹۹۹ء

نجمی، حکیم نجم الغنی خاں، ''بحر الفصاحت''، حصہ اول، مرتبہ: ڈاکٹر کمال صدیقی، دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، مارچ ۲۰۰۶ء

نصیر احمد خاں، ڈاکٹر، ''اردو لسانیات''، نئی دہلی: اردو محل پبلی کیشنز، پہلا ایڈیشن مارچ ۱۹۹۰ء

نصیر احمد خاں، ڈاکٹر، مترجم: ''لسانیات کیا ہے؟''، مصنفہ: ڈیوڈ کرسٹل، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۱۹۹۷ء

نوری، محمد قاسم، ''ہندوستانی زبان''، لاہور: دردا کادمی، ۱۹۶۹ء

نیر، مختار علی، ''تاریخ زبان و ادب ہندکو''، پشاور: سلیمان پرنٹرز، ۱۹۹۵ء

نیر، ڈاکٹر ناصر عباس، ''لسانیات اور تنقید''، اسلام آباد: پورب اکادمی، جنوری ۲۰۰۹ء

وارث سرہندی، ''زبان و بیان'' (لسانی مقالات)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، جون ۱۹۸۹ء

وحید قریشی، ڈاکٹر، ''پاکستانی قومیت کی تشکیلِ نو''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء

ورما، ڈاکٹر سدھیشور، ''آریائی زبانیں''، حیدرآباد (دکن): اعظم اسٹیم پریس، ۱۹۴۲ء

ہاشمی، نصیرالدین، ''دکن میں اردو''، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، آٹھواں ایڈیشن ۱۹۸۵ء

ہرگانوی، مناظر عاشق، ڈاکٹر، ''گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی''، نئی دہلی: ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

یوسف بخاری، محمد، ڈاکٹر سید، ''کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ''، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۸۲ء

رسائل و جرائد

اردو نامہ، کراچی، شمارہ دوازدہم، اپریل تا جون ۱۹۶۳ء

راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، شمارہ ۲۰۱۰ء

تحقیق نامہ، لاہور: جی سی یونیورسٹی، شمارہ ۷، جنوری ۲۰۱۰ء

"Journal of Research", Multan: Vol: 12, 'Faculty of Languages & Islamic Studies', BZU, 2007

لغات اور انسائیکلوپیڈیا

آموزگار، حبیب اللہ، ”فرہنگ آموزگار“، تہران، چاپ دوم ۱۳۳۲

”المنجد“ عربی اردو، کراچی: دارالاشاعت، طبع یازدہم ۱۹۹۴ء

”کفایت اردو لغت“، لاہور: محکمہ تعلیم حکومتِ پنجاب، اکتوبر ۱۹۸۹ء

مسعود عالم، ڈاکٹر، ”جدید اردو لغت“، لاہور: کمبائنڈ پبلشرز، ۲۰۰۰ء

”ہفت زبانی لغت“، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۴ء

قاسم محمود، سید، ”انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا“، کراچی: شاہکار بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۸ء

انگریزی کتب

Aitchison, Jean, "Linguistics: Teach Yourself", New York, N.A

Bailey, T. Grahamme, "Studies in North Indian Languages", London: Lund Co. Ltd., 1938

Barber, Charles L., "The Story of Language", New Delhi: Cosmo Publications, 2007

Bloomfield, L., "Language", London: Allen & Unwin, First Edition 1933

Crystal, David, "What is Linguistic?", London: Edward Arnold (Publishers) Ltd., Fourth Edition

Grierson, G.A., "Linguistic Survey of India", vol.i, part-ii, Delhi: Motial Banarsidass, N.A

Grierson, G.A., "Linguistic Survey of India", vol: ix, part: iv, Delhi: Motial Banarsidass, N.A

Hockett, Charles F., "A Course in Modern Linguistics", New York: Maclemon Company, 1958

Jesperson, Otto, "Language: Its Nature, Development and Origin", London: Allen & Unwin Ltd., 1922

Lodge, David, Ed: "Modern Criticism and Theory", Delhi: Pearson, 2003

Pillsbury & Meader, "The Psychology of Language", Newyork: D. Appleton and Company, 1928

Robins, R.H., "General Linguistics: An Introductory Survey", London: Longmans, 2nd Ed.1971

Saussure, Ferdinand De, "Course de Linguistique General", Paris: Payot, 4th Edition1991

Southworth, Franklin C., & Daswani, Chander J., "Foundations of Linguistics", New York: The Free Press, 1974

Sweet, Henery, "The Practical Study of Languages", London: Oxford University Press, 1972

انگریزی لغات

Hornby, A.S., "Oxford Advance Learner's Dictionary of Current English", Oxford: Oxford University Press, N.A

"Oxford Advance Learners Dictionary", London: Oxford University Press, 1993